اقبالیات اور قرۃ العین حیدر

نسیم عباس چوہدری

اقبالیات اور قرۃ العین حیدر

نسیم عباس چوہدری

اقبال اکادمی پاکستان

مصنف کے تحقیقی مقالے ''قرۃ العین حیدر پر علامہ اقبال کے اثرات کا جائزہ'' برائے ایم۔فل کو علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کی طرف سے بہترین مقالہ (۲۰۰۲ء-۲۰۰۳ء) کا ایوارڈ دیا گیا۔ کتاب اسی مقالے پر مبنی ہے۔

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

(حکومتِ پاکستان، وزارت ثقافت)

چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 6314-510

Fax: [+92-42] 631-4496

Email: director@iap.gov.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-418-2

طبع اوّل	:	۲۰۰۹ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۲۵۰/-
مطبع	:	میسرز دار الفکر، لاہور

محل فروخت: ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، فون نمبر ۷۳۵۷۲۱۴

انتساب:

استادِ محترم ڈاکٹر **انوار احمد** کے نام
جن کی گھنی چھاؤں میں ہم نے محنت کرنا سیکھی

اور

ننھے مُنے بیٹوں **احمد تمثال** اور **محمد طلال** کے نام
جنہیں ہم محنت کرنے کا درس دیں گے

فہرست

پیش لفظ

زیرِ نظر تصنیف اقبالیات اور قرۃالعین حیدر درحقیقت میرے ایم فل کے تحقیقی مقالے ''قرۃ العین حیدر پر علامہ اقبال کے اثرات کا جائزہ'' کے باب دوم تا ششم پر مشتمل ہے جو میں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کو پیش کیا تھا۔ اس تحقیقی مقالے کی تکمیل میں جن اساتذہ کرام کی مہربانیاں میرے ہمراہ رہیں، ان میں جناب ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی، ڈاکٹر محمد شفیق اور ڈاکٹر اسلم انصاری سرفہرست ہیں۔

زیرِ نظر تصنیف میں علامہ اقبال کے ان افکار و نظریات کا قرۃ العین حیدر کی تحریروں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے جن سے قرۃ العین حیدر نے براہ راست استفادہ کیا ہے اور انھیں اپنے سحر نگار قلم کے زورِ بیان سے چکا چوند افسانوی دنیا میں پیش کیا ہے۔

اس تصنیف کا سب سے اہم حصہ علامہ اقبال اور قراۃ العین حیدر کے ذہنی روابط کا بیان ہے، جن کے آثار قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں ہمیں جابجا دکھائی دیتے ہیں، علاوہ ازیں ایک بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فکشن کا عام قاری یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک نامور ناول نگار اور افسانہ نگار ادیبہ جس پر روشن خیالی اور ترقی پسندی کی چھاپ بھی لگی ہو علامہ اقبال جیسے عظیم اور قومی شاعر کے اثرات قبول کر سکتی ہے۔ اس تصنیف میں آپ کو نہ صرف 'قرۃ العین حیدر پر علامہ اقبال کے اثرات کا جائزہ' ملے گا بلکہ اقبالیات کے قاری کو علامہ اقبال سے متعلق نئی معلومات بھی میسر آئیں گی جنھیں قرۃ العین حیدر نے ہم تک پہنچایا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی زبردست کاوش کی ہے۔ یہی کاوش قرۃ العین حیدر کو ''ادیبہ مشرق'' کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

اس تصنیف کی تکمیل کے لیے مجھے اپنے دیرینہ دوست سعد مسعود الغنی کا بے حد شکریہ بھی ادا کرنا ہے جنھوں نے ہر لحہ میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میرا ساتھ دیا۔ علاوہ ازیں میں اپنے عزیز دوست میاں عطاء اللہ کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ادبی سرگرمیوں میں میرا حوصلہ

بڑھایا۔ میں اپنے دوست ظفر اقبال بابر جو میرے رفیقِ کار ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اردو ادب کے باذوق قاری بھی ہیں، کا شکریہ ادا کرنا اپنے لیے فخر محسوس کرتا ہوں اور آخر میں مجھے اپنی والدہ محترمہ اور والدِ محترم چوہدری محبوب عالم، اپنی رفیقہ حیات اور دوست عابدہ اور اپنے بیٹوں احمد تمثال اور محمد طلال اور اپنے بھتیجے علی حسن کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، جن کا تعاون کتاب کی تکمیل میں ممکنہ طور پر شامل رہا۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ (آمین)

نسیم عباس چوہدری

باب اوّل

قرۃ العین حیدر اور علامہ اقبال کے خاندانی روابط

اُردو ادب کے افق پر قرۃ العین حیدر کی شخصیت ایک درخشاں اور تابندہ ستارے کی مانند ہے جو مشرق کی سرزمین پر ہمیشہ ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور اپنی ادبی تخلیقات کے سبب ادیبہ مشرق کے روپ میں قائم ودائم رہے گا۔

قرۃ العین حیدر کا تعلق ایک قدیم خاندان اشرافیہ سے ہے اور ان کے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم ایک نامور اردو افسانہ نگار تھے۔ جن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ جب بھی اردو افسانہ نگاری کی تاریخ تحریر ہوتی رہے گی، یلدرم کا نام افسانہ نگاروں کی صف میں ادب و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ یہی فن قرۃ العین حیدر کو اپنے آباؤ اجداد بالخصوص اپنے والد کی جانب سے ورثہ میں ملا مگر قرۃ العین حیدر کی پہچان خود ان کی ذات ہے۔ لہٰذا ہم اس بات سے قطعاً منکر نہیں کہ ان کا خاندانی پس منظر ان کے فن کو اُجاگر کرنے میں ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر کی زندگی اور شخصیت کو قوسِ قزاح کے رنگوں کی مانند چمکانے، نکھارنے اور سنوارنے میں بلاشبہ یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ وہ سجاد حیدر یلدرم جیسے مایہ ناز ادیب وشاعر کی لخت جگر ہیں۔ قرۃ العین حیدر اپنے خاندانی پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے خاندانی سلسلہ نسب کی تفصیل ان الفاظ میں رقم کرتی ہیں:

سلسلہ نسب پدری سیّد عالی خاندان سید کمال الدین ترمذی کہ در کیتھل متصل بود۔ نیسر از ولایت آمدہ سکونت کردہ اند بن سید عثمان ترمذی بن سید ابوبکر بن سید عبداللہ بن سید ابوطاہر بن سید عبداللہ بن سید علی زید بن سید حسین بن ابوعبداللہ بن سید احمد محدث بن سید حسین ذوالدمعہ بن زید شہید بن زین العابدین علیہ السلام۔[1]

قرۃ العین حیدر کے آباؤ اجداد سید کمال الدین ترمذی اُن اولین صوفیائے کرام میں سے تھے جو بارہویں صدی عیسوی میں ترکستان کے ایک مقام ترمذ سے جیحوں پار کر کے بلخ پہنچتے ہوئے غزنی کے راستے افغانستان سے نکل کر دریائے اٹک آئے۔ اس کے بعد پنجاب اور لاہور پہنچے اور اس طرح ہندوستان میں وارد ہوئے۔[2]

ان کے لیے یہ سفر فرات سے جیحوں اور جیحوں سے جمنا، گنگا، گاگن اور گومتی کسی پُر خطر اور

حیرت سے کم نہ تھے۔ جن راستوں پر چلتے ہوئے وہ دین اسلام کی تبلیغ کے لیے رواں دواں تھے اور یہ وہی راستے تھے جن کی عظمت اور شان و شوکت کے طفیل ہند میں اسلام پھیلا۔ جن کا تذکرہ قرۃ العین حیدر کارِ جہاں دراز ہے کی فصل اوّل میں ''فرات وجیحوں'' اور ''جیحوں سے جمنا'' کے عنوانات سے ان الفاظ میں کرتی ہیں:

فرات سے جیحوں، جیحوں سے جمنا اور گنگا اور گومتی اور گاگن تک کے راستے کچھ کم پُر پیچ اور پُر خطر اور حیرت ناک نہ تھے۔[۳]

اقبال بھی انھی مقامات کے بے حد معترف ہیں اور اس کا اظہار اس شعر میں یوں کرتے ہیں۔

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں[۴]

سید کمال الدین جن کا شمار اپنے دور کے صوفیائے کرام میں ہوتا تھا چند سال کیتھل کے مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ جہاں اہل ہنود کے صنم خانے موجود تھے۔ یہیں پر انھوں نے بقول قرۃ العین حیدر خدا کا نام لے کر اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ جس کا ذکر وہ علامہ اقبال کے اس مصرع ''مجھے ہے حکمِ اذاں لَا اِلٰہ اِلا اللّٰہ'' کے ساتھ کرتی ہے۔

مقامی زبان سے ناواقف، راہ میں کچھ الفاظ پنجابی کے سیکھ لیے تھے۔ ان سے کام چلایا...... بمقام سیلہ گڑھ تالاب ایکانیر کے کنارے جھونپڑی ڈال کر ٹوٹی پھوٹی ہریانوی زبان میں تبلیغ شروع کر دی۔ مجھے ہے حکمِ اذاں۔[۵]

سید کمال الدین ترمذی کچھ عرصہ کیتھل میں قیام کے بعد اپنے والد محترم سے ملنے کی غرض سے واپس ترکستان روانہ ہوئے۔ ۱۱۹۲ء میں اپنے اہل و عیال اور رفقا کے ہمراہ دوبارہ ہند میں وارد ہوئے۔ ان کے نزدیک اس سفر کا مقصد صرف تبلیغِ دینِ اسلام کے سوا کچھ نہ تھا۔ راستے میں درۂ خیبر کے مقام پر سلطان شہاب الدین اور علاؤ الدین جہاں سوز کے بھتیجے کے لشکر جرار سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

سلطان مع مقربین و سپہ سالار کے آن کر آپ سے ملاقاتی ہوا اور بولا کہ بے سروسامانی میں برائے تبلیغ دین مبین ہند جانا خالی از ملال نہیں۔ فرمایا کہ فقیر کو تائیدِ ایزدی کافی ہے۔ بعد ازاں اپنے فرزند جرار سید ابراہیم کو سلطان کی فوج کے ہمراہ کیا۔ سلطان نے نشانِ اسلام مع خطاب ملک کے سید ابراہیم کو تفویض کیا اور سرہند پہنچ کر قلعہ ہانسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ فتح حاصل کی۔ سید ابراہیم مع رفقا شہید ہوئے۔ مزار پُر انوار اس نامدار کا قلعہ کے اندر موجود ہے۔ خانقاہ نشانچی کہلاتی ہے۔[۶]

سلطان شہاب الدین نے فتح دہلی کے بعد سید کمال الدین ترمذی کو دہلی مدعو کیا اور قصبہ کیتھل میں دوبارہ قیام پذیر کرنے میں معاونت فرمائی۔ سید کمال الدین کی توجہ اور حسن اخلاق کے سبب ایک ہزار آدمی اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ سلطان شہاب الدین نے اسلام کی تبلیغ کے لیے نہ صرف سید کمال الدین کی خدمات حاصل کیں بلکہ ان کے دور حکومت میں ایک نیک بزرگ اور عالم دین سید علی ہمدانیؒ جن کی تاریخ پیدائش ۱۳۱۴ء ہے ان کو بھی کشمیر میں تبلیغِ اسلام کے لیے مامور کیا۔ قرۃ العین حیدر سید علی ہمدانیؒ کی کشمیر میں آمد کے متعلق علامہ اقبال کی تصنیف جاوید نامہ سے بطور سند ان الفاظ میں ثبوت پیش کرتی ہیں:

۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان شہاب الدین سید السادات امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کشمیر میں وارد ہوئے۔

مرشد آں کشور مینو نظیر
میر و درویش و سلاطیں را مشیر[۷]

(اقبال)

قرۃ العین حیدر سید علی ہمدانیؒ کی کشمیر میں آمد اور ان کے ہمراہ ایرانی کاریگر اور ہنر مند جو ایران سے تشریف لائے ان کی آمد کے متعلق مزید سر طامس آرنلڈ کی تصنیف دی پریچنگ آف اسلام سے واضح حوالہ دے کر اپنی بات کا ٹھوس ثبوت ان الفاظ میں دیتی ہے:

امیر تیمور کے مظالم سے بچنے کے لیے...... حضرت علی ہمدانیؒ اپنے ہمراہ سات سو سادات (سر طامس آرنلڈ نے دی پریچنگ آف اسلام میں یہی تعداد لکھی ہے) اور ایرانی ہنر مندوں، صناعوں، فنکاروں اور قالین بافوں کا ایک بڑا گروہ ہمراہ لے کر کشمیر تشریف لائے۔[۸]

قرۃ العین حیدر سید علی ہمدانیؒ کے اس تاریخ ساز قافلہ کے متعلق تفصیلاً بتاتی ہے کہ یہ قافلہ براستہ ایران، افغانستان کشمیری دروں اور گھاٹیوں سے گزرتا ہوا کشمیر پہنچا۔ کشمیر کی وادی نعرۂ تکبیر سے ان ہی کی کاوشوں سے گونجی۔ قرۃ العین حیدر سید علی ہمدانیؒ کے اس قافلے اور ان کی عظمت کے متعلق علامہ اقبال کے اشعار سے ٹھوس ثبوت مہیا کرتے ہوئے تحریر کرتی ہیں:

اقبال جاوید نامہ میں فرماتے ہیں۔

سید السادات سالار عجم
دست او معمار تقدیر امم
خطہ را آں شاہ دریا آستین

داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آں مرد ایران صغیر
باہنر ہائے غریب و دلپذیر[9]

سلطان شہاب الدین کی کاوشوں اور اسلام دوستی کے سبب برصغیر اور بالخصوص کشمیر میں سادات خاندان نے اسلام پھیلانے میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ سلطان شہاب الدین کی اس کارکردگی کو سلطان شمس الدین اور دیگر سلاطین نے برصغیر میں اسلام کی شمع روشن کی۔ علامہ اقبال اسی وجہ سے سلطان شہاب الدین کی عظمت کے زیادہ قائل نظر آتے ہیں جس کا تذکرہ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے اس شعر کا حوالہ ان الفاظ کے ساتھ کرتی ہیں:

اس کی نسل میں سلطان سکندر اور سلطان زین العابدین جیسے بادشاہ پیدا ہوئے۔ کشمیر میں بیس (۲۰) سلاطین نے حکومت کی۔ ان میں سے سلطان شہاب الدین اقبال کا ہیرو ہے۔

خاک ما دیگر شہاب الدین نزاد[10]

سید کمال الدین کی اولاد نے برصغیر میں اشاعتِ اسلام کے لیے اہم کردار ادا کیا جن میں ان کے چند بیٹوں کے یہ نام ہیں۔

(۱) حسام الدین: ان کی اولاد احمد آباد گجرات، فیض آباد اور کیتھل میں آباد ہے۔
(۲) ملک سید ابراہیم: یہ جنگ ہانسی میں پرتھوی راج کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔
(۳) نصیر الدین: انھوں نے بنگال میں تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔ ان کی دختری اولاد میں سے میر قاسم نواب بنگال تھے۔
(۴) علیم الدین اوّل: شہاب الدین غوری نے جب ۱۱۹۴ء میں قنوج فتح کیا تو علیم الدین دیگر صوفیا کے ہمراہ ان کے پاس گئے اور سلطان نے انھیں عہدہ جلیلہ پر فائز کیا۔ ان کی اولاد میں صوفی شہاب الدین قنوجی اور ان کی پانچویں پشت سے سید العارفین، علم الدین ثانی سرکارِ جونپور کے ہاں عہدہ پنج ہزاری پر تعینات رہے۔ سید علیم الدین ثانی کے پڑپوتے سید صدر الدین ایک مشہور عالم دین تھے۔ بقول قرۃ العین حیدر:

پندرھویں صدی میں سکندر لودھی عہد احیاء العلوم کا دور تھا۔ سید علیم الدین ثانی کے پڑپوتے سید صدر الدین نامور عالم تھے۔ سلطان سکندر (جن کی کشمیر پر بھی حکومت رہی) کے دربار میں تخت شاہی کے دائیں جانب جگہ پاتے تھے۔ ان کی اولاد میں سید عبدالغنی اکبر اعظم کے صدر الصدور اور صاحب نوبت ہوئے۔[11]

سید جلال الدین جو سید کمال الدین ترمذی کی اولاد میں سے ہیں اور قرۃ العین حیدر کے جدِ امجد ہیں۔قرۃ العین حیدر خود ان کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

سید جلال الدین غازی، سید کمال الدین ترمذی کے صاحب زادے اس تذکرہ نویس فقیر حقیر پرُتقصیر عاجزہ فدویہ کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔موصوف اس علاقے میں جا کر بسے جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلایا۔سید جلال الدین کے اسلاف میں سید اشرف گنج بخش، سید احمد، سید محمد، سید محمود اور سید حسن عسکری کا زمانہ پندرہویں صدی ہے۔سید حسن عسکری کے صاحب زادے سید ضیاء الدین سرکار سنبھل میں چار ہزاری تھے۔ٹھاٹھ کرتے ہوں گے۔[۱۲]

قرۃ العین حیدر اپنے آباؤ اجداد کے متعلق مزید تفصیلاً بتاتی ہیں کہ ترکستان کے علاقہ ترمذ سے آمد کے بعد ہندوستان کے صوبہ یو پی کے ایک ضلع بجنور کے ایک گاؤں ہنڈر میں مستقل آباد ہو گئے۔اس علاقہ میں مستقل سکونت کا سبب شاہانِ مغلیہ کی جانب سے وہ جاگیر تھی جو اُن کے خاندان کو عنایت ہوئی تھی۔۱۸۵۷ء کے انقلاب میں مغلوں کی مائل بہ زوال سلطنت کو بچانے کی خاطر یلدرم کے دادا نے انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھی اور اس ہنگامے کے فرو ہو جانے کے بعد برطانوی استعمار کی مخالفت کے جرم میں انھیں سزائے موت سنائی گئی جو بعد میں معاف بھی ہو گئی اور ان کی جاگیر بھی ضبط کر لی گئی۔قرۃ العین حیدر نے سفینۂ غمِ دل میں اس کا تفصیلی تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

میرے اس مشہور و معروف خاندان مشہور و معروف پرکھ اصفہان اور مشہد کے رہنے والے تھے اور عراق سے دستار فضیلت بندھوا کے شاہان صفوی و قاچار کے دربار میں فتاویٰ پر دستخط کرتے تھے پھر انھیں شاہ جہاں نے بلوا بھیجا اور رام گنگا کے کنارے انہیں جاگیریں عطا کیں اور اب جبکہ وہ یہاں رہے انھوں نے اپنی پوتر نسل کی برتری کو قائم رکھا اور عراق جا کر اسی طرح اجتہاد کی پگڑیاں بندھواتے رہے۔پھر مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا اور نواب شجاع الدولہ کا زمانہ آیا اور حسب معمول اودھ اور روہیل کھنڈ کے سبزہ زاروں میں گھوڑے دوڑاتے رہے۔ان میں سے چند نے درجہ ولایت حاصل کیا اور پیر و مرشد کہلائے، چند نے شمشیر زنی اور نیزہ بازی اور شہسواری میں نام پیدا کیا۔بیشتر صاحب دیوان ہوئے۔پھر انیسویں صدی آئی اور انگریز آیا۔[۱۳]

قرۃ العین حیدر نے جیسا کہ بیان کیا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد درجہ ولایت حاصل کرنے اور پیر و مرشد کہلانے کے لیے پورے برصغیر میں پھیل گئے اور اشاعتِ اسلام کی سعی و جستجو میں مشغول ہو گئے اور ہزارہا غیر مسلم کو مشرف بہ اسلام کیا۔یہ سادات خاندان کی سعی و محنت کا ثمر ہے کہ برصغیر

میں لوگ مسلمان نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ سلطان شہاب الدین کے دور میں سید علی ہمدانیؒ تشریف لائے اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں کشمیر پر شہمیری خاندان قابض رہے اور اس ترک النسل مسلم خاندان نے جو بانی شاہ میر بعد میں سلطان شمس الدین کے نام سے والئی کشمیر بنے۔ اس خاندان کے مشہور سلاطین شہاب الدین، قطب الدین اور سلطان سکندر بت شکن گزرے ہیں مگر پندرہویں صدی میں سب سے زیادہ شہرت سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ نے حاصل کی۔ ان کے دور میں تبلیغ اسلام میں بڑی کامیابی ہوئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اس کے متعلق بیان کرتے ہیں:

بڈشاہ سے پہلے سلطان قطب الدین اور سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں مسلمان رشیوں کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں لیکن درحقیقت شیخ نورالدین ولی رشی، جنھوں نے سکندر بت شکن اور بڈشاہ دونوں کا زمانہ دیکھا تھا، اس حلقے کے پیشوا اور سرخیل تھے۔ صوفیہ کے اس سلسلہ سے کشمیر میں اشاعت وتبلیغ اسلام کو بڑی مدد ملی۔[۱۴]

علامہ اقبال کے جدِ اعلیٰ بابا لول حج یا لولی حاجی قومیت سپرو (کشمیری پنڈت) تھے۔ جن کا تعلق کشمیری برہمنوں کے قدیم خاندان سے تھا اور ان کے آباؤ اجداد انھی سلاطین کے دور میں مندروں میں پوجا پاٹ کرتے تھے۔ آٹھویں صدی میں (۷۲۵ء تا ۷۵۶ء) تک للت وتیہ ہندوستان کے زبردست بادشاہوں میں سے تھے۔ اسی دور میں بنوامیہ کے آخری خلفائے ہشام، ولید ثانی مروان اور بغداد کے خلفائے بنوعباس سفاح اور منصور کا ہم عصر تھا۔ یہ وہی دور تھا جب فاتح عرب کشمیر پر حملے کے خلاف للت وتیہ نے اپنے ہمسائے ملک چین سے امداد طلب کی اور اپنی سلطنت کو وسعت دیتا گیا۔ اس نے مارتنڈ مندر تعمیر کروایا۔ جس کے اثرات آج رومن کھنڈرات کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاید انھی مندروں میں اقبال کے آباؤ اجداد پوجا پاٹ کرتے تھے۔ بقول قرۃ العین حیدر:

مارتنڈ کے وشنوسور یہ مندر آفتاب (خدائے تخلیق وشنو کا ایک مظہر سمجھا جاتا تھا) کے ستون اور محرابیں رومن شریں طرز کی ہیں۔ بت تراشی، ہم عصر گپتا اسکول سے تعلق رکھتی ہے۔ دیواروں پر گنگا اور جمنا کی مورتیاں بھی موجود ہیں اور عین ممکن ہے اقبال کے لاتی ومناتی آباؤ گامنتری منتر پڑھتے اس رفیع الشان مندر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوں۔

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بند دفترِ کون و مکاں ہے تو[۱۵]

اقبال کے جدامجد بابا لول حج یا لولی حاجی نے اقبال کی پیدائش سے قبل تقریباً ساڑھے چار سو سال (پندرہویں صدی میں) اسلام قبول کیا۔ جن کے اصل نام کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ زراعت پیشہ سے منسلک تھے اور زمینداره کرتے تھے مگر جب فقر اختیار کیا تو ان تمام باتوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کی قبر چرار شریف کے احاطہ مزار شیخ نورالدین ولی رشی کے اندر موجود ہے۔ جہاں ان کے مرشد بابا نصرالدین بھی دفن ہیں۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

اقبال کے جدِاعلیٰ پندرہویں صدی میں مسلمان ہوئے یعنی اقبال کی پیدائش سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل اور ظہیرالدین بابر کے ہندوستان میں ورود ہونے سے تقریباً ایک سو سال پہلے جب تختِ دہلی پر سادات یا اُن کے بعد سلطان بہلول لودھی کا قبضہ تھا۔ [۱۶]

اقبال نے اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں کئی جگہ پر تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق مادی اور دنیاوی آسودگی سے بڑھ کر اخلاقی اور روحانی مسرتوں کی تلاش میں تھا اور دنیا کی نسبت دین کے معاملات کو ترجیح دی۔ اقبال نے اپنے خاندان کے متعلق ضربِ کلیم میں اپنی نظم ''جاوید سے'' میں ان اشعار کی روشنی میں ذکر کیا ہے:

غارت گر دین ہے یہ زمانہ
ہے اس کی نہاد کافرانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اُس کا مذاق عارفانہ [۱۷]

اقبال کے خاندان نے کب کشمیر سے سیالکوٹ ہجرت کی؟ اس کے متعلق کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں کشمیر سے ہجرت کی۔ کشمیر پر اس دور میں افغانوں اور سکھوں کے تسلط کی بنا پر غربت و افلاس، سکھوں کی سفاکی، خون ریزی اور ظلم و ستم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان سے نجات کے حصول کے سلسلہ میں بے شمار کشمیری گھرانے برصغیر کے مختلف شہروں میں ترکِ وطن کر کے آباد ہو گئے۔ انھی کے ہمراہ اقبال کے آباؤ اجداد بھی برصغیر میں وارد ہوئے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی یہی قیاس آرائی کی ہے۔

اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے بزرگ بھی انھی حالات کے پیشِ نظر عدمِ تحفظ کے عالم میں افغانوں کے آخری دور میں وطن سے ہجرت کر گئے اور سیال کوٹ پہنچ کر انھوں نے تجارت کو اپنا پیشہ بنایا۔ [۱۸]

اقبال کے خاندان کے جدِ امجد بابا لول حج کی نامعلوم پشتوں کے بعد شیخ اکبر ایک نہایت بزرگ تھے۔ ان کی دو یا تین پشتوں کے بعد جمال الدین (پردادا اقبال) اپنے چار بیٹوں عبدالرحمٰن، محمد رمضان، محمد رفیق (دادا اقبال) اور عبداللہ کے ہمراہ ترکِ وطن کرنے کا امکاں معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال انیسویں صدی کے آغاز تک یہ افراد سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے۔ فقیر سید وحیدالدین اپنی تصنیف میں یوں بیان کرتے ہیں:

اُن میں علامہ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق اور اُن کے دو بھائی شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ محمد رمضان تو سیالکوٹ میں رہتے تھے اور تیسرے بھائی شیخ عبداللہ موضع جیٹھی کے ہیں۔ ان چاروں بھائیوں کی اولاد آج تک شہر سیالکوٹ اور موضع جیٹھی میں آباد ہے۔[۱۹]

اقبال کے خاندان نے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد فکرِ معاش کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ اقبال کے دادا کے بھائی شیخ محمد رمضان جو طبعاً صوفی منش بزرگ تھے انھوں نے فارسی زبان میں تصوف پر بھی چند کتب تحریر کیں۔ اقبال کے دادا کے بھائی شیخ عبداللہ کی اولاد ریاست حیدرآباد دکن میں نقل مکانی کر گئی اور زراعت پیشہ سے منسلک ہو گئی۔ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق نے سیالکوٹ میں بزازی کی دکان کھول لی۔ ان کے ہمراہ ان کے فرزند شیخ نور محمد (والد اقبال) کشمیری لوئیوں اور دھسوں کی فروخت کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ بعدازاں اس کاروبار میں اضافہ کرتے ہوئے کلاہ اور ٹوپیاں سینے لگے جس سے شیخ نور محمد کا نام شیخ نتھو ٹوپیاں والا مشہور ہو گیا۔ انھوں نے اپنی دکان میں شاگرد اور ملازم بھی رکھے ہوئے تھے۔ سیالکوٹ میں سب سے پہلے انھوں نے سلائی مشین خریدی تھی۔ اسی بنا پر ان کا کاروبار بہت شہرت کا حامل ہو گیا البتہ شیخ نور محمد کے چھوٹے بھائی غلام محمد محکمہ انہار میں ملازم ہوئے اور ان کا انتقال روپڑی (ضلع انبالہ) میں ہوا اور شیخ محمد رفیق کا انتقال بھی یہیں ہوا۔ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق نے کاروبار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مکان بھی خریدا جہاں اقبال کے والد شیخ نور محمد اور ان کے بھائی شیخ غلام محمد پیدا ہوئے اور یہیں ان کی شادیاں ہوئیں۔ اس مکان کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں۔

۱۸۶۱ء میں شیخ محمد رفیق نے موجودہ جدی مکان، جو بعد میں ''اقبال منزل'' کے نام سے موسوم ہوا، خرید کیا اور اُس میں اقامت پذیر ہوئے۔ تب یہ مکان یک منزلہ تھا......اور مکان کا دروازہ محلّہ چوڑیگراں کی جانب تھا۔ انھی کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک میں اقبال پیدا ہوئے۔[۲۰]

شیخ نور محمد کی شادی امام بی بی (والدہ اقبال) سے موضع سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک

کشمیری گھرانے میں ہوئی۔ امام بی بی اگرچہ دنیاوی علم سے بے بہرہ تھیں مگر دینوی تعلیم سے آراستہ تھیں۔ وہ نہایت دانش مند تھیں اور انھیں محلے برادری میں عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ یہی حال شیخ نور محمد کا تھا۔ انھیں بھی تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ صوفیا اور علما کی مجالس میں بیٹھتے تھے اور یادِ الٰہی میں وقت گزارتے تھے۔ ان کے ہم عصر اکابرین انھیں ان پڑھ فلسفی کہا کرتے تھے اور تصوف کے مسائل کے مشکل مطالب کی تشریح کروانے کے لیے بعض لوگ رجوع کرتے تھے۔ وہ نہایت صلح پسند اور حلیم شخص تھے۔ وہ فقط اپنے کام سے سروکار رکھتے تھے۔[۲۱]

شیخ نور محمد اور امام بی بی کے ہاں کل سات بچے پیدا ہوئے۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

سب سے بڑے بیٹے شیخ عطا محمد ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ جب میاں جی کی عمر تئیس برس تھی۔ اُن کے بعد دو بیٹیاں فاطمہ بی اور طالع بی پیدا ہوئیں۔ اس دوران ایک لڑکا بھی ہوا جو چند ماہ بعد فوت ہو گیا۔ اقبال کی پیدائش کے وقت میاں جی کی عمر چالیس برس تھی۔ اُن کے بعد دو بیٹیاں کریم بی اور زینب بی پیدا ہوئیں۔[۲۲]

شیخ نور محمد کے ہاں جمعہ ۳ ذیعقد ۱۲۹۴ھ بمطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اقبال پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس تھی اور یہ دور شیخ نور محمد کے لیے مالی لحاظ سے بڑا خوشحال تھا۔ اسی دور میں قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر الزہرہ کے والد نذر الباقر (قرۃ العین کے نانا) کے والد میر مظہر علی (قرۃ العین کے پرنانا) سیالکوٹ میں تحصیل دار تھے۔ تحصیل دار اُس دور میں میونسپلٹی کے چیئر مین کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور مجسٹریٹ درجہ اوّل کے فرائض بھی ادا کرتا تھا۔ سیالکوٹ کے حوالے سے قرۃ العین حیدر اپنے ننھیال خاندان کے متعلق ان الفاظ میں روشنی ڈالتی ہے:

سینما لیٹرن کے ذریعے ۱۸۷۵ء کے سیالکوٹ کا ایک بہترین سین سیزیوں والا بائیسکوپ لیڈیز اور جنٹلمین کو دکھلاتے اور نکلوفون آلے کے ذریعے گم شدہ آوازیں سنواتے ہیں۔ سنیے مسٹر ایس۔ این۔ بیکر (سید نذر الباقر) کے پردادا میر معصوم علی چکلہ دار اودھ کے بیٹے خان بہادر میر قائم علی سی آئی ای کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اجازت تھی کہ سارے صوبے میں بے شک جس جگہ چاہیں اپنا اجلاس کریں۔ جس وقت آپ نے بمقام گورداسپور ۱۸۷۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا فرزند اُن کے میر مظہر علی سیالکوٹ میں تحصیل دار تھے۔ (تحصیل دار اُس زمانے میں میونسپلٹی کا چیئر مین ہوتا تھا۔ انکم ٹیکس لگاتا تھا اور مجسٹریٹ درجہ اوّل کا کام کرتا تھا)۔[۲۳]

اقبال کے والد چونکہ صوفی منش اور تصوف کی طرف مائل تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت اسلامی مدارس اور خانقاہوں کے علاوہ صوفیا اور علما کی مجالس میں گزرتا تھا۔ جس وجہ سے ان کا حلقۂ احباب

محدود تھا، جن میں میر حسن اور میر مظہر علی بھی شامل تھے۔ اس طرح اقبال اور قرۃ العین حیدر کے خاندان کے مراسم کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر واضح الفاظ میں بیان کرتے ہوئے ان کے تعلقات اور سیالکوٹ شہر کے متعلق آگاہ کرتی ہیں:

قدیم اسلامی مدارس اور خانقاہوں کا شہر اس گئے گزرے زمانے میں بھی مردم خیز تھا۔ شمس العلما مولوی سید میر حسن اور ایک کشمیری نژاد صوفی منش بزرگ شیخ نور محمد ایک چودھری صاحب جن کے آبا سکھ سے مسلمان ہوئے تھے اور خواجہ غلام حاضر کے بزرگ جو چائے خانے اور سرائے کے مالک تھے۔ میر صاحب کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔[۲۴]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے حوالے سے نہ صرف اپنے خاندان کے تعلقات کو بیان کرتی ہے بلکہ علامہ اقبال کے استاد محسن میر حسن کے ساتھ ایک اور جگہ تعلقات بیان کرتے ہوئے اس کے دیگر رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات کا ذکر بھی فخریہ انداز میں کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں میر حسن کے علاوہ ان کے حقیقی بھتیجے بھی اس خاندان کے گہرے دوست اور خیر خواہ تھے۔

انعام اللہ سے کوئی خون کا رشتہ نہ تھا مگر اس گھرانے پر جان نثار کرتے تھے۔ اُن کے حقیقی چچا شمس العلما پروفیسر میر حسن سیالکوٹی (علامہ اقبال کے استاد) نذر بیگم، مصطفےٰ باقر، ثروت آراء کے دادا اور میر افضل علی کے نانا میر مظہر علی کے گہرے دوست تھے۔[۲۵]

جس دور میں شیخ نور محمد دھسوں اور لوئیوں کے کاروبار میں اس قدر یکتا ہو چکے تھے اُسی دور میں سیالکوٹ کے ایک صاحب ڈپٹی وزیر علی بلگرامی نے ایک باغ سیالکوٹ میں لگوایا جو بعد ازاں ان کے نام سے مشہور ہو گیا۔ انھوں نے باغ میں ایک حوض بھی بنوایا جہاں ہندو اور مسلمان بسنت کے موقع پر مشترکہ میلہ مناتے تھے۔ انھوں نے شیخ نور محمد کو اپنے ہاں سب سے پہلے پارچہ دوزی پر بھی ملازم رکھا اور ایک ''سنگر سینے'' سلائی مشین بھی منگوا کر دی۔ مگر والدہ اقبال شیخ نور محمد کی تنخواہ میں سے ایک حبہ بھی خرچ اس بنا پر نہ کرتی تھیں کہ ڈپٹی صاحب کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ شرعاً ناجائز تھا۔ اسی وجہ سے شیخ نور محمد نے کچھ مدت کے بعد یہ ملازمت ترک کر دی۔[۲۶]

قرۃ العین حیدر بھی شیخ نور محمد کی پارچہ دوزی کے متعلق تحریر کرتے ہوئے اپنے خاندان کے ساتھ روابط کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

شیخ نور محمد میر مظہر علی کے ہاں بھی پارچہ دوزی کرتے تھے۔[۲۷]

ڈپٹی وزیر علی کے ہاں ملازمت ترک کرنے کے بعد شیخ نور محمد نے برقعوں کی ٹوپیاں اور کلاہ سینے کے لیے ایک دکان کھولی اور یہ دھسے اور ٹوپیاں اس قدر پسند کی جاتی تھیں کہ ہاتھوں ہاتھ بک

جاتیں اور اس سے انھیں اچھی خاصی آمدنی حاصل ہونا شروع ہوگئی۔ بقول علامہ اقبال:

اُس زمانے میں معمولی دھسوں کی قیمت دو روپے فی دھسہ سے زیادہ نہ تھی۔ والد ماجد نے کوئی دو چار سو دُھسے تیار کیے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں بک گئے۔ حالانکہ فی دھسہ آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہ آئی تھی۔ دو چار سو دھسے فروخت ہوگئے تو کافی روپیہ جمع ہوگیا۔ پس یہ ابتدا تھی ہمارے دن پھرنے کی۔[۲۸]

قرۃ العین حیدر بھی شیخ نور محمد کے خیاط کے کاروبار کے متعلق بتاتی ہیں کہ ان کے سلے ہوئے کلے اور ٹوپیاں اس قدر پسند کیے جاتے تھے کہ ان کی والدہ (نذر الزہرہ) کو بھی اُن کے دادا میر مظہر علی بڑے شوق و ذوق سے پہناتے تھے۔

سیالکوٹ میں مصطفائی بیگم اور نذر الباقر کی لڑکی نذر زہرا بیگم ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئیں۔ میاں نذر الباقر فوجی کمسریٹ ایجنٹ فلائنگ آفریدی بنے۔ جگہ جگہ اُڑتے پھرتے تھے۔ مصطفائی بیگم سیالکوٹ میں ساس سسر کے پاس رہتیں۔ میر مظہر علی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاڈلی تین سالہ پوتی نذر زہرا کو شیخ نور محمد کا سیا ہوا سرخ ریشمی برقعہ اوڑھا گھوڑے پر اپنے سامنے بٹھلاتے اور صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہوا ہو جاتے۔ ماہر شہسوار تھے لیکن اجل بھی گھوڑے پر آئی کہ سیالکوٹ سے ملتان تبادلہ ہوا۔ ۱۸۹۵ء کا ذکر ہے۔[۲۹]

شیخ نور محمد اپنے ہونہار اور لاڈلے لختِ جگر محمد اقبال کو دینوی تعلیمات دلانے کی خواہش رکھتے تھے۔ چونکہ شیخ نور محمد بڑے دین دار اور سیالکوٹ کے علما و فضلا سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے اور معارفِ دین کی سوجھ بوجھ کے لیے بعض اوقات ان کا مولوی غلام حسین کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ مولوی غلام حسین محلّہ شوالہ کی مسجد میں درسِ قرآن، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم دیتے تھے۔ اسی وجہ سے اقبال کے والدِ محترم انھیں ساڑھے چار سال کی عمر تک یہیں چھوڑ گئے اور اقبال نے اسی مسجد میں درسِ قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ یہیں پر میر حسن کی نظر اقبال پر پڑی اور اقبال کے متعلق مولانا غلام حسین سے دریافت کیا یہ کس کا بچہ ہے؟ بعد ازاں شیخ نور محمد سے کہہ کر اسے اپنے مکتب میں کوچہ حسام الدین لے آئے۔ کوچہ حسام الدین میر حسن کے چچازاد بھائی، میر حسام الدین کے نام سے منسوب تھا۔ مولوی میر حسن نے اسی مکتب میں اردو، عربی اور فارسی ادب کی تعلیم دینا شروع کی۔ اقبال نے میر حسن کی محبت و شفقت کے زیرِ سایہ سکاچ مشن ہائی سکول اور کالج میں داخلہ لیا اور ان کے استادِ محترم نے ان میں علومِ اسلامیہ و قدیمیہ کے لیے بے پناہ تشنگی پیدا کردی۔ اقبال نے میر حسن کے اس احسان اور فیض کا تذکرہ بڑے فخریہ انداز میں کیا ہے۔

مجھے اقبال اس سید گھرانے سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں[۳۰]

قرۃ العین حیدر نے اسکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ کے مولوی میر حسن کے فیض عام اور اقبال کی رفاقتوں کو اپنے خاندان کے لیے باعثِ فخر اور مسرت محسوس کیا ہے کہ ایسے اساتذہ اور ادارے میں جہاں ان کے نانا اور اس کے دونوں بھائی اقبال کے ہمراہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئے تھے اس کا تذکرہ واضح الفاظ میں کیا ہے:

شیخ نور محمد کا فرزند محمد اقبال میر صاحب کے فرزندِ اصغر میر ظہور حسنین کا ہم عمر تھا۔ میر صاحب کے تینوں لڑکے فیض العسکری، نذر الباقر اور ظہور حسنین مع اقبال بستے اٹھائے روز صبح اسکاچ مشن اسکول کا رُخ کرتے اور پادریوں سے انگریزی اور میر حسن سے عربی فارسی پڑھتے۔[۳۱]

اقبال نے اسکاچ مشن ہائی اسکول (جو بعد ازاں انٹر کالج بھی بن گیا) سے ۱۸۹۱ء میں پہلا پبلک امتحان جو پنجاب یونیورسٹی کے تابع ہوا تھا، اسے پاس کیا اور ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان گجرات کے ایک امتحانی مرکز میں دے کر پاس کیا اور ثانوی تعلیم کا مرحلہ طے کر کے سکاچ مشن کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اقبال نے سکول و کالج کے امتحانات میں اعلیٰ کارکردگی دکھائی جس بنا پر انھیں وظائف بھی ملے۔ عربی سے انھیں خاص شغف تھا۔ انٹر پاس کرنے کے بعد اقبال گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخل ہوئے۔

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی تعلیم و تربیت کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ اپنے ننھیال کے افراد کی تعلیم و تربیت کا بھی ذکر کرتی ہیں کہ اقبال بڑے ذہین تھے مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے سیالکوٹ سے لاہور تشریف لائے مگر ان کے نانا اور ان کے بھائیوں میں کوئی بھی مڈل، انٹرنس یا دینی علوم سے آگے نہ بڑھ سکے۔

میر فیض العسکری (ولادت ۱۸۵۸ء) سادات لانکڑی کے پہلے نوجوان تھے۔ جنھوں نے انٹرنس پاس کیا۔ بعد ازاں تحصیل دار لگ گئے۔ میر نذر الباقر نے آٹھویں کلاس سے اسکول چھوڑ کر سیالکوٹ چھاؤنی میں سپلائی ایجنٹ کا کام شروع کر دیا۔ ۱۸۹۲ء میں میر ظہور حسنین انٹرنس کے بعد مدرسۃ العلوم روانہ کیے گئے۔ شیخ محمد اقبال اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے کر کے لاہور آ گئے۔ اس کے بعد پڑھتے ہی چلے گئے، بے حد پڑھا۔[۳۲]

اقبال کے متعلق جیسا کہ قرۃ العین حیدر بتاتی ہیں کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دی اور حصول تعلیم کو اپنی زندگی کا اولین منشور قرار دیا۔ لہٰذا اقبال نے ستمبر ۱۸۰۵ء میں گورنمنٹ

کالج لاہور میں بی۔اے کے لیے داخلہ لیا اور انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین پڑھے اور ۱۸۹۷ء میں امتیازی نمبروں سے بی۔اے پاس کر کے دو امتیازی تمغے بھی حاصل کیے۔اس دور میں فلسفہ کے اساتذہ پروفیسر او شراور اسسٹنٹ پروفیسر جیارام تھے۔اسی سال اقبال نے ایم۔اے فلسفہ کی جماعت میں داخلہ لیا اور اسی دوران گورنمنٹ کالج لاہور میں واقع لاء سکول میں P.E.L کا امتحان دسمبر ۱۸۹۸ء میں دیا۔مگر اصولِ قانون کے پرچے میں ناکامی ہوئی۔۱۸۹۹ء میں ایم۔اے فلسفہ کا امتحان دے کر تھرڈ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ایم۔اے فلسفہ میں اقبال اکیلے امیدوار تھے۔جس بنا پر انھوں نے نقرئی تمغہ بھی حاصل کیا۔یہ کامیابی اقبال نے پروفیسر تھامس آرنلڈ جیسی عظیم شخصیت کی رہنمائی میں حاصل کی۔جن کا تبادلہ ۱۱رفروری ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا۔

قرۃ العین حیدر بھی سر طامس آرنلڈ کی عظمت اور قابلیت کی معتقد ہیں کیونکہ وہ ان کے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم کے بھی استاد تھے۔لہٰذا قرۃ العین حیدر تھامس آرنلڈ کے تبادلہ اور اقبال کے معلم بننے کے متعلق ان الفاظ میں آگاہ کرتی ہیں:

۱۸۹۸ء میں سر طامس آرنلڈ لاہور چلے گئے۔جہاں وہ اقبال کے استاد بنے۔[۳۳]

جب انگریز کا زمانہ آیا اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں قرۃ العین حیدر کے پردادا میر احمد علی نے انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کیا تو ان کی جاگیریں ضبط ہوگئیں اور ان کے خاندان پر بھی زوال کا دور آیا جس بنا پر نئی نسل کو انگریزی پڑھنا اور سرکاری ملازمتیں کرنا پڑیں۔اس نئی نسل میں انگریزی پڑھنے اور سرکاری ملازمت کرنے والے قرۃ العین حیدر کے دادا سید جلال الدین اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر کرار حیدر تھے۔جن کے متعلق وہ اپنے مضمون ''سجاد حیدر یلدرم'' میں رقم طراز ہیں:

یلدرم کے باپ خان بہادر سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے حاکم تھے۔ان کے چھوٹے بھائی یعنی یلدرم کے چچا خان بہادر ڈاکٹر کرار حیدر یوپی میں سول سرجن تھے اور انیسویں صدی کے آخر میں صوبے کے مشہور ڈاکٹروں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔[۳۴]

قرۃ العین حیدر کے دادا سید جلال الدین حیدر اپنے فیوڈل پس منظر اور خود اپنے وسیع اختیارات اور اقتدار کے باوجود نرم مزاج اور شفقت کرنے والے فرد تھے اور اپنی اولاد پر بھرپور توجہ دینے والے شخص تھے۔انھوں نے سرسید کے مدرسۃ العلوم میں اپنی اولاد کو داخل کروایا تاکہ جدید علوم سے واقفیت حاصل کر سکیں۔اس کے متعلق قرۃ العین حیدر بیان کرتی ہیں:

نئی اپر مڈل کلاس کے رکن خان بہادر سید جلال الدین حیدر نے بھی اپنے چاروں بیٹوں کو جنھیں وہ

اپنے چار گاؤں کہتے تھے مدرسۃ العلوم میں بھیجا۔[۳۵]

قرۃ العین حیدر کے والد سید سجاد حیدر یلدرم بمقام قصبہ کانڈیر ضلع جھانسی میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم بنارس میں حاصل کی جہاں ان کے والد بسلسلہ ملازمت ٹھہرے ہوئے تھے، سکول کی تعلیم کے بعد یلدرم اور ان کے بھائی ایم۔اے۔او کالج میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بھیج دیئے گئے۔

سجاد حیدر (پیدائش ۱۸۸۰ء) ۲۱ر نومبر ۱۸۹۲ء کو نویں کلاس میں داخل ہوئے۔نصیر الدین حیدر دو سال چھوٹے بھائی ۱۴ر دسمبر ۱۸۹۶ء کو نویں کلاس میں اور سب سے چھوٹے وحید الدین حیدر اسی روز پانچویں کلاس میں شامل کیے گئے۔[۳۶]

یلدرم نے تعلیم میں گہری دلچسپی لی مگر وہ حساب میں بے حد کمزور تھے۔ان کے مہربان استاد محترم میر ولایت حسین جو ایم۔اے۔او کالجیٹ سکول کے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر کے علاوہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی بھی کرتے تھے انھوں نے یلدرم کو بڑی جانفشانی اور لگن سے ریاضی سکول وقت کے بعد پڑھاتے تھے۔انٹرمیڈیٹ کے دیگر مضامین میں ان کی اوّل پوزیشن آئی مگر ریاضی میں پھر بھی فیل ہو گئے۔جس وجہ سے ان کا ایک قیمتی تعلیمی سال بھی ضائع ہو گیا۔حتیٰ کہ سجاد کے دیگر احباب کھیل کود اور آوارہ گردی میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے تھے جبکہ یلدرم ایک کتابی کیڑے کی مانند پڑھائی میں دلچسپی رکھتے تھے۔قرۃ العین حیدر نے یلدرم کے احباب کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی پڑھائی کی صورت حال ان الفاظ میں بیان کی ہے:

سجاد حیدر، نصیر الدین، خواجہ غلام الثقلین، شوکت علی، محمد علی، سردار محمد حیات، مشتاق احمد زاہدی، سید رضا علی، سید ظہور حسنین سب کے سب سید محمود کورٹ میں مقیم ایک زبردست لونڈھار پارٹی کے اراکین بنے......سید ظہور حسنین مراد آباد کے دقیانوسی شیعہ محلے سادات لانگڑی کے ایک ہونہار نوجوان تھے جو علی گڑھ کے نامور کھلنڈرے اور فٹ بال کے کپتان بنے۔سید سجاد حیدر کھیل کود سے بے نیاز کتابوں کے رسیا، دونوں کے فرشتوں کو علم نہ تھا کہ ایک روز میر ظہور حسنین موخر الذکر کے چچا سسر بنیں گے......اس ماحول میں سجاد کتاب کے کیڑے تھے۔ادبی ذوق رکھنے والے طلبا کی موجودگی روا رکھی جاتی تھی مگر قابل تحسین نہ سمجھے جاتے تھے۔[۳۷]

قرۃ العین حیدر کے نانا کے بھائی میر ظہور حسنین جو یلدرم کے چچا سسر تھے لیکن ایک وقت تھا جب علی گڑھ میں کھیلنے کودنے کے ساتھ ساتھ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو رہے تھے لیکن وقت ایک سا نہیں رہتا۔اس میں شب و روز کا ایک سلسلہ جاری ہے۔یلدرم کے دوست، چچا سسر میر ظہور

حسنین حصولِ تعلیم کے بعد محکمہ پولیس میں تعینات ہو گئے۔ مگر مئی ۱۹۱۲ء میں شدید بیمار ہو گئے تب ان کی عمر انتالیس برس تھی۔ اس عالم میں بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے فکرِ فردا اور یادِ ماضی میں گم پڑے رہتے اور اپنے پرانے دوست احباب کے متعلق سوچتے رہتے کہ جب وہ اکٹھے پڑھا اور کھیلا کرتے تھے۔ اُنھیں محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی (دونوں بھائی) اور بالخصوص علامہ اقبال شدت سے یاد آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اپنے نانا کے بھائی میر ظہور حسنین کی یادوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہوئے ان کی دوستی کو منظرِ عام پر لاتے ہوئے علامہ اقبال کے ساتھ منسوب کرتی ہیں:

> پلنگ کے سرہانے میز پر دواؤں کی شیشیاں، کتابیں، کامریڈ کے پرچے، لڑکے جو ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے۔ اچانک ان کے راستے دنیا میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ وہ سیالکوٹ والا ہم مکتب لنگوٹیا یار کشمیری نژاد پنجابی لڑکا اقبال آج زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ سُن سُن کر جی خوش ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے ہم مکتب دونوں رام پوریئے بھائی لیڈری پر اتر آئے۔[۳۸]

یلدرم ادبی ذوق اور علمی جستجو کے سبب کالج میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ علی گڑھ کالج ان دنوں آکسفورڈ یونیورسٹی کی مثال رکھتا تھا کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک تھے۔ آرنلڈ نکلسن انگریزی پڑھاتے تھے۔ مولوی عباس حسین عربی اور مولانا شبلی نعمانی فارسی پڑھاتے تھے۔ یلدرم کو فارسی سے بھی گہری رغبت تھی۔ یلدرم پڑھائی کے علاوہ سماجی کارکن بھی تھے۔ لہٰذا آرنلڈ سے یلدرم کے مراسم بھی اقبال کی مانند گہرے تھے۔ یلدرم پر بھی آرنلڈ کی محبت وشفقت کے گہرے اثرات تھے۔ یہ دونوں عظیم شخصیات ایک ہی استاد کے شاگرد بنے اور ادبی دنیا میں نام روشن کیا اور پروفیسر آرنلڈ کی خصوصی نگاہ اور دست شفقت سے ان کی خوابیدہ صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔ جس بنا پر قرۃ العین حیدر آرنلڈ کے حوالے سے اقبال اور یلدرم کا ایک روحانی رشتہ قائم کرتے ہوئے گہرے روابط قائم کرتی ہیں:

> بقول پروفیسر آرنلڈ سجاد حیدر کا شمار کالج کے ہونہار ترین طلبا میں تھا اور اپنی قابلیت کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز تھے۔ سجاد حیدر ''انجمن اخوان الصفا'' کے ممبر بھی تھے جو پروفیسر آرنلڈ نے قائم کی تھی۔ پروفیسر صاحب موصوف عربی عبا پہن کر کالج کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں سر طامس آرنلڈ لاہور چلے گئے۔ جہاں وہ اقبال کے استاد بنے۔[۳۹]

سجاد حیدر علمی و ادبی سرگرمیوں کو آگے بڑھاتے رہے اور اپنی زندگی کو حرکت و عمل کی طرف گامزن رکھا وہ ایک علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی بنا پر مزید تعلیم حاصل کرنا ان کے منشورِ حیات میں شامل تھا۔ سجاد کے دیگر تمام احباب تعلیمی لحاظ سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اسی دور

میں اسکول کے سینئر طلبا یونین کلب کے رکن تھے۔ان کے استاد میر ولایت علی ان کی حوصلہ افزائی کر کے مباحثوں میں شرکت کے لیے اکساتے رہتے تھے۔جس کے زیر اثر راجہ مہندر پرتاب سنگھ، محمد علی اور سجاد حیدر یلدرم اس سوسائٹی میں بڑھ چڑھ کر تقریریں کرتے تھے۔آخر کار وہ ملک کے مایہ ناز مقرر بن گئے اور یلدرم ساتھ ساتھ بی۔اے میں بھی پڑھ رہے تھے۔بقول قرۃ العین حیدر:

> سجاد حیدر نے ۱۹۰۱ء میں بی۔اے پاس کیا۔امتحان الہ آباد میں جا کر دیا جاتا تھا۔الہ آباد طاعون کی وبا پھیلی۔امتحان کا سنٹر لکھنؤ منتقل کیا گیا۔[۴۰]

قرۃ العین حیدر حرکت وعمل کے یہی اصول زیادہ تر اقبال کی مانند اپنے باپ میں دیکھتی ہے اور آگے بڑھنے کی خواہش اور جذبات کو فروغ دیتی ہے۔وہ اپنے باپ کی تعلیمی جستجو کے دور کے متعلق بتاتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ یہ وہی دور تھا جب اقبال نے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان دیا۔بے شک جس میں وہ ناکام رہے۔قرۃ العین حیدر یہاں دونوں کی جستجو اور کاوشوں اور ایک ہی دور کی مماثلت بیان کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔بہرحال وہ اقبال کے اس امتحان کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

> اقبال نے ۱۹۰۱ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان دیا تھا۔[۴۱]

سجاد حیدر یلدرم اپنے دور کے بہترین مقرر تھے۔انہیں تقریر کرنے کا شوق اسکول دور ہی سے تھا۔اخبار بینی ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔کالج کی پسندیدہ شخصیت کی بنا پر یونین کے تمام اعزازی عہدے بھی ان کے پاس رہے۔وہ پہلے سیلیکٹ کمیٹی کے رکن رہے۔بعد ازاں لائبریرین، سیکریٹری، تمام تقریری مقابلہ میں حصہ لے کر انعامات حاصل کرتے تھے۔انہی مشاغل کی بنا پر یلدرم میں ادیبانہ خصائل ایف۔اے سے قبل ہی پیدا ہو گئے۔بقول قرۃ العین حیدر:

> مضمون نگاری ایف۔اے سے بھی قبل شروع کی۔انگریزی انشاپردازی میں بھی سجاد بی۔اے کرنے سے پہلے ہی اپنے ہم عصروں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔کالج کے طلبا اس زمانے میں انگریزی اچھی ہونے کا معیار یہ سمجھتے تھے کہ پائنیر رسالہ میں مضمون چھپ جائے......سب سے پہلے سجاد کا ہی ایک مضمون شائع ہوا۔اُن کے بعد جن صاحب کا مضمون شائع ہوا وہ محمد علی (جوہر) تھے۔جو اُن کے کلاس فیلو تھے۔[۴۲]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یلدرم کو زمانہ طالب علمی میں ہی مضمون نگاری کا یہ شوق بڑے بزرگ رہنما ادبا کی سرپرستی میں پروان چڑھا اور اسی شوق میں انھوں نے سرسید کے بے حد مخلص اور روشن خیال دوست نواب حاجی اسمٰعیل خان سے ترکی پڑھی اور اس کے نعم البدل

یلدرم بھی اُنھیں انگریزی پڑھائی تھی۔ یلدرم حاجی صاحب کے سیکریٹری بھی بن گئے۔ نواب حاجی اسمٰعیل خاں نے انھی دنوں علی گڑھ سے معارف ایک رسالہ جاری کیا جس میں بہت اعلیٰ قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ یلدرم نے بھی اس میں چند طبع زاد افسانے بھی تحریر کیے۔ یلدرم اس رسالے کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور مولوی وحیدالدین سلیم ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یلدرم اُس دور میں ایف۔اے کے طالب علم تھے۔قرۃ العین حیدر یلدرم کی ادبی زندگی کے آغاز کے متعلق ان الفاظ میں تحریر کرتی ہیں:

سجاد حیدر معارف میں خود بھی مضمون لکھتے تھے اور انگریزی رسالوں کے اعلیٰ مضامین کا ترجمہ بھی کرتے تھے۔۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک معارف میں سجاد حیدر نے چند طبع زاد افسانے لکھے۔[۴۳]

یلدرم کی معارف میں درج ذیل نگارشات اور تراجم کی فہرست جو اس وقت تک میسر ہوئی ہے۔ان کے متعلق ڈاکٹر ثریا حسین کچھ اس طرح تفصیل بیان کرتی ہے:

ناول نویسی (مقالہ) معارف اکتوبر ۱۸۹۸ء (۲) مسئلہ ازدواج پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات از سجاد حیدر آنریری سیکریٹری ایس۔یو کلب، معارف یکم مئی ۱۸۹۹ء (۳) مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ، معارف اگست ۱۹۰۰ء (۴) نشے کی پہلی ترنگ (افسانہ از مفاخر بے) معارف اکتوبر ۱۹۰۰ء (۵) انگریزی لٹریچر اور ہندوستانی مسلمان معارف ستمبر ۱۹۰۰ء (۶) مرقع سرکیشیا (ناول از احمد مدحت) معارف ،دسمبر تا جنوری ۱۹۰۱ء (۷) جواب (افسانہ از خلیل رشیدی) معارف جولائی ۱۹۰۱ء۔[۴۴]

اقبال نے بھی زمانۂ طالب علمی میں ہی شعر و شاعری میں دلچسپی لی اور اپنا کلام مرزا داغ دہلوی کو اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ بقول شیخ عبدالقادر:

اقبال ابھی اسکول ہی میں پڑھتے تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔ پنجاب میں اردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں زباندانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔ سیالکوٹ میں بھی شیخ محمد اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔ اُس کے لیے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔ شعرائے اُردو میں اُن دنوں نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا اور نظام دکن کے استاد ہونے سے اُن کی شہرت اور بڑھ گئی تھی لوگ جو اُن کے پاس جا نہیں سکتے تھے۔ خط و کتابت کے ذریعہ دور ہی سے اُن سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے......شیخ محمد اقبال نے بھی انھیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔[۴۵]

اقبال نے ایف۔اے کے سال اوّل ہی میں داغ کی شاگردی اختیار کی اور اصلاح کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ کالج لاہور سے ۲۸ رفروری ۱۸۹۹ء کو ایک مراسلہ احسن

ماروی کے نام تحریر کیا جس میں بھی داغ کی شاگردی کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔

اگر آپ کے پاس استاذی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمایئے گا...... میں نے تمام دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں...... غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا۔ [۴۶]

اقبال داغ سے اپنی والہانہ عقیدت اور اس کی شاعرانہ عظمت کے معترف رہے اور داغ کے تعلق کو اپنے ساتھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے غالب اور میر مہدی مجروح کے بحیثیت استاد اور شاگرد کے تعلقات تھے۔ اقبال اس کا اظہار داغ کی وفات پر بانگ درا کی ایک نظم ''داغ'' میں ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

عظمتِ غالب ہے، اک مدت سے پیوندِ زمین
مہدی مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے [۴۷]

یلدرم ایک ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے اور شاعرانہ مزاج رکھتے تھے مگر انھوں نے اپنا مجموعہ کلام شائع نہ کروایا۔ ان کی چھوٹی موٹی نظمیں مختلف ادبی رسائل کی زینت بنتی رہیں۔ درحقیقت یلدرم عام طور پر شعر نہ کہتے تھے بلکہ جب کوئی خاص واقعہ یا موقع ہوتا تو کلام موزوں ان کی زبان سے رواں ہو جاتا تھا۔ یلدرم کی شاعری کے متعلق ان کے دوست پرنسپل مشتاق احمد زاہدی ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

سید سجاد حیدر صاحب اس معنی میں شاعر نہیں تھے کہ وہ بڑے بڑے شاعروں میں دادِ سخن حاصل کرتے اور صاحب دیوان ہوتے لیکن اس معنی میں شاعر ضرور تھے کہ شعر کہتے تھے اور اچھا شعر کہتے تھے۔ ان کا توسن طبع جس طرح نثر میں شوخ وطراز تھا۔ اسی طرح نظم میں بھی ہوا میں باتیں کرتے تھے۔ [۴۸]

یلدرم خود بھی شعر و شاعری کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے تھے مگر شعر و شاعری کرتے اور عام کاغذات پر تحریر کر کے پھینک دیتے تھے۔ قرۃ العین حیدر یلدرم کی شاعری کے متعلق یوں بتاتی ہیں:

یلدرم خود اپنی شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے...... سجاد میاں پنسل سے لفافوں کی پشت پر ادھر اُدھر کے کاغذوں پر شعر لکھ کر بے پروائی سے پھینک دیتے ہیں۔ [۴۹]

یلدرم بھی اقبال کی مانند داغ کے معتقد تھے اور اُن کی شاعرانہ عظمت اور شاعری کے دلدادہ

تھے۔ یلدرم نے بھی داغ کی وفات پر ایک مرثیہ اقبال کی مانند تحریر کیا گو یلدرم اس وقت بغداد میں تھے۔ یہ مرثیہ مخزن میں شائع ہوا۔ یلدرم نے اس مرثیہ میں داغ کی عظمت کو سراہتے ہوئے داغ کی وفات کے ساتھ ہی ہندوستان میں شاعری کو خیر باد کہا ہے کہ تیرے جانے کے بعد شاعری پہ دورِ زوال آ گیا ہے۔

تیرا بھی، اے شاعری دور تھا آخری
آج تو رخصت ہوئی، ہند کو کر کے سلام
داغ نہیں دہر میں، دل ہے ہر اک داغ داغ
شعر کا ویران ہے گھر، نظم کا گل ہے چراغ [۵۰]

یلدرم کے اس مرثیے کے اس مصرع ''داغ نہیں دہر میں، دل ہے ہر اک داغ داغ'' سے اقبال کے الم و حزن کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب داغ کی وفات ہوئی تو یلدرم نے یہ مرثیہ تحریر کیا تو اس وقت اقبال شاعری کے افق پر چھا چکے تھے اور یلدرم کو اقبال کے حوالے سے بھی داغ کی اہمیت کا علم تھا۔

اقبال تحریک علی گڑھ کے حوالے سے سر سید احمد خان کے معتقد تھے۔ علی گڑھ تحریک اور سر سید کی اہمیت کے متعلق اقبال کو میر حسن کی وساطت سے احساس ہو چکا تھا۔ اسی وساطت سے اقبال کی ملاقات سر سید کے پوتے راس مسعود سے ہوئی جو بعد ازاں گہرے دوست بن گئے اور ایک دوسرے سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ جب اقبال ۱۸۹۸ء میں تعطیلات گزارنے سیالکوٹ گئے ہوئے تھے کہ میر حسن کو سر سید کی وفات کا تار ملا تو وہ اس وقت اسکول میں جا رہے تھے۔ راستے میں اقبال سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اقبال کو سر سید کی وفات کی خبر سنائی اور فرمایا کہ سر سید کی مادہ تاریخ نکال دیں۔ اقبال نے سر سید کی وفات کا مادہ تاریخ نکالا۔ سکول سے واپسی پر اقبال کی میر حسن سے ملاقات ہوئی تو اقبال نے بتایا کہ میں نے مادہ تاریخ نکال لیا ہے تو میر حسن بے حد خوش ہوئے اور بتایا کہ میں نے بھی مادہ تاریخ نکالا ہے۔ [۵۱]

اقبال نے سر سید احمد خاں سے متاثر ہو کر بانگ درا میں ایک نظم ''سید کی لوح تربت'' میں اس کی نمایاں کارکردگی کو سراہتے ہوئے اعتراف کیا ہے:

پاک رکھ اپنی زبان، تلمیذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے

خرمن باطل جلا دے شعلہ آواز سے[۵۲]

یلدرم تحریک علی گڑھ کے پروردہ ہونے کے ساتھ ساتھ سر سید احمد خان کے بھی مرہونِ منت تھے۔ سر سید نے علی گڑھ میں ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ایک سکول قائم کیا۔ سر سید نے قوم سے اس ادارے کی فلاح و بہبود کے لیے دل کھول کر چندے کی اپیل کی۔ اس کار خیر میں مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، وقار الملک اور حاجی نواب اسمٰعیل خان نے جا بجا جا کر لوگوں سے چندے کی اپیل کی۔ سارے ہندوستان سے اس مدرسہ میں بغیر کسی امتیاز کے سنی وشیعہ، امیر وغریب، پنجابی اور پٹھان تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اقبال کی مانند یلدرم کو بھی سر سید کی وفات کا بڑا گہرا صدمہ اور دکھ ہوا جس سے انھیں علی گڑھ جیسے اقامتی ادارہ کو چلانے کی فکر لاحق ہوئی اور ۱۹۰۰ء میں ''مرزا پھویا'' کے نام سے اس مقصد کے لیے ایک نظم تحریر کی۔ بقول قرۃ العین حیدر:

> مرزا پھویا'' سجاد نے ۱۹۰۰ء میں لکھی۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ سر سید کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کی امداد کے لیے سر سید میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ محسن الملک نے ملک کا دورہ کیا اور بہت سے شہروں میں جلسے کر کے تقریریں کیں کہ قوم کا فرض ہے کہ اپنے کالج کی امداد کرے اور اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے۔ مرزا پھویا نازونعم میں پلے تھے۔ گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ محسن الملک کی سحر بیانی کا یہ اثر ہوا کہ باپ نے مرزا کو علی گڑھ بھیجنے کا تہیہ کر لیا۔[۵۳]

علاوہ ازیں یلدرم نے ایک مضمون سر سید احمد کی یاد میں ''سر سید کی قبر پر'' اولڈ بوائے بنارس مئی ۱۹۱۲ء میں شائع کیا جس میں انہوں نے سر سید سے اپنی عقیدت کا اظہار واضح طور پر کیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو ادب میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ رومانوی تحریک نے ایک نئی تحریک کو جنم دیتے ہوئے اردو نظم و نثر میں سر سید اور ان کے رفقا کار کی بڑھتی ہوئی مقصدیت کے خلاف ردِعمل کے طور پر نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ انیسویں صدی کے اختتام پر سر سید کی اصلاحی تحریک زوروں پر تھی جس کا مقصد نثر کو سجانے کی بجائے قوم کو جگانے کی کاوش تھی مگر رومانی تحریک نے باقاعدہ اصلاحی تحریک کی مخالفت نہ کی مگر مقاصد سے انحراف ضرور کیا۔ اس سلسلہ میں ابوالکلام کی انفرادیت، ٹیگور کی ماورائیت اور یلدرم و اقبال کی روایت شکنی ایک واضح مقام رکھتی ہے۔

اپریل ۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے ایک ادبی رسالہ مخزن جاری کیا جس کا مقصد مذہبی وسیاسی مباحث سے ہٹ کر اردو ادب کی خدمت کرنا تھا۔ اس رسالہ مخزن میں اقبال، خوشی

محمد ناظر، ظفر علی خاں کی نظمیں شائع ہوتیں۔ حسرت موہانی کی رومانی نظم ''بربط سلمیٰ'' کے علاوہ ''بہار کا آخری پھول اور دردِ وطن'' بھی شائع ہوئیں۔ مخزن میں رومانی تحریک کے زیر اثر اردو نثر میں سید سجاد حیدر یلدرم، علامہ نیاز فتح پوری، مہدی افادی، قاضی عبدالغفار، مولانا ابوالکلام آزاد اور سلطان حیدر جوش سرفہرست ہیں۔[۵۴]

مخزن کے اجرا سے آزاد نگاری کے ایک نئے رجحان اور نئے دور کا آغاز ہوا۔ مخزن کسی ایک تحریک کا نمایندہ یا کسی مخصوص دبستان خیال کا ترجمان نہیں تھا بلکہ اس کے صفحات ہر قسم کے علمی اور ادبی مضامین کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ نئے نئے ادیبوں اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ یوں ادب کی دنیا میں ایک نئے انقلاب سے دوچار ہوئی جس میں مخزن اور اس کے بانی سر عبدالقادر کا بہت بڑا کام ہے۔ اس سلسلہ میں صلاح الدین احمد ان الفاظ میں رقم طراز ہیں۔

شیخ عبدالقادر مرحوم اپنے عہد کے ادبی تقاضوں کے بہت بڑے نبض شناس تھے۔ انھوں نے جانے یہ بات کس طرح محسوس کر لی تھی کہ ادب پر افادیت بڑی بُری طرح سوار ہو چکی ہے اور وہ وقت آ گیا ہے کہ ادب کو اس کی پیوست اور تسلط بے جا سے رہائی دلائی جائے اور ان صحت مند عناصر کو متحرک کیا جائے جو اس کے جسم بے جان میں از سرنو ایک روح پھونک کر اسے اس کا قدرتی اور فطری حق دلائیں۔ خوش قسمتی سے ان کا تجربہ بدرجۂ غایت کامیاب رہا اور مخزن کی تحریک اور اس کی صدائے عام نے ہماری زبان اور ادب کو جو انمول اور بے بہا جواہر عطا کیے ان میں اقبال کی نظم اور سجاد حیدر کی نثر ایک امتیاز خاص رکھتی ہے۔[۵۵]

اقبال کے ابتدائی مشق سخن کا دور ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۹ء تک لاہور کی مختلف انجمنوں میں رہا اور ان کی شناسائی ایک مخصوص باذوق طبقہ سے ہوگئی اور وہ انجمن کے مشاعروں کے رکن کی حیثیت سے شریک ہو کر اپنی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ انھی مشاعروں میں اقبال کی ملاقات مدیر مخزن شیخ عبدالقادر سے ہوئی۔ جن کے متعلق شیخ عبدالقادر ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انھیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھا اور اس بزم میں ان کو ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے اور انھوں نے کہہ سن کر ایک غزل بھی پڑھوائی۔ اُس وقت تک لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔ اتنے میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی......شیخ محمد اقبال نے اس کے ایک جلسہ میں اپنی وہ نظم جس میں ''کوہ ہمالہ'' سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی......تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ادب ترقی کے لیے رسالہ مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اثناء میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات ہو چکی تھی......میں نے کہا

''ہمالہ'' والی نظم دے دیجئے......انھوں نے اس نظم کو دینے میں پس و پیش کی......میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا شائع کر دی۔ یہاں سے گویا اقبال کی اُردو شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا۔[۵۶]

اقبال نے مخزن کے لیے باقاعدہ اپنی منظوم اور ہلکے پھلکے مضامین بھی اردو میں تحریر کرنے شروع کر دیئے۔ اردو مضامین جن میں ''بچوں کی تعلیم و تربیت ۱۹۰۲ء''، ''زبان اردو'' مخزن ستمبر ۱۹۰۲ء، ''اردو زبان پنجاب میں'' مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء اور ''قومی زندگی'' مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوتے رہے۔ اس طرح اقبال کی منظوم اور اردو مضامین مخزن کی گاہے بگاہے زینت بنتے رہے اور اقبال کو بھی شہرت دوام نصیب ہوتی رہی۔

یلدرم بھی اقبال کی مانند شیخ عبدالقادر کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے گو شیخ عبدالقادر نے ابھی اپنا ادبی رسالہ جاری نہیں کیا تھا اور یلدرم ابھی علی گڑھ میں بی۔اے کر رہے تھے اس دور سے شیخ عبدالقادر، یلدرم کے ساتھ اپنی دوستی کا تذکرہ بیان کرتے ہیں:

میرے دوست سید سجاد حیدر جن کا غلغلہ بعد میں یلدرم کے نام سے ادبی دنیا میں بلند ہوا، ابھی یلدرم نہیں بنے تھے اور نہ میں مدیر مخزن تھا۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی میں کالج سے نکل کر انگریزی اخبار اوبزرور کا اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا اور وہ علی گڑھ میں بی۔اے کر رہے تھے اور اپنے اوقات فرصت میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب کے سیکریٹری کا کام کرتے تھے۔ ایک دن میں علی گڑھ میں حاجی صاحب سے ملنے گیا تو سجاد حیدر ایک بات کر کے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے آیئے میں آپ کو ایک دلچسپ چیز دکھاؤں۔ آپ شبلی غمزدہ کو مشق سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں......سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے جس کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا۔ مولانا شبلی دروازے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے ہم دروازے کے آئینوں میں سے جھانک کر انھیں دیکھ سکتے تھے۔ اُن کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا اور کبھی قلم کا ایک سرا منہ کے قریب ہوتا تھا جیسے فکر سخن میں ہیں۔ معلوم نہیں ہم دونوں کا مولانا کو اس طرح دزدیدہ دیکھنا کہاں تک مناسب اور جائز تھا مگر مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا کہ ہم نے یہ حرکت کی۔ مجھے تو انھیں مصروف سخن دیکھنا ایسا دلچسپ معلوم ہوا کہ مدتوں نہیں بھولا اور سجاد حیدر کا یہ جذبہ مجھے مدتوں بھایا کہ مولانا کو فکرِ سخن کرتے دیکھنے میں انھیں جو لطف آیا اُس میں انھوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔[۵۷]

یلدرم اگرچہ اپنے ادبی کیریئر کا آغاز معارف سے کر چکے تھے اور اُس میں اُن کے کئی

افسانے شائع ہو چکے تھے مگر جب شیخ عبدالقادر نے مخزن کا اجرا کیا تو یلدرم نے انھیں بھی اپنے تراجم شدہ افسانے پیش کیے اور یلدرم نے شیخ عبدالقادر کے ساتھ اپنی دوستی میں مزید اضافہ کیا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر بیان کرتی ہیں:

> شیخ عبدالقادر نے ۱۹۰۱ء میں لاہور سے مخزن کا اجرا کیا۔ اسی سال جولائی کے شمارے میں سجاد حیدر کا دوسرا ترجمہ ''فطرت جواں مردی'' چھپا جو مفاخر بے کا افسانہ تھا۔ ۱۹۰۲ء تک تین ناولٹ ''ثالث بالخیر''، ''مطلوب حسیناں'' اور ''زہرا'' ترکی سے ترجمہ کر کے شائع کیے۔[۵۸]

اقبال نے جب اپنی شاعری کا باقاعدہ آغاز مخزن میں کیا تو اہل زبان نے اقبال کی شاعری اور زبان پر ہر چند کافی اعتراضات کیے۔ یہ اعتراضات نہ صرف اقبال پر تھے بلکہ اہل پنجاب کی اردو زبان پر تھے۔ اس سلسلہ میں اقبال کے دو مضامین (اول الذکر ترجمہ) جن میں ''اردو زبان'' اور ''اردو زبان پنجاب میں'' یکے بعد دیگرے مخزن میں ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئے۔ جن میں اقبال نے اس مضمون ''اردو زبان پنجاب میں'' میں اہلِ زبان کی تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

> اس میں بعض محاوراتِ زبان کے متعلق اساتذہ کے کلام سے استناد کر کے بتایا گیا ہے کہ ان کا کس کس طرح جائز استعمال ہے اور اُن کے استعمال پر جو اعتراضات ہوئے تھے ان اعتراضات سے بریت کی کوشش کی گئی ہے۔[۵۹]

اقبال کے اس مضمون کے متعلق قرۃ العین حیدر بتاتی ہیں کہ یلدرم نے اس دور میں انجمن اردو معلیٰ کی بنیاد ڈالی۔ اسی انجمن کی ترقی کے لیے مولانا حسرت سے اور بہتر کون شخص ہوسکتا تھا۔ اس انجمن کے زیر اثر محفل مشاعرہ بھی ہوتے تھے اور متروک الفاظ کے متعلق سلسلہ مضامین جو ایک مدت سے مخزن میں شائع ہوتے تھے۔ زیر بحث لانے سے اپنی جدت اور انداز تحریر کے سبب ہر خاص و عام کے لیے مقبول عام ہوا۔ بعدازاں اسی انجمن کے تحت رسالہ اُردو معلی جاری ہوا۔ جس سے مولانا حسرت موہانی اقبال کے اس مضمون ''اردو زبان پنجاب میں'' بے حد خوش ہوئے اور اسے اس رسالہ کی بھی زینت بنایا۔ بقول قرۃ العین حیدر:

> رسالہ اُردوئے معلی جاری ہوا۔ دنیائے ادب نے حیرت اور استعجاب سے دیکھا کہ ایک کم عمر نوجوان نے جو ابھی کل مکتب سے نکلا تھا صحائف اُردو کے لیے کیسے نئے نئے راستے کھول دیئے ہیں اپنے ذاتی رسالے کے ذریعہ جدید شاعری اور اس کے قدردانوں کو لے ڈالنا کون مشکل تھا۔

اکثر لحاظ سے پنجاب اس مفروضہ نیچرل شاعری کا مرکز تھا مولانا حالی مدظلہ العالی کا وطن ایک حیثیت سے پنجاب ہی تھا۔ چودھری خوشی محمد وہیں کے پہاڑوں سے قدیم شاعری پر پتھر برسایا کرتے تھے چٹائی جھاڑ ڈوپی اور لنگوٹی پر وہیں کے اخباروں پر طبع آزمائیاں ہوتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نیا ستارہ ''اقبال'' کی صورت میں طلوع ہوا تھا جس کی روشنی میں تسخیر کا عمل تھا۔ علی گڑھ منتھلی میں ایک مضمون ''اُردو زبان پنجاب میں'' کا چھپنا مولانا کے لیے بہانہ ہوگیا۔ مہینوں تک کوئی پرچہ نہ نکلتا تھا۔ جس میں فسانہ آزاد کے خوجی کی طرح حسرت اور ان کے تابعین کی سروہی اور کٹار مولانا حالی اور اقبال پر تیر چلا کی۔ ان شیرانِ میدانِ سخن پر تو خیر کیا اثر کرسکتی تھی تاہم جھوٹے مقعلدوں کے سراسیمہ اور حواس باختہ کرنے کو یہی کافی بلکہ اس سے بڑھ کر تھے۔[۶۰]

اقبال کی شاعری اور زبان و بیان کی خامیوں پر اعتراضات کا جواب دینے کے لیے یلدرم نے ۱۹۰۳ء میں مخزن کے ایک شمارے میں اقبال پر ایک مضمون ''ایک نیا ستارہ۔ اقبال'' تحریر کیا جس میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کو پہلی بار تہہ دل سے تسلیم کیا گیا۔ یلدرم اقبال کے متعلق اس مضمون میں ان الفاظ میں پذیرائی کرتے ہیں۔

ہمیں خوشی اور کشادہ دلی سے ماننا چاہیے کہ اُردو کو ایک نیا شاعر ملا ہے جس کی آواز ہر روز، لطیف تر، جس کا ہر نغمہ ہر آن شیریں تر اور جس کا تخیل ہر لحہ بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ تنگ دلی، یہ بچوں کا سا رشک، یہ اک شخص کی خداداد قابلیت کے اعتراف سے ابا کیوں ہے؟ اگر اک عندلیب خوش نوا، دفعتہً اور بغتتہً، کسی شاخِ گل پر بیٹھ کر ایسی جاں آویز اور دلگداز نغمہ سنجی شروع کر دیتی ہے جو اور عنادل میں نہیں اور ہم صفیرانِ چمن اس نغمے کو سنتے ہیں اور اس نئے ہم صفیر کا دلی مسرت سے خیر مقدم کرتے ہیں مگر ہمارے باغبان سخن نو آموز عنادل کسی نوعمر عندلیب کا ایسا نغمہ جوان کے نغمے سے بدرجہا بالاتر ہو بغیر رشک کے نہیں سن سکتے! تعجب ہے اور افسوس![۶۱]

یلدرم پہلے اقبال شناس ہیں جنھوں نے اقبال کے کلام پر تنقید کی ہے اور اقبال کی شاعرانہ عظمت کو منظر عام پر لائے ہیں اور دیگر تنقید نگار جن میں مولانا اسلم جیراج پوری، عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا محمد علی اور مولوی عبدالرزاق وغیرہ کے مضامین یلدرم کے مضمون کے بعد میں تحریر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اصغر عباس یلدرم کی اقبال شناسی کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں:

اقبال کی شاعری کے اولین زمانے میں اہل زبان ان کے کلام میں زبان کی خامیوں پر نکتہ چینی کرتے اور محاورے کی غلطیوں کو اچھال کر خوش ہوتے۔ اس وقت غالباً سب سے پہلے سجاد حیدر کی قدر شناس نگاہوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بے نقاب کیا۔ جہاں تک میرے علم میں

ہے ۱۹۰۳ء کی مندرجہ بالا تحریر کی اشاعت سے اقبال کی شاعری کے افکار و علائم پر غور و خوض کا آغاز ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی، عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی عبدالرزاق، مولانا اسلم جیراج پوری وغیرہ (جو سب کے سب علی گڑھ کے ہیں) کے مضامین اس کے بعد کے ہیں۔[۶۲]

میرے خیال میں اقبال اور یلدرم کی ادبی دوستی کا آغاز مخزن کے مرہونِ منت ہے۔ بالفاظِ دیگر ان کی دوستی شیخ عبدالقادر کے ادبی رسالے میں ادبی مضامین کے سبب ہوئی۔ اگرچہ اس دوستی کی ابتدا یلدرم کی اقبال شناسی کی طرف پہلا قدم ہے۔ مخزن میں ان ادبا کے علاوہ دیگر مصنّفین اور شعراء بھی لکھتے تھے جب کہ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء میں اقبال یورپ کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ اسی دور میں قرۃ العین حیدر کی ہونے والی والدہ مس نذر الباقر بھی شامل تھیں۔ قرۃ العین حیدر ان شعرا اور ادبا کے متعلق تفصیلاً ان الفاظ میں ذکر کرتی ہے۔ جن کی تحریریں مخزن میں شائع ہوتی تھیں اور جن کے سبب مخزن کی شہرت عروج پر پہنچی تھی۔

باہمت پنجابی کسان اور کاروباری امریکہ اور کینیڈا تک میں جا بسا تھا۔ مخزن میں ایک مضمون کسی سید حاکم شاہ کا جزائر کنیری سے آیا۔ محض ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں شیخ محمد اقبال اور سید علی بلگرامی کیمبرج، محمد علی اوکسفورڈ، مشرف الحق اڈنبرا مدیر رسالہ لندن، لالہ لاجپت رائے روم اور یلدرم بغداد سے اپنی تخلیقات وطن بھیج کر مخزن میں چھپوا رہے تھے۔ ہندوستان میں اس رسالے کے مضمون نگار داغ، خواجہ حسن نظامی، شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، سرور جہاں آبادی، طالب بنارسی، وحشت کلکتوی، ناظر کاکوروی، گوہر رامپوری، اکبرالہ آبادی، عزیز لکھنوی، میر غلام بھیک نیرنگ، احسن لکھنوی، لالہ سری رام، مرزا محمد سعید، محمد اکرام، راشد الخیری، ڈپٹی لال نگم، آغا شاعر قزلباش، آغا حشر کاشمیری وغیرہ اور ایک پردہ نشین نوعمر خاتون مس نذر الباقر۔[۶۳]

قرۃ العین حیدر کی والدہ مس نذر الباقر یا نذر الزہراء (ابھی سجاد اور نذر کی شادی نہیں ہوئی تھی) ۱۸۹۲ء میں اقبال کے ہم مکتب میر نذر الباقر کے ہاں سیالکوٹ میں پیدا ہوئی۔ انھیں اور ان کی چھوٹی بہن کو ان کے والد نے پردے میں گورنسوں سے تعلیم دلوائی تھی۔ نذر الباقر کی صاحبزادی نذر الزہرا بیگم مس نذر الباقر کے نام سے لڑکپن ہی سے بہت نامور مضمون نگار بن چکی تھیں۔ شمس العلما مولوی ممتاز علی نے زنانہ ہفتہ وار اخبار تہذیب نسواں یکم جولائی ۱۸۹۸ء میں جاری کیا۔ اس کی ادارت سید امتیاز علی تاج کی والدہ محمدی بیگم (زوجہ مولوی ممتاز علی) نے سنبھالی۔ اس میں نذر الزہرا ''بنت نذر الباقر'' یا ''مس نذر الباقر'' کے نام سے مضامین تحریر کرتی تھی۔

تحریک علی گڑھ سے منسلک، سر سید کے پسندیدہ اور منظور نظر طالب علم، اور سجاد حیدر یلدرم کے

چند سال سینئر، شیخ عبداللہ نے تحریک تعلیمِ نسواں کی خاطر ایک رسالہ جاری کرنے کا ارادہ کیا تو احتشام الحق، انعام الحق، سید ابو محمد اور سید سجاد حیدر یلدرم نے ان سے اتفاق رائے دی۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال کے خاندان کی خاص طور پر شکر گزار نظر آتی ہیں جنھوں نے علی گڑھ میں پہلی زنانہ کانفرنس منعقد کر کے تعلیمِ نسواں کے لیے راہ ہموار کی اور جس بنا پر اس ادبی رسالہ میں ان کی والدہ محترمہ مس نذر الباقر نے بڑھ چڑھ مضامین تحریر کیے۔

علامہ اقبال کے کشمیری پنڈت اجداد تو صدیوں قبل مسلمان ہوئے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ خود ایک کشمیری برہمن نوجوان تھے جو بعد قبول اسلام علی گڑھ پڑھنے آ گئے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۴ء میں ایک زنانہ رسالہ جاری کیا جس کا نام اُن کے خیال میں شاید سجاد حیدر یا ابو محمد صاحب نے خاتون رکھا...... اسی سال علی گڑھ میں پہلی زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کے بانی شیخ عبداللہ تھے...... مس نذر الباقر نے شیخ عبداللہ کے رسالے (فروری ۱۹۰۵ء) میں لکھا...... اب تو ہمارے لیے جو کچھ ہوگا علی گڑھ ہی سے ہوگا۔[۶۴]

جب مولوی سید ممتاز علی نے ۱۹۰۹ء میں بچوں کا ہفتہ وار اخبار پھول جاری کیا تو اس کی اشاعت لاہور سے ہوئی تھی اور اس کی اعزازی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ اسی دور میں مس نذر الباقر نے بچوں کے لیے باتصویر کتب سلیم کی کہانی ، پھولوں کا ہار ، دکھ بھری کہانی ، سچی رضیہ اور اس کی بکری تحریر کیں جسے بعد میں پنجاب بک بورڈ نے اردو نصاب میں سکول کے لیے شامل کیا۔

۱۹۱۰ء میں نذر الزہرا کا پہلا ناول اختر النساء بیگم کی اشاعت سے مس نذر الباقر کا ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور اس دور کے نقادوں اور ادیبوں میں اس کی شمولیت ہوگئی۔ جن میں علامہ اقبال، سجاد حیدر یلدرم، شیخ عبدالقادر اور علامہ راشد الخیری کا شمار ہوتا تھا۔ بقول قرۃ العین حیدر:

مصنفہ کا پہلا اور مقبول ترین ناول اختر النساء بیگم دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا۔ آہِ مظلوماں بھی شاید اسی سال چھپا۔ اس وقت اردو کے اکابر علامہ راشد الخیری، ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، سجاد حیدر یلدرم اور بنتِ نذر الباقر سمجھے جا رہے تھے۔[۶۵]

اب نذر الباقر کا نام ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں کے مضامین کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان لڑکیاں شاذونادر ہی پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ یلدرم کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ خاندان بھر میں وہ نہایت روشن دماغ، آزاد خیال اور حامیِ تعلیم و حریت نسواں تھے اور بیوی بھی ہم خیال چاہتے تھے۔ احباب (احباب اسی دور کے ادیب علامہ راشد الخیری، علامہ محمد اقبال، شیخ عبدالقادر

اور مولوی ممتاز وغیرہ تھے) نے یلدرم کو بنت نذر الباقر کا نام پیش کیا جو انھوں نے احباب کے کہنے پر یہ مشورہ قبول کر لیا اور شمس العلما مولوی ممتاز علی صاحب کے ذریعے سے اس رشتہ کا پیغام بھجوایا۔ یلدرم کا گھرانہ سُنی اور نذر الزہرہ کا خاندان شیعہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مگر یہ دونوں گھرانے فضول تعصب اور تنگ نظری کے برخلاف تھے۔ یہ مسئلہ ان کی شادی میں قطعاً رکاوٹ نہ بن سکا۔ مگر بعض اور رکاوٹیں حائل ہوئیں۔ یلدرم نذر الزہرہ کی ایک جھلک شادی سے قبل دیکھنے کے لیے بے تاب تھے یا فوٹو دیکھنے کی زبردست خواہش رکھتے تھے۔ یلدرم کے اصرار پر مولوی ممتاز علی نے میر نذر الباقر کو ایک مراسلہ تحریر کیا کہ صاحبزادے تصویر دیکھنے کے متمنی ہیں جسے پڑھ کر نذر الباقر بھڑک اُٹھے۔ یلدرم کو کہیں سے یہ خبر ملی کہ نذر الزہرہ کی آنکھیں خراب ہیں اور وہ کچھ عرصہ بعد اندھی ہو جائیں گی تو یلدرم نے مولوی ممتاز علی سے اس کی تحقیق چاہی اور اپنے بھائی ڈاکٹر کی خدمات پیش کیں جو آنکھوں کے سپیشلسٹ تھے۔ نذر الزہرہ کی آنکھوں کے متعلق میر نذر الباقر نے رفاہِ عام پریس لاہور کے حوالے سے مولوی ممتاز علی کو ۱۸ ر ستمبر ۱۹۰۲ء کو ایک مراسلہ تحریر کیا۔

> میں اپنی لڑکی کو لے کر سیالکوٹ پہنچا۔ ہمشیرہ کو بلوایا اور ہر روز کئی پہروں تک دیکھا اور اس میں کوئی بات وہم وشبہے کی نہ رہنے دی۔ میری ہمشیرہ معظّمہ بھی عزیزہ کو دیکھ کر بار بار اپنی حیرت ظاہر کرتی تھیں کہ ہیں ان آنکھوں پر کوئی اعتراض کرتا تھا۔[٦٦]

اسی عرصہ میں ایک عجیب اتفاق ہوا کہ یلدرم نے ''آہ یہ نظریں'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا جو مخزن میں شائع ہوا۔ بنت نذر الباقر نے بھی ''آہ وہ نظریں'' کے عنوان سے ایک مضمون مخزن میں تحریر کیا جس پر حلقہ احباب نے خوب مذاق اُڑایا۔ مولوی ممتاز علی نے محسوس کیا کہ یہ رشتہ ناکام ہو رہا ہے اور شادی نہیں ہوگی اور اس طرح میری جگ ہنسائی بھی ہوگی حالانکہ اس منگنی پر علامہ اقبال، عبدالقادر، ایڈیٹر پیسہ اخبار، محبوب عالم کے اہل خانہ نے نذر الزہرہ کو مبارک بادیں پہنچائیں تھیں۔ جس سے اقبال اور نذر الزہرہ کے گھرانے کے تعلقات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جس کا اظہار مولوی ممتاز علی کے مورخہ ۲۴ ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کے مراسلہ کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے یلدرم کو مستقل مزاج رہنے کی تلقین کی ہے۔

> اس اثنا میں لوگوں نے یہ بھی مشہور کر دیا ہے آپ کی اس سے نسبت طے ہو چکی ہے۔ عزیزہ کے پاس مسز اقبال، مسز عبدالقادر، مس محبوب عالم وغیرہ کی طرف سے مبارک بادیں پہنچی ہیں اور یہ چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ ان غلط فہمیوں کی بناء پر یہ نسبت ٹوٹ گئی تو میں میر صاحب کو عمر بھر منہ نہ دکھا سکوں گا اور وہ میری ذلت ورسوائی ہوگی کہ خدا کسی کو نہ دے۔ میں اپنی

پریشانی کی کوئی انتہا نہیں پاتا ہوں۔ اگر ضرورت ہو تو میں خود آپ کے پاس آؤں۔[۶۷]

ان تمام غلط فہمیوں اور رکاوٹوں کے باوجود رشتہ نسبت، رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گیا۔ نذرالزہرہ نے ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس علی گڑھ میں شرکت کی جہاں مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور نظم ''چپ کی داد'' پڑھی جس میں انھوں نے خواتین کے حقوق و فرائض کے ساتھ ساتھ خواتین کی اہمیت پر اظہارِ خیال کیا اسی تحریک پر چند خواتین اور نذرالزہرہ نے زنانہ کانفرنس قائم کرنے کی تحریک چلائی۔ اور ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس قائم کی جس کی صدر بیگم بھوپال اور سیکریٹری بیگم حبیب اللہ خان شیروانی تھیں۔

کانفرنسوں کی شراکت سے مس نذرالباقر میں سماجی کارکن کے جذبات نمایاں ہوئے اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد دکن میں سیلاب کی طغیانی آئی جس سے بے حد نقصان ہوا اور قیامت صغریٰ کا منظر پیش ہوا۔ اس مشکلات سے نپٹنے کے لیے خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سرسید میموریل فنڈ اور مسلم یونیورسٹی فنڈ قائم کیے جن میں مس نذرالباقر نے فلاحی کردار ادا کرتے ہوئے ملک کی نامور سماجی خواتین کارکنوں کے ہمراہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں اظہار کرتی ہیں:

۱۹۰۸ء میں حیدرآباد دکن کی موسیٰ ندی میں قیامت خیز طغیانی ہوئی۔ بیگم صغریٰ ہمایوں مرزا، سروجنی نائیڈو، لیڈی اکبر حیدری اور نواب عماد الملک کی بہو مسز طیبہ خدیو جنگ کے حیدرآباد میں ریلیف کا کام شروع کیا۔ سارے ہندوستان میں چندہ جمع کیا گیا۔ پنجاب و سرحد کے لیے مس نذرالباقر منتخب ہوئیں۔ جو سرسید میموریل فنڈ اور مسلم یونیورسٹی فنڈ کے لیے صوبہ جات پنجاب و سرحد کی پروونشل سیکریٹری بھی تھیں۔[۶۸]

رفاہی کاموں میں یہ جذبے فقط نذرالزہرہ کے حصے میں نہ آئے تھے بلکہ علامہ اقبال کے ہاں زیادہ شدت سے موجود ہیں۔ جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو ان دونوں ادیبوں نے مسلمانانِ ہند سے چندے کی اپیل کی اور اسلامیان مشرق اور شمالی افریقہ کے زخمیوں کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا تاکہ زخمیوں کے لیے مرہم پٹی اور ادویات خرید کر تر کی روانہ کی جا سکیں۔ طرابلس کے متاثرین کے لیے اقبال اور بنت نذرالباقر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر یوں اظہار کرتی ہے:

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا اسلامیانِ ہند جن کا سوز و ساز اسلامیان شرق اوسط و شمالی افریقہ کے سوز و ساز سے از حد وابستہ تھا۔ حسبِ معمول غم و غصے سے بے تاب ہوئے۔ طرابلس کے

زخمیوں کے لیے چندے جمع کیے گئے ۔اقبال نے شاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کے مجمع کے سامنے

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

والی نظم پڑھی، تہلکہ مچ گیا۔ سامعین خون کے آنسو روئے۔ اس نظم کا ایک ایک شعر اسی وقت ''نیلام'' کر کے روپیہ طرابلس فنڈ میں بھیجا گیا۔ سال بھر بعد جنگ بلقان چھڑ گئی۔ بنتِ نذرالباقر اور دوسری جدید خواتین نے طرابلس اور بلقان کے لیے خوب خوب چندے جمع کیے۔ مرہم پٹی کا سامان اکٹھا کر کے ترکی بھیجا۔ بہت جوش و خروش اور ہنگامہ رہا۔ [۶۹]

دسمبر ۱۹۱۱ء کو اقبال کی ملی وقومی شاعری کو مدِنظر رکھتے ہوئے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے اقبال کو کانفرنس کی صدارت کے لیے دہلی میں مدعو کیا تا کہ انھیں خراج عقیدت و تحسین پیش کیا جا سکے۔ اس کانفرنس میں ملک کے نامور علما اور ادبا میں سید سجاد حیدر یلدرم، مولانا شاہ سلیمان پھلواری، مولانا شبلی نعمانی، خواجہ کمال الدین، سر آغا خان، سید حسن بلگرامی کے علاوہ نمائندگانِ حکومت و فرمارِوایانِ ریاست ہند اور دیگر مسلم برگزیدہٗ ہستیاں شامل تھیں۔ اس کانفرنس کی تیسری نشت کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ جس میں انھوں نے پین اسلام ازم پر روشنی ڈالی۔

میری نظموں کے متعلق بعض ناخداترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو پین اسلام ازم کی تحریک پھیلانے والا بتایا جاتا ہے۔ مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے۔ [۷۰]

اس موقع پر سجاد حیدر یلدرم کی ایما پر شبلی نے اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا۔ میرے خیال میں اقبال اور یلدرم کی پہلی ملاقات کا باقاعدہ ثبوت اسی کانفرنس میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس کانفرنس میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کے متعلق سید عبدالواحد معینی ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں:

۱۹۱۱ء کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں سجاد حیدر صاحب کی تحریک پر مولانا شبلی نے علامہ اقبال مرحوم کو پھول پہنائے اور تقریر بھی کی۔ [۷۱]

مولانا شبلی نعمانی نے اس کانفرنس میں اقبال کے لیے تعریفی جملے نہایت خوشگوار ماحول میں کہے۔ جس میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اعتراف کیا گیا ہے اور اُن کی شاعری کے معیار کو پرکھا گیا ہے۔

یہ رسم کوئی معمولی نہیں ہے اور اس کو محض تفریح نہ تصور کرنا چاہیے...... جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لیے بڑی بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت

میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا کلام علم و ادب اور ان کی شاعری کا معیار غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوسکتا۔[۲]

اقبال اور یلدرم کی دوستی اور مراسم میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور اقبال کبھی لکھنؤ کی جانب خواہ کسی اور کام سے جاتے یلدرم ہی کے پاس ٹھہرتے۔ بعینہٖ اگر یلدرم کبھی لاہور آتے تو اقبال انھیں اپنے ہاں لازمی مدعو کرتے اور ان کے ادبی تعلقات دوستانہ ماحول میں تبدیل ہو گئے اور ان دونوں گھرانوں میں خوشی و غمی کے مواقع پر شرکت کرنا ان کے لیے لازم و ملزوم ہو گیا۔

۳۱/ مارچ ۱۹۱۸ء سے قبل نذر الزہرہ کا بھانجا میاں مصطفیٰ باقر آٹھویں جماعت میں سجاد حیدر کے ہاں لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا۔ ہیضہ کی وباء میں لقمۂ اجل بن گیا۔ ان کا آٹھویں جماعت کا نتیجہ بھی ان کی وفات کے بعد نکلا۔ اسی وبا میں یلدرم کے بھانجے عثمان حیدر بھی مبتلا ہو گئے۔ جس کے لیے یلدرم اور اُن کی اہلیہ نذر سجاد نے مقامی حکیم عبدالوالی سے دوائی لائے اور عثمان حیدر کو کھلاتے رہے۔ علامہ اقبال مصطفیٰ باقر کی تعزیت کے لیے خاص طور پر لکھنؤ تشریف لائے۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

> اسی ہفتے علامہ اقبالؒ مصطفیٰ باقر کی تعزیت کے لیے لاہور سے تشریف لائے۔ رات کو اس ہوادار برآمدے میں ان کا پلنگ بچھتا۔ جہاں عثمان حیدر سوتے تھے۔ دن میں دو چار بار علامہ اُن کی مزاج پُرسی کرتے۔[۳]

اقبال کو لکھنؤ میں ٹھہرے کافی روز ہو چکے تھے۔ ان کے اعزاز میں راجہ محمود آباد نے زبردست دعوت کی۔ جس کی شرکت کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں تذکرہ کرتی ہیں:

> ڈاکٹر اقبال لکھنؤ آئے دو تین روز ہوئے تھے کہ علی محمد خاں راجہ محمود آباد نے اُن کی زبردست دعوت کی۔ وہاں خوب ڈٹ کر شاعر مشرق نے لکھنؤ کا مرغن نوابی ماحضر تناول فرمایا۔ رات کے گیارہ بجے ہلٹن لین واپس آئے۔ کپڑے تبدیل کیے۔ برآمدے میں جا کر اپنے پلنگ پر سو رہے۔[۴]

لکھنؤ میں مصطفیٰ باقر اور عثمان حیدر کے ہیضہ کے سبب اقبال کو بھی وہم ہو گیا کہ مجھے بھی ہیضہ ہو گیا ہے۔ مگر قرۃ العین حیدر کے بقول انھوں نے زائد کھانا کھایا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بے حد پریشان ہوئے اور رات کو قریب سوئے ہوئے عثمان حیدر سے مخاطب ہو کر سجاد حیدر یلدرم کو بلانے کے لیے بھیجا۔ یلدرم اُسی وقت آئے اور اقبال کے لیے بدہضمی کی دوائی لائے۔ اس واقعہ کے متعلق قرۃ العین حیدر یوں ذکر کرتی ہیں:

> عثمان حیدر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ادب سے سلام کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب خیریت؟'' بھرائی ہوئی آواز

میں جواب دیا۔ ''مجھے بھی کالرا ہو گیا۔ جا کر سجاد کو جگا دو۔ عثمان حیدر نے تیر کی طرح جا کر دوسرے برآمدے میں ماموں جان کو جگایا۔ اس وقت ڈاکٹر اقبال نیم جاں سے اپنے پلنگ پر لیٹ چکے تھے۔ ماموں نے فوراً آ کر منفرد روزگار مہمان کی یہ حالت دیکھی۔ حواسِ باختہ، سرپٹ پیدل پھاٹک کی طرف بھاگے۔ لکھنؤ کا انگریز سول سرجن کرنل برڈ ووڈ نزدیک ہی ایبٹ روڈ پر رہتا تھا اس کو جا کر جگایا۔ کرنل بھاگم بھاگ ہلٹن لین پہنچا انجکشن لگایا۔ مریض کی تسلی تشفی کی۔ [۵]

لکھنؤ میں اقبال کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ یلدرم کے گھر لوگوں کے ہجوم کا تانتا بندھ گیا اور جوق در جوق اقبال سے ملنے آئے اور محوِ گفتگو رہے۔ ملاقاتیوں میں راجہ صاحب محمود آباد، جسٹس سمیع اللہ بیگ، مشیر حسین قدوائی، سید وزیر حسن صبح و شام آتے جاتے رہتے تھے اور اقبال کی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر کرنل برڈ ووڈ ر اور حکیم عبدالوالی آتے تھے۔ راجہ صاحب نے نہایت عقیدت و احترام سے اقبال کو لاہور کے لیے ریل گاڑی میں روانہ کیا۔ جبکہ یلدرم اقبال کے ہمراہ لاہور تک ان کے ساتھ آئے۔ جس کے بارے میں قرۃ العین حیدر یوں بیان کرتی ہیں:

پانچویں دن راجہ محمود نے فرسٹ کلاس کا درجہ ریزرو کروا کے دو ملازموں کے ساتھ علامہ اقبال کو روانہ کیا۔ بیشتر اہلِ لکھنؤ اقبال کے زیادہ معتقد نہ تھے لیکن اُن کی روانگی کے وقت کئی سو پرستاروں کا ہجوم اسٹیشن پر موجود تھا۔ یلدرم لاہور تک ان کے ہمراہ گئے۔ [۶]

۱۹۲۲ء میں سجاد حیدر یلدرم کے اہل خانہ بھی لاہور میں ایک دفعہ آئے تو اقبال نے انھیں اپنے انارکلی والے مکان پر مدعو کیا مگر اقبال اور اکبرالہ آبادی خواتین کے پردے کے سخت قائل تھے مگر نذر الزہرہ نے پردہ ترک کر کے سودیشی اور کھادی تحریک میں حصہ لیا نذر سجاد چند سال سے کھادی ساڑھیاں پہن رہی تھیں۔ قرۃ العین حیدر اقبال کی اس دعوت کا ذکر کرتے ہوئے پردہ کی رسم ترک کرنے کے متعلق بھی بتاتی ہیں:

اس جگہ...... منن نے راستے میں ایک سمت اشارہ کیا...... علامہ اقبال رہا کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء تک۔ آپا حمّن بولیں...... بڑی اماں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ جب اقبال اپنے انارکلی والے مکان میں رہتے تھے۔ وہ علی گڑھ سے لاہور آئی ہوئی تھیں۔ اقبال نے ان کو اسی مکان میں کھانے پینے پر بلایا تھا۔ بڑی اماں نے اس زمانے میں پردہ ترک کر دیا تھا مگر علامہ مرحوم کے سامنے نہیں آئی تھیں کہ ان کو افسوس ہوگا۔ [۷]

اقبال نذر الزہرہ کو سیدزادی ہونے پر ان کا احترام کرتے تھے اور انھیں آقازادی کے لقب سے پکارتے تھے۔ مگر اقبال تو اقبال، اکبرالہ آبادی بھی ان کے پردہ ترک کرنے پر جی ہی جی میں

کڑھتے رہتے تھے کہ بچپن میں ان کے آباؤ اجداد پردے کی رسم کے سخت قائل تھے مگر آج کی نسل آزاد خیالی پر اُتر آئی ہے۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں تذکرہ کرتی ہیں:

اب علامہ اقبال کو لیجئے اور اسلامی کلچر کے متعلق ان کے نظریات۔ ''بڑی اماں میں کتنی ہمت تھی اپنے زمانے کے Giants کو مستقل Defy کرتی رہتی تھیں......'' اکبر الہ آبادی اور اقبال اماں کی آزاد خیالی سے نالاں تھے......اقبال اماں کو آقا زادی کہتے تھے یعنی رسولؐ اللہ کی اولاد۔ شاید اسی وجہ سے ناراض تھے کہ آلِ رسولؐ ہو کر بے پردہ ہو گئیں۔ جو تھا نہیں ہے۔ جو ہے نہ ہوگا۔ وقت اتنا بدل چکا ہے کہ اگر اس زمانے کے متعلق سوچیے تو عجیب لگتا ہے جب میر فیض العسکری، نذر الباقر اور ظہور الحسنین اور اقبال اکٹھے مدرسے جاتے تھے اور انعام اللہ ماموں کے چچا علامہ میر حسن سے پڑھتے تھے اور تین سالہ اماں اقبال کے والد شیخ نور محمد کا سیا ہوا سرخ ریشمی برقعہ اوڑھ کر اپنے دادا میر مظہر علی کی گود میں گھوڑے پر بیٹھی تھیں۔ [۸]

قرۃ العین حیدر اپنے خاندان کی خواتین اور بالخصوص نئی نسل کے پردہ کی رسم ترک کرنے کے متعلق بتاتی ہیں۔ جس سے ان کے آباؤ اجداد قبروں میں سخت تکلیف میں مبتلا تھے مگر علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی نے جب پردہ کی رسم پر عمل پیرا ہونے کے متعلق اشعار تحریر کیے تو قرۃ العین حیدر اس کے متعلق یہ اظہار کرتی ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد نے قبروں میں بھی خوشی کا اظہار کیا ہوگا کیونکہ قرۃ العین حیدر کے خاندان اور نئی نسل کی بے راہ روی اور پردہ ترک کرنے کے متعلق اقبال نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ جسے وہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ان الفاظ کے ساتھ وضاحت کرتی ہیں:

اس وقت میر احمد علی اور شریف النساءٔ بیگم اور سید جلال الدین حیدر اور سعیدہ بانو بیگم نے قبروں میں کروٹیں لی ہوں گی۔ اسی وجہ سے پردے کا حکم آیا ہے اور اکبر الہ آبادی اور اقبال نے شاید اس منظر کو پہلے سے دیکھ لیا ہو۔ یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین......میری صراحی سے قطرہ قطرہ۔ [۹]

اقبال اور یلدرم میں نہ صرف ملاقاتیں ہی رہیں بلکہ ان کے تعلقات خط و کتابت کی حد تک بڑھ گئے۔ ان خطوط کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب یلدرم ستمبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ ملنے پر پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ اور وہ آٹھ سال تک شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اعزازی صدر بھی رہے۔ یلدرم کے دورِ رجسٹرار میں جنوری ۱۹۲۳ء کو یونیورسٹی کے زیر اہتمام یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر ادبی رسالے علی گڑھ میگزین کا خاص نمبر شائع کرنے کے لیے سوچ بچار ہوئی تو ایڈیٹر میگزین خواجہ منظور حسین نے علامہ اقبال کو ایک تازہ تصویر مع تازہ کلام بھجوانے کی فرمائش کی اور ساتھ ہی یلدرم کا ذکر بھی کیا۔ بہر حال اس سلسلہ میں یلدرم نے اقبال کو

مراسلہ بھیجا یا نہیں مگر اقبال نے خواجہ منظور حسین کے اسی خط کے بقیہ خالی حصے پر جواب تحریر کرتے ہوئے اس خط کے پشت پر نظم تحریر کی۔ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں مگر خیال کیا جاتا ہے کہ دسمبر ۱۹۲۳ء کے پہلے دو ہفتوں میں اقبال نے یہ خط یلدرم کو لکھا تھا۔ اقبال نے یلدرم کو جو خط تحریر کیا وہ درج ذیل ہے:

''ڈیئر سجاد!

اس خط کے پچھلے صفحہ پر چند اشعار لکھتا ہوں۔[۸۰] ایڈیٹر صاحب کو دے دیجئے۔ اس وقت جلدی میں ہوں معاف کیجئے کہ علیحدہ کاغذ پر نہیں لکھ سکا۔ ایک شامی عرب بشیر کمال سے معلوم ہوا کہ محمد عاکف ایڈیٹر، سبیل الرشاد ، نے ترکوں کی شاعری کے بہت عمدہ نمونے جمع کیے ہیں۔ اس کتاب کا نام صفحات محمد عاکف ہے اس کا ترجمہ اردو میں ہونا چاہیے۔ محمد ثانی کے دیوان میں کوئی شعریت نہیں۔ والسلام مخلص

محمد اقبال

اقبال نے یلدرم کو ایک اور خط بھی تحریر کیا مگر شومئی قسمت سے اس پر بھی کوئی تاریخ وغیرہ درج نہیں کہ کب اقبال نے یلدرم کو یہ خط بھیجا۔ چنانچہ اس خط کے ارسال کرنے کا مقصد بھی علی گڑھ میگزین کے لیے اپنے کلام کے متعلق بتایا گیا ہے۔

ڈیئر سجاد!

جلیل احمد صاحب کا ان دل خوش کن الفاظ کے لیے جو انھوں نے میرے متعلق لکھتے ہیں میری طرف سے بہت بہت شکریہ ادا کیجئے۔ آخر کے تین شعر اگر پسند نہ ہوں یا علی گڑھ کی فضا کے لیے موزوں نہ ہوں تو کاٹ دیجئے۔ والسلام، محمد اقبال[۸۱]

اقبال کو یورپ سے واپسی پر فکر معاش کا مسئلہ درپیش آیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ۳۰ ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو بحیثیت ایڈووکیٹ انرولمنٹ کروائی جس بنا پر انھیں چیف کورٹ پنجاب میں پریکٹس کرنے کا اجازت نامہ مل گیا۔ وکالت پیشہ کے ساتھ ساتھ اقبال نے ۱۰ ر مئی ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ کالج میں عارضی طور پر فلسفہ پڑھانے کی پیش کش قبول کر لی۔ لیکن اقبال اپنی وکالت کی مصروفیات کے سبب گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ جس بنا پر انھیں کالج کی جانب سے ایک الوداعی پارٹی عنایت کی گئی مگر پھر بھی اقبال کا تعلق کسی نہ کسی طریقہ سے گورنمنٹ کالج سے رہا۔[۸۲]

چنانچہ اقبال محکمہ تعلیم بالخصوص پنجاب یونیورسٹی اور دیگر جامعات سے بھی منسلک رہے۔ اقبال کا یہ تعلق ۱۳ ر مئی ۱۸۹۹ء سے بحیثیت میکلوڈ عربیک ریڈر سے لے کر ۱۹۳۷ء تک رہا۔ علاوہ

ازیں اقبال نے پیپر سیٹرز کے طور پر مڈل، انٹرنس، ایف۔اے، بی۔اے، ایم۔اے، بی او ایل، ایم او ایل، ایف ای ایل، ایل ایل بی، ای ایس سی اور سول سروس کے امتحانات کے پرچے مرتب کیے اور بطور ممتحن پنجاب، الہ آباد، ناگ پور، علی گڑھ اور دہلی کی جامعات کے لیے بھی کام کیا۔ حتیٰ کہ بیت العلوم حیدر آباد کے لیے بھی تاریخ اسلام کے پرچہ مرتب کرتے رہے۔ بعض اوقات زبانی امتحان لینے کی غرض سے علی گڑھ، الہ آباد، ناگ پور اور لاہور کی جامعات میں شرکت کرتے تھے۔[۸۳]

اقبال ۲/مارچ ۱۹۱۰ء کو پنجاب یونیورسٹی کے فیلو مقرر کیے گئے۔ آہستہ آہستہ اقبال اورینٹل و آرٹس فیکلٹی کے رکن مقرر ہوئے بعد ازاں ممبر سینٹ اور ممبر سنڈیکیٹ بنائے گئے اور عربی، فارسی اور فلسفہ کے شعبوں سے متعلق کنونیر بورڈ آف سٹڈیز کی حیثیت سے بورڈ کے اجلاسوں میں شرکت کرتے اور بورڈ کا کام ان مضامین کا نصاب مرتب کرنا اور ماہرین کی خدمات حاصل کرنا، طلبہ کے مسائل حل کرنا اور اپنی سفارشات یونیورسٹی سنڈیکیٹ کو پیش کرنا تھا۔

اقبال ۱۹۱۹ء میں اورینٹل فیکلٹی کے ڈین مقرر کیے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں انھیں یونیورسٹی کی اکیڈیمک کونسل کے ممبر کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اسی سال پروفیسر شپ کمیٹی کے ممبر بھی بن گئے۔ جس کا مقصد یونیورسٹی کے لیکچراروں اور پروفیسروں کی تقرری کرنا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں اقبال مشاورتی انتظامیہ اور انتخابات کمیٹی کے رکن بھی بن گئے جن کا اولین مقصد کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز پیش کرنا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں حکیم احمد شجاع نے اقبال کے زیر نگرانی ان کے نظریات و رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے سلسلہ ادبیہ کے نام سے موسوم چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کلاسز کے لیے اردو نصاب کی تین کتب مرتب کیں جسے ۱۲/جنوری ۱۹۲۵ء کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے شامل نصاب کرنے کی منظوری دے دی۔ اقبال پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر بھی مقرر ہوئے اور میٹرک کی جماعت کے لیے ایک فارسی کتاب آئینہ عجم مرتب کی جسے ۱۹۲۷ء میں میسرز عطر چند کپور انارکلی بازار، لاہور نے شائع کیا۔[۸۴]

قرۃ العین حیدر اقبال کی اس تصنیف کی اشاعت کے متعلق وضاحت کرتی ہے کہ اقبال اور ناشر نے مجلس علوم مشرقیہ کے اراکین اور صدر عربی و فارسی کے اعزاز میں عصرانہ دیا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ کرتی ہے۔

مجلس علوم مشرقیہ ہند کے پانچویں اجلاس کی رپورٹ جس میں صدر شعبہ عربی و فارسی ڈاکٹر محمد اقبال اور لاہور کے مشہور کتب فروش گلاب سنگھ عطر چند کپور نے مہمانوں کو مقبرہ جہانگیر میں عصرانہ دیا۔[۸۵]

یلدرم کے افسانوں کا مجموعہ خیالستان جسے ۱۹۱۰ء میں مخزن بک ڈپو لاہور نے شائع

کیا۔اس کے متعلق جنوری ۱۹۱۱ء میں مخزن میں اشتہار ان الفاظ کے ساتھ تحریر کیا گیا تھا۔

چھپ کر تیار ہے، خیالستان سجاد حیدر کے مصنفہ قصے اور مضامین، سجاد حیدر کے اچھوتے مضامین، جس قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں محتاجِ بیان نہیں۔صرف مثال کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعض اوقات ایسی فرمائشیں آتی ہیں کہ مخزن کا ایک پرانا پرچہ جس میں صاحب موصوف کا فلاں مضمون چھپا تھا تلاش کر کے ایک روپے کی وی۔پی بھجوا دیجئے۔[۸۶]

خیالستان نے اپنی اشاعت کے بعد اردو ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کیا اور ایک مقبول ترین تصنیف کا روپ اختیار کر لیا۔بقول پطرس بخاری:

یہ مجموعہ اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اندر اردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی۔[۸۷]

اقبال نے خیالستان کی مقبولیت اور روز بروز بڑھتی ہوئی شہرت کے ساتھ ساتھ ادبی لحاظ سے ضرورت محسوس کرتے ہوئے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے اسے بی۔اے کے نصاب میں شامل کرنے کی سفارش کی جو علامہ اقبال کے یلدرم کے ساتھ گہرے روابط کا واضح ثبوت ہے۔جس کا قرۃ العین حیدر نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

اقبال نے خیالستان کو پنجاب یونیورسٹی کے بی۔اے کے اردو نصاب میں شامل کروایا۔[۸۸]

خیالستان کی اشاعت کے چند ہفتے بعد ہی یہ تصنیف شہرہ آفاق بن گئی۔۱۹۱۰ء کے اگلے اٹھارہ برس میں اٹھارہ ایڈیشن شائع ہوئے۔یلدرم نے متعدد ڈرامے اور کہانیاں تراجم کی ہیں جو دراصل طبع زاد تخلیقات ہی محسوس ہوتی ہیں۔یہ تخلیقات ترکی کے پس منظر کے ساتھ جدید مدنیت یورپین کی بجائے ترکی لیبل کے ساتھ بہتر انداز میں پیش کی گئی ہیں۔یلدرم مسلمانوں میں رونما ہونے والی تبدیلی سے آگاہ تھے۔اسی لیے مسلمانوں کی نئی خود آگہی کے دھارے میں شریک ہو گئے۔انھوں نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی جس وجہ سے ان کی شہرت ان کے لیے قابلِ عزت اور باعث فخر تھی۔

یلدرم کا تعلق درحقیقت اس نسل کے افراد سے تھا جنھوں نے مسلمانوں کی زندگی میں جہانِ نو پیدا کرنے کی کاوش کی۔وہ قدیم وجدید، مذہب اور سائنس، انگریزی اور عربی اور مشرق ومغرب پر مشتمل تھے۔یہی وہ نظریہ تھا جس پر علی گڑھ کالج نے عمل درآمد کیا۔اسی نظریہ کے چند عناصر نے اکبرالہ آبادی کو ملول اور غمزدہ کیا۔مگر وقت کے ساتھ ساتھ جدید مدنیت کے حامی اپنے مقاصد میں کامیاب رہے مگر اس کے برعکس علامہ اقبال جدید وقدیم دونوں ادوار کی عکاسی کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر یلدرم اور اقبال کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے علامہ اقبال کو فوقیت دیتی ہیں۔ اسی سبب وہ اقبال کی عظمت کی قائل نظر آتی ہیں۔ جس کے متعلق ان الفاظ میں تذکرہ کرتی ہیں:

عمرانیات کے لحاظ سے اقبال کے برعکس سجاد حیدر موجودہ دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ اقبال دونوں ادوار میں شامل تھے۔ چنانچہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ لوگوں کی زبان پر ہے۔[۸۹]

علامہ اقبال نے ۲۳؍دسمبر ۱۹۲۴ء کو ایک انگریزی مقالہ بعنوان ''اسلام میں اجتہاد'' یا ''الاجتہاد فی الاسلام'' اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبہ ہال میں پڑھا۔ اقبال کے اس خطبہ کے مطالعہ کرنے کے بعد مدراس کے سیٹھ جمال محمد جس نے مسلم ایسوسی ایشن قائم کر رکھی تھی۔ اقبال کو ۱۹۲۵ء میں مدراس میں اجتہاد کے موضوع پر مع تمام اخراجات مدعو کیا جسے اقبال نے قبول فرمایا۔ اقبال کے نزدیک اس دعوت کے اور بھی مقاصد تھے جن میں ایک تمدنِ اسلام کے اہم ترین مسائل کے متعلق ہم عصری تقاضوں کی روشنی میں اپنے نظریات یا تحقیقات کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کر کے شائع کرنا چاہتے تھے۔[۹۰]

علامہ اقبال ۱۹۲۹ء کو مدراس پہنچے یہ سفر خالصتاً علمی تھا اس میں انھوں نے اپنے خطبات کے ذریعے عہد حاضر کے مسلمانوں کو اسلامی تمدن کی قدیم فکری روایات کو فکرِ جدید کی روشنی میں پیش کرنے کی ترغیب دی تاکہ مستقبل میں ایک نیا اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے۔ اقبال نے اس خطبہ ''اسلام میں اجتہاد'' میں مسلمانوں کے دورِ جدید کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے فرسودہ مسائل کو ختم کرنے کی ترغیب دی ہے اور اُن مسائل پر روشنی ڈالی جن سے امتِ مسلمہ دوچار تھی۔ اقبال نے اس خطبہ میں اجتہاد پر زور دیتے ہوئے قانون سازی میں مکمل آزادی پر زور دیا اور بتایا جب سے تفرقہ بازی شروع ہو چکی ہے، اجتہاد کی طرف کسی بھی فرقہ نے توجہ نہیں دی۔ فقط جماعت اہلِ سنت نے ضرورت محسوس کی ہے۔ جس کے متعلق اقبال یوں تحریر کرتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ نظری طور پر اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا گو جب سے مذاہب اربعہ قائم ہو چکے ہیں عملاً اس کی کبھی اجازت بھی نہیں دی کیونکہ انھوں نے اس پر کچھ ایسی شرطیں لگا دی ہیں جن کا پورا کرنا ناممکن تو کیا سرے سے محال ہے۔[۹۱]

اسلام میں اجتہاد کے سلسلہ میں اقبال کے نزدیک بعض مغربی ناقدین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ترکوں کے اثرات کے سبب جامد ہوئے ہیں جس کی اقبال شدت سے نفی کرتے ہیں اور اجتہاد میں رکاوٹ کے اور بھی سبب بتاتے ہیں جن میں عقلی تحریک ہے۔ تحریک عقلیت ایک انتشار خیز قوت ہے جس کے سبب مدنیت اسلام کا استحکام خطرے میں ہے۔ عباسی قوانین میں سختی پیدا

کرتے گئے۔ تیسری وجہ وہ قیامت خیز دور تھا جب اسلامی دنیا کے ذہنی مرکز کو تیرہویں صدی میں نیست و نابود کیا۔ جس سے مورخوں نے تاتاری حملوں کا تذکرہ کر کے اسلام کے مستقبل کے متعلق مایوس کن اثرات پھیلائے۔[۹۲]

ترکوں نے مذہبی اور سیاسی لحاظ سے قوتِ اجتہاد کا اظہار سیاسی اور مذہبی نظام کی حیثیت سے یکجا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے منصبِ خلافت پر غور و خوض کیا کہ کیا اسلامی تعلیمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے فردِ واحد یا اراکانِ مجلس کو سونپا جا سکتا ہے۔؟ اس کے متعلق علامہ اقبال ترکوں کے اجتہاد پر روشنی ان الفاظ میں ڈالتے ہیں۔

ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے تو اس منصب کو افراد کی ایک جماعت، بلکہ کسی منتخب شدہ مجلس کے ذمے بھی کیا جا سکتا ہے۔[۹۳]

اقبال ترکوں کے اس نقطہ نظر کی داد دیتے ہیں کہ ان کا یہ عمل کسی بھی تائید کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ جمہوری طرزِ حکومت اسلام کی روح کے بالکل عین مطابق ہے۔ ترکی کے اس نقطہ نظر کو مزید سمجھنے کے لیے ابن خلدون کے نظریات جو انھوں نے اپنی تصنیف مقدمہ میں خلافت اسلامیہ سے متعلق تین نظریے بیان کیے ہیں۔ ان کے متعلق اقبال یوں وضاحت کرتے ہیں۔

یہ کہ خلافت ایک امر شرعی ہے لہٰذا اس کا قیام واجب ہے (ب) یہ کہ اس کا تعلق ضرورت اور مصلحت سے ہے اور (ج) یہ کہ اس کی سرے سے ضرورت نہیں۔ آخری نظریہ خوارج کا ہے...... جدید ترکی کا رجحان دوسرے نظریے کی طرف ہے یعنی وہ اس معاملے میں معتزلہ کے ہم خیال ہیں۔ جن کی رائے یہ تھی کہ عالمگیر خلافت کا تعلق صرف ضرورت اور مصلحت وقت سے ہے۔[۹۴]

اقبال نے مسئلہ خلافت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے متعلق تین شقوں کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی دوسری شق کو زیادہ ضرورت قرار دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بھی مسئلہ خلافت پر روشنی ڈالتے ہوئے اہلِ حدیث اور شیعہ کے مابین جھگڑا کا ذکر کیا ہے اور اس کے نزدیک خلفا کو صرف مذہب کی شیرازہ بندی اور امور سلطنت نپٹانے کے لیے منصبِ خلافت سونپا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر اقبال کی تینوں شقوں میں ایک اور شق کا اضافہ کرتے ہوئے شیعہ اور اہلِ حدیث فرقے کے مسائل کا تذکرہ کی مخالفت ان الفاظ کے ساتھ کرتی ہیں:

آج اہلِ حدیث اور شیعوں کا مسئلہ خلافت پر معرکہ کا مباحثہ ہوگا...... میں مباحثے کا اصولاً مخالف ہوں اور مسئلہ خلافت ایسا پیش پا افتادہ جھگڑا ہے کہ اس میں وقت صرف کرنا سعی لاحاصل ہے۔

خلفا، انبیا کی طرح مامور من اللہ نہیں، محض نوزائیدہ مذہب کی شیرازہ بندی اور انتظامِ سلسلہ قائم رکھنے کے لیے شوریٰ سے نصب خلافت ہوتا رہا ہے۔ تیرہ سو سال بعد آنے والی نسلوں پر زمانہ ماضی کے امرائے ملت کا اقرار یا انکار کیا اثر ڈال سکتا ہے۔[۹۵]

اقبال نے ترکوں کے اس فیصلہ کی داد دی ہے کہ اب وہ دور نہیں رہا کہ عالمگیر خلافت کا تصور عملاً کامیاب ہو لہٰذا جب تک اسلامی سلطنت قائم و دائم تھی تب تک ممکن تھا اب ہر کہیں آزاد اور خودمختار ریاستیں قائم ہو چکی ہیں۔ ماضی میں خلافت کے سلسلہ میں ایران اور مراکش ہمیشہ ترکی سے الگ رہا۔ لہٰذا ترک سیاسی افکار سے مفاد اٹھانے کے سلسلہ میں حق بجانب ہیں۔ اقبال ترک شاعر ضیاؔ کی ایک ترجمہ شدہ نظم کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

مسلمانوں میں کوئی موثر سیاسی اتحاد پیدا ہوگا تو جب ہی کہ بلادِ اسلامیہ آزاد ہو جائیں اور پھر سب کے سب مل کر ایک خلیفہ کی اطاعت اختیار کر لیں۔ لیکن کیا اس امر کا آج امکان بھی ہے اگر نہیں ہے تو پھر بجز انتظار کے چارہ کار ہی کیا ہے؟ لہٰذا خلیفہ کو چاہیے اور نہیں تو اس اثنا میں اپنا گھر ہی درست کر لے۔ وہ ایک ایسی ریاست کی تاسیس کا بیڑا اٹھائے جو زمانہ حال میں چلنے کے قابل ہو۔[۹۶]

اقبال ترک شاعر ضیا کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس کے نزدیک ترکی زبان میں مذہبی تعلیم دینا جائز ہے اور اسی زبان میں قرآن اور نماز پڑھتے ہیں۔ اقبال ضیا کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

وہ سرزمین جہاں ترکی میں اذان دی جاتی ہے، جہاں نمازی اپنے مذہب کو جانتے اور سمجھتے ہیں، جہاں قرآن پاک کی تلاوت ترکی زبان میں کی جاتی ہے، جہاں ہر چھوٹا بڑا احکام الٰہیہ سے واقف ہے۔ اے فرزند ترکی وہ ہے تیرا آبائی وطن۔[۹۷]

اقبال ضیا کے ان خیالات کے بعد اسلامی اندلس کے مہدی محمد بن تومرت کے متعلق بتاتے ہیں کہ اس نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی حکم صادر کیا کہ بربر قوم ناخواندہ ہے اسے قرآن، نماز اور اذان بربری زبان میں سکھائی جائے اور علما اور فقہا بھی اسے بربری میں رائج کریں۔[۹۸]

اقبال ترک شاعر کے جذبہ جوش کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہ خواتین وحضرات کے درمیان مساوات کا خواہاں ہے اور اس چند بنیادی تبدیلیوں کا ذکر یوں کرتا ہے:

یہ عورت ہی تو ہے جس کی بدولت میری زندگی کی گہرائیوں سے مقدس ترین آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں...... اس نے مجھے زندگی سے آشنا کیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقدس قانون اس حسین و جمیل مخلوق کو قابل نفرت ٹھہرائے۔ علماء نے قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر میں ٹھوکر کھائی ہے۔[۹۹]

اقبال اس خطبہ کی رو سے ہندوستان کے علما اور فقہا سے توقعات وابستہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ تبدیلی لازم ہے۔ جس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اب جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، ہندوستان اور مصر کے علما نے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔[۱۰۰]

اقبال کی ان خواہشات و توقعات پر پورا اترنے کے لیے یلدرم نے نہ صرف قدم بڑھایا بلکہ اسلام میں اجتہاد پر زور دیتے ہوئے ترک شاعر ضیا کے افکار کو نمایاں طور پر بروئے کار لاتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ جس پر یلدرم کے خلاف بھی ایک زبردست واویلا مچا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

ابا جان اپنے زمانہ طالب علمی میں ہی مضمون لکھا کرتے تھے کہ نماز تک اردو میں پڑھی جائے...... تعلیمِ نسواں، پردہ، مغربی طرزِ معاشرت، احکام شریعت، اسلام بحث کے موضوع ہوا کرتے تھے۔ سجاد ان مباحثوں میں پیش پیش ہوتے جو تجاویز پیش کرتے اس وقت وہ ناقابل عمل معلوم ہوتی تھیں مثلاً اُن کا خیال تھا کہ نماز دیسی زبان میں ہوا کرے اور قرآن شریف کا ترجمہ بغیر عربی عبارت کے شائع کیا جائے۔ مسجدوں میں ایسے غسل خانے بنائے جائیں جن میں کوٹ پتلون اور ہیٹ استعمال کرنے والے مسلمانوں کو وضو کرنے میں سہولت ہو۔ اگر جوتوں سمیت نماز پڑھی جائے تو بوٹ پر چڑھانے کے لیے غلاف موجود ہوں۔ اسلامی قانون وراثت میں وہ مشترکہ خاندان کے طرز پر تبدیلی چاہتے تھے۔ اُردو قرآن شریف، اُردو نماز اور تقسیم وراثت پر سجاد کے مضامین رسالوں میں شائع ہوئے تو اُن کے خلاف بہت کچھ لے دے ہوئی۔[۱۰۱]

اقبال کے خطبہ ''اسلام میں اجتہاد'' سے قدامت پسند علما پیش کردہ خیالات سے معترض ہوئے اور مولوی ابو محمد دیدار نے اقبال کے خلاف فتویٰ کفر جاری کر دیا۔ اقبال کو اس بات کا شدید رنج ہوا جس کا اظہار وہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

آپ نے ٹھیک فرمایا ہے پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا ہے۔ مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ ان شاء اللہ شائع بھی ہو گا مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔[۱۰۲]

اقبال دراصل مسلمانوں کی نئی نسل کے بارے میں بے حد متفکر تھے کہ کہیں نئی نسل فکری سطح پر

یورپ سے رجوع نہ کرلے اور یورپی نظریات کی چمک دمک سے بے راہ روی کا شکار ہو کر بھٹک نہ جائے۔اس کا اظہار اقبال سید سلیمان ندوی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی دوسری راہ اختیار نہ کرلے۔ [۱۰۳]

اقبال اچھی طرح آگاہ تھے کہ ہندوستانی مسلمان سیاسی لحاظ سے دیگر اسلامی ممالک کی قطعاً کوئی معاونت نہیں کر سکتے البتہ ذہنی لحاظ سے کچھ تعاون کر سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یورپ میں تجدید دین مارٹن لوتھر تحریک کے ذریعے عمل میں آئی مگر دنیائے اسلام میں ایسے کلیسا کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں جو کسی رکاوٹ کو ختم کرتا مگر پھر بھی احیائے علوم اسلامیہ کی شدت سے ضرورت تھی۔ جس کے طفیل ہی اسلام اور علوم جدیدہ کی حیات ذہنی کا ٹوٹا ہوا رابطہ دوبارہ جوڑ کر مسلمانوں کو جدید تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کی صورت میں دے کر ترقی کی جانب گامزن کیا جا سکتا تھا اور انھیں یورپی تمدن کے فکری اور سائنٹیفک پہلوؤں کو قبولیت کا احساس دلایا جا سکتا تھا کہ یہ کسی قسم کے غیر اسلامی علوم کی تقلید نہیں ہے بلکہ یورپ نے ان کے زوال کے دور میں اضافے کیے۔اسی فکری تسلسل کو ترقی یافتہ شکل دے کر اس میں اضافہ کرنا ہے۔ایسی کاوش سر سید احمد خاں نے بھی کی تھی مگر انھوں نے اپنے نظریات کی بنیاد زیادہ تر معتزلہ کے افکار پر قائم کی جس بنا پر وہ ناکام رہے۔اقبال کو معلوم تھا کہ دنیائے اسلام میں ایک ذہنی انقلاب کے آثار پیدا ہو رہے تھے مگر یہ قومیں ابھی تک اپنی سیاسی و اقتصادی مشکلات میں الجھی ہوئی ہیں۔مگر وہ دنیائے اسلام کے لیے اچھے اچھے آدمیوں کی توقع رکھتے تھے جو اس انقلاب کے لیے صحیح رہنمائی فرما سکیں۔ [۱۰۴]

اقبال کو دنیائے اسلام کے لیے اچھے اچھے آدمیوں کی تلاش ہمیشہ جاری رہی اور اقبال کی ان توقعات پر یلدرم پورے بھی اترے۔ یلدرم تو سر سید احمد خاں کے معتقدین میں سے تھے اور وہ سر سید احمد خاں کی طرح معتزلہ افکار پر عمل پیرا تھے اور وہ جدید سائنس اور عقلیت پرستی کو تسلیم کرتے تھے۔ان کا تعلق ہندوستان کی عقلیت پرست اور اصلاح پسند نسل سے تھا جو سر سید اور ان کے رفقا کار پسند کرتے تھے۔قرۃ العین حیدر اپنے والدین کے ان نظریات پر واضح انداز میں روشنی ڈالتی ہے جو اقبال کے تصور اجتہاد کی عکاسی کرتے ہیں اور جس سے اس کے والدین متاثر تھے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں، مغرب میں نظریہ ارتقا، جدید سائنس اور عقلیت پرستی اور

مذہب میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں کی گئی تھیں ۔سرسید اور اُن کے رفقا اُن سے بہت متاثر ہوئے تھے۔مغرب میں ''ایوولیومشنری نیچرل تھیولوجی'' کا زور ہوا۔یہاں سرسید اوران کے ساتھی بھی ''نیچری'' کہلائے۔ وہاں بائبل ، یہاں قرآن شریف کو ''عین قانون فطرت کے مطابق'' ثابت کیا گیا۔فوق العادات اور کرامات کو زور وشور سے مسترد کر دیا۔یہی رویہ ہندوستانی مصلحین کا رہا۔ارتقا کی تھیوری مسلسل ترقی کے نظریے پر مبنی تھی مغرب میں سائنس تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔اواخر انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی تک مغرب کے اہل دانش انتہائی امید پرست رہے۔ان کی دنیا متواتر ترقی پذیر تھی ۔رجائیت اور ترقی یہی جوش اور ولولہ ہندوستان کے مصلحین نے اپنایا۔ابا اور اماں ہندوستان کی عقلیت پرست اصلاح پسند نسل سے تعلق رکھتے تھے ۔ابا جان جوانی کے زمانے میں پہلے غالباً Agnostic تھے پھر خود کو پکا نیچری کہتے تھے اور قرونِ وسطیٰ علمائے معتزلہ کی عقلیت پرستی کے مداح تھے ۔ابا جان تاریخ دان اور دانش ور تھے۔اماں بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن تحریک سرسید کی تربیت یافتہ اور لڑکپن سے اصلاح مذہب کی نقیب رہی تھیں لہٰذا ان دونوں کے درمیان شیعہ سنی تکرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا علاوہ ازیں دودھیال ،ننھیال دونوں جگہ متعدد رشتے دار دونوں فرقوں کے پائے جاتے تھے (یہ جھگڑا صرف شہر لکھنؤ کی خاصیت تھا) شاہ ولی اللہ کی تحریک ،مغرب کی ایوولیومشنری نیچرل تھیولوجی اور سرسید کی تجدید و اصلاح دین سب نے مل کر ابا جان اماں کی نسل کو متاثر کیا تھا۔اُن کے اکثر دوستوں کے خیالات اسی قسم کے تھے۔[۱۰۵]

سجاد حیدر یلدرم کو اردو ادب کے ہر شخص میں ادبی خصائص کی بنا پر اقبال کی خصوصیات نظر آتی تھیں ۔اس سلسلہ میں یلدرم نے ''ز۔خ۔ش'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا۔''ز۔خ۔ش'' دراصل نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر اور ادبی ای کے سی آئی ای رئیس بھیکم پور کی چھوٹی صاحبزادی جن کا نام زاہدہ خاتون شیروانیہ تھا۔وہ اعلیٰ پائے کی ادیبہ تھی۔جن کی حیرت انگیز قادرالکلامی طبقہ نسواں کے لیے باعث صد افتخار کا درجہ رکھتی تھی۔جن کی بے وقت موت ۱۹۲۳ء میں واقع ہوئی اور اردو علم و ادب کے لیے نا قابل تلافی نقصان ہوا۔یلدرم نے ''تہذیب نسواں لاہور'' میں ان کے متعلق ان الفاظ کے ساتھ خراج تحسین پیش کیا:

وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی ،قفس میں جی اور اس نے قفس ہی میں دم توڑ دیا......وہ اپنی مختصر مگر متجلا زندگی میں اپنے تئیں خاک نشین ز۔خ۔ش۔کہا کی۔آج حقیقتاً خاک نشینی کی آرزومند آسودۂ خاک ہے۔خوش درخشید مگر شعلہ مستعجل بود۔[۱۰۶]

یلدرم کو ان کی ایک نظم بے حد پسند تھی جس بنا پر انھیں شاید اُن کے ہاں کلامِ اقبال کی خصوصیات نظر آئیں۔ اسی لیے یلدرم زاہد خاتون شیروانیہ کے معتقد تھے اور اُسے ''عورتوں کا اقبال'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ قرۃ العین حیدر اس سلسلہ میں یلدرم کی اقبال شناسی کی دلچسپی کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کرتی ہیں:

نواب مزمل اللہ خان کی جوانمرگ بیٹی زاہدہ خاتون شیروانیہ نے دہرہ دون میں ایک نظم کہی تھی۔ ابا جان کو جوز۔ خ۔ ش مرحومہ کو ''عورتوں کا اقبال'' کہا کرتے تھے۔ بہت پسند تھی۔ [۱۰۷]

سجاد حیدر یلدرم ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے رخصت لے کر یورپ گئے۔ یلدرم نے اس سفر کا احوال بذریعہ خط تحریر کیا ہے کہ وہ ۲۴ رمئی کو عدن پہنچے۔ عدن میں اس روز شدید گرمی تھی۔ ۲۶ رمئی ۱۹۲۴ء سوئیز پہنچے۔ یہاں سے بذریعہ ریل قاہرہ روانہ ہوئے۔ یکم جون ۱۹۲۴ء کو پورٹ سعید میں موجود تھے۔ یہاں سے جزیرہ سسلی روانہ ہوئے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں اقبال نے بانگ درا کی ایک نظم ''صقلیہ'' تحریر کی تھی اور اقبال بھی قیام یورپ سے ۱۹۰۸ء میں اس جزیرہ کے قریب سے گزرے اور مسلمانوں کی عظمت کا رونا رویا تھا۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

جب اُن کا جہاز اٹلی کے جزیرہ سسلی کے ساحل کے قریب سے گزرا تو ان کے دل میں کچھ اور ہی جذبات موجزن تھے۔ وہ سسلی کو ماضی کی سرزمین کے طور پر نہیں بلکہ تہذیب حجازی کے مزار کی صورت میں دیکھ رہے تھے۔ [۱۰۸]

وہاں اس مقام پر یلدرم کو اقبال بے ساختہ یاد آتے ہیں اور وہ اقبال کی یاد اور اسی مذکورہ نظم کا تذکرہ اپنے سفر کی روداد میں بیان کرتے ہیں۔ بقول قرۃ العین حیدر:

پورٹ سعید سے خط لکھ چکا ہوں وہاں ہم لوگ دو گھنٹے کے لیے اترے تھے۔ چار دن بعد ۳۰ رمئی کو جزیرہ سسلی پہنچے۔ اس جزیرہ کو دور سے دیکھ کر اقبال نے کہا تھا۔ وہ نظر آتا تہذیبِ حجازی کا مزار...... اقبال p&o کمپنی کے جہاز سے گئے تھے۔ ہمارا اطالوی جہاز وہاں تین گھنٹے ٹھہرا۔ اتر کر شہر Catania کی سیر کی۔ ایک نئی دلفریب دنیا تھی ...... ۳۱ رمئی صبح آٹھ بجے ہمارا جہاز نیپلز پہنچا۔ [۱۰۹]

قرۃ العین حیدر یلدرم کے متعلق ایک اور واقعہ بیان کرتی ہیں جس میں یلدرم کلام اقبال

سے محظوظ ہوتے تھے۔ وہ چھٹیوں کی صبح صبح اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ کلام اقبال بھی گنگناتے رہتے۔قرۃ العین حیدر نے اقبال کے پسندیدہ اشعار کا بھی ذکر کیا ہے جو یلدرم گنگناتے تھے۔ یلدرم اپنی لائبریری میں اخبار پڑھتے ہوئے قرۃ العین حیدر کو آواز دیتے کہ بیٹا ادھر آئیں اور مجھے ذرا یہ پڑھ کر سنائیں کیا لکھا ہے۔ یہاں قرۃ العین حیدر اپنے والد محترم کے ساتھ والہانہ لگاؤ کا تذکرہ بھی کرتی ہیں:

وہ مجھ سے بے حد خوش تھے اور انت سمے تک خوش رہے۔ چھٹیوں کی صبح کو اپنی آرام کرسی پر نیم دراز، اخبار پڑھتے ہوئے وہ اپنے پسندیدہ اشعار گنگناتے رہتے، ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا اور آج ہیں وہ دشت جنوں پر جہاں، رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے اور اخبار پڑھتے پڑھتے اپنے کتب خانے کی کھڑکی میں سے وہ پکارتے، بیٹا یہاں آؤ اور مجھے یہ پڑھ کر سناؤ۔[۱۰]

یلدرم کے اقبال کے ساتھ یہ گہرے رشتے ادبی لحاظ سے قائم و دائم رہے۔ اور یہ تعلقات اقبال کی ادبی دنیا میں اولین دور سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ اقبال یلدرم کو بہترین نقاد بھی تصور کرتے تھے۔ اور اپنے کلام کے متعلق مشاورت بھی کرتے تھے۔ اقبال یلدرم کی ادبی خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معتقد بھی تھے اور اہل علم بھی تصور کرتے تھے۔قرۃ العین حیدر اس سلسلہ میں ان واقعات کی شہادت دیتی ہیں۔ جس کے متعلق انھیں ان کے والدِ محترم نے بتایا تھا۔

ایک مرتبہ بتایا۔ اپنے اولین دور میں اقبال اپنا کلام اشاعت سے قبل ہمیں پڑھنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔[۱۱]

یلدرم بھی اقبال کے کلام پر فدا تھے۔ ان کی زبان پر ہر لمحہ، ہر گھڑی کلام اقبال کا ورد رہتا۔ یا باالفاظ دیگر یلدرم کلامِ اقبال ہر وقت گھر میں گنگناتے رہتے تھے۔ اور یہ سماں اکثر صبح سویرے ان پر طاری رہتا تھا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر یوں ذکر کرتی ہیں:

اکثر صبح صبح ابا جان کے کمرے یا غسل خانے سے ان کے گنگنانے کی آواز آتی۔ وہ عموماً اقبال کے شعر ہوتے۔[۱۲]

قرۃ العین حیدر اپنے والد محترم کے متعلق ایک اور جگہ پر بتاتی ہیں کہ سجاد حیدر یلدرم ریٹائر ہونے کے بعد مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گئے اور اس نئے گھر میں وہ کلام اقبال ہی ہر وقت گنگناتے رہتے تھے۔ یلدرم اقبال سے بے حد متاثر تھے اور ان کے کلام کے شیدائی تھے۔ کلام اقبال کا مطالعہ کرتے جو ان کی زبان پر ورد رہتا۔ جیسے یلدرم اقبال کے گن گاتے تھے' بعینہٖ قرۃ العین حیدر بچپن ہی سے اپنے والد اور اپنے خاندان سے بے انتہا متاثر تھی۔ یہاں یہ بات بے

انتہا اہم معلوم ہوتی ہے کہ انھیں اپنے والد سے جذباتی حد تک لگاؤ تھا۔ بقول قرۃ العین حیدر:

نمبر ۲ فیض آباد روڈ پر اکثر صبح سویرے ابا جان کے کمرے سے ان کے گنگنانے کی آواز آتی تھی۔

تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی ، دونوں کے صنم فانی

میں نے تقسیم کے المیے پر ناول بعنوان میرے بھی صنم خانے رقم کرنا شروع کیا۔[۱۱۳]

قرۃ العین حیدر یلدرم کے اس فعل سے عجیب لذت محسوس کرتی جب یلدرم اقبال کا کلام گنگناتے اور اس کے اندر ایک جذبہ ایمانی اور جوش و خروش پیدا ہوتا اور اسلامی دنیا سے آگاہی ہوتی۔ قرۃ العین حیدر اس سلسلہ میں اپنی کیفیت کچھ اس انداز میں بیان کرتی ہیں:

اقبال کے بعض اشعار جو ابا جان گنگناتے انہیں سن کر پھریری سی آتی۔ ''وہ ترے شہدا پالنے والی دنیا۔ عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا'' اور ''ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا۔[۱۱۴]

یلدرم اقبال کو مردِ کامل تصور کرتے اور اسلامی دنیا کا ہیرو سمجھتے تھے۔ بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کا نجات دہندہ تصور کرتے تھے۔ لیکن اقبال کی اچانک موت نے یلدرم کو صدمے سے نڈھال کر دیا اور کئی دن تک ان کی حالت سنبھل نہ سکی۔ بقول قرۃ العین حیدر:

اسی سال علامہ اقبالؒ اور کمال اتاترک نے رحلت کی۔ ابا جان کئی دن تک گم سم رہے۔[۱۱۵]

قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم ہی نہ صرف کلامِ اقبال کے شیدائی تھے بلکہ ان کی والدہ نذر الزہرہ بھی کلام اقبال کو سمجھنے کا شعور رکھتی تھیں اور اقبال کی شاعرانہ عظمت سے آگاہ تھیں۔ وہ بھی یلدرم کے شانہ بشانہ اقبال کے اشعار گنگناتی۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے یہ گھرانہ کلام اقبال کی مکمل سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ کلامِ اقبال کے پڑھنے اور گنگنانے کا یہ سلسلہ گھر میں اُٹھتے بیٹھتے جاری رہتا اور یہ عمل اہلِ خانہ کے مزاج اور دلچسپی اور لگاؤ پر منحصر تھا۔ مگر قرۃ العین حیدر کم سنی کی بنا پر اسے سمجھنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔ جس کا تذکرہ وہ خود ان الفاظ میں کرتی ہیں:

آتش دان میں آگ سنہرے شیر کی طرح گرجتی رہتی اخبار رسالے پڑھتے پڑھتے جاں امّاں اور بھائی خبروں کے متعلق باتیں کرتے تو اُن میں بعض نام بہت پراسرار اور سحر انگیز معلوم ہوتے ''حبشہ کا طغاری''، ''سمرقند''، ''یارقند''، ''کاشغر''، ''مہدی سوڈانی''، ''مراقش'' اور اماں کبھی کبھی گنگناتیں۔ طرابلسؔ کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں۔[۱۱۶]

قرۃ العین حیدر اور ان کی والدہ کو انگلستان جانے کا اتفاق ہوا۔ ویسے بھی نذر الزہرہ یلدرم کے ہمراہ مشرق وسطیٰ کی سیاحت کر چکی تھیں۔ راستے میں ''جبل الطارق'' نظر آیا۔ گو نذر الزہرہ اس

قدر پڑھی لکھی خاتون نہیں تھیں مگر تاریخ اسلام سے اچھی طرح آگاہ تھیں اور اسلامی تجدید کے جذبے کے ساتھ ساتھ اقبالیات سے بھی آگاہ تھیں مگر قرۃ العین حیدر اس بات کا اظہارِ افسوس کرتی ہیں کہ آج کی نوجوان نسل اقبال اور جبل الطارق کی اہمیت سے ناواقف ہیں مگر اُن کی والدہ کم پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ماضی کے ورثے سے آگاہ تھیں۔ بقول قرۃ العین حیدر:

دور سے جبل الطارق نظر آیا۔اماں بہت مضطرب ہو کر کھڑکی سے لگی۔اس چٹان کو دیکھا کیں۔اور اقبال کے اشعار دہراتی رہیں۔ اس پوری نسل کو اقبال اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تجدید کے جذبے اور اپنے ماضی کے ورثے اور اس کی الم ناک گمشدگی کا بڑا شدید احساس تھا حالانکہ ان لوگوں نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ دورِ حاضر کی کوئی لڑکی میرے خیال میں جبل الطارق دیکھ کر متاثر نہیں ہوگی۔شاید اس چٹان کی معنویت کا علم بھی نہ ہو۔ [۱۷]

علامہ اقبال اور قرۃ العین حیدر کے خاندان کی دوستی اور تعلقات جو عرصہ دراز سے نسل در نسل چلتے چلے آرہے ہیں۔ یہ تعلقات اگرچہ گھریلو یا کاروباری سطح سے شروع ہوئے اور ادبی اور تخلیقی ذوق کی راہوں سے گزرتے ہوئے خاندانی تعلقات کے روپ میں قائم و دائم ہیں۔قرۃ العین حیدر کے پرنانا میر مظہر علی (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) کی دوستی علامہ اقبال کے والد محترم شیخ نور محمد سے شروع ہوئی اور بعد ازاں قرۃ العین حیدر کے نانا میر نذر الباقر اور اس کے بھائی میر ظہور حسنین اور میر فیض العسکری، علامہ اقبال کے ہم مکتب بنے۔ بعد ازاں قرۃ العین حیدر کے والد سید سجاد حیدر یلدرم اور ان کی والدہ محترمہ نذر الزہرہ کے ساتھ اقبال کے ادبی اور دوستانہ مراسم عروج پر پہنچے۔ یہ بات بڑے فخر کی ہے کہ اقبال اور یلدرم کی وفات کے بعد ان خاندانی رشتوں میں کمی نہیں آئی بلکہ خاندانی محبتوں اور چاہتوں کے ان رشتوں میں اضافہ ہی ہوا۔علامہ اقبال کے بیٹے جاوید اقبال اور قرۃ العین حیدر کو اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر کی والدہ انھی تعلقات کو آگے بڑھانے کی خاطر گزشتہ تعلقات کو یاد ماضی کی صورت میں بیان کرتی ہیں اور اس طرح اقبال سے دلی لگاؤ کا اظہار کرتی ہیں۔ بقول قرۃ العین حیدر:

چندروز بعد اگست کے مہینے میں جاوید اقبال جو اسلام پر لیکچر دینے کے لیے آسٹریلیا مدعو کیے گئے تھے سڈنی جاتے ہوئے کراچی آئے...... میں نے جاوید سے تجویز آج کل مغرب میں خود وجودیت کے علاوہ کیتھولک وجودیت بھی اچھی جا رہی ہے۔آپ اسلامی خود وجودیت کا اجراً کر ڈالیے...... آسٹریلیا روانگی سے قبل جاوید جب اماں سے ملنے گارڈن روڈ آئے، اماں حسبِ معمول پلنگ پر لیٹے لیٹے ان سے میر مظہر علی اور شیخ نور محمد کے متعلق سیالکوٹ کی باتیں کرتی رہیں۔ [۱۸]

قرۃ العین حیدر نے قیام پاکستان کے بعد محکمہ ایڈورٹائزنگ فلمز اینڈ پبلیکیشنز میں ملازمت اختیار کی۔ یہاں اس نے ڈاکومنٹری فلموں کی پروڈیوسر کے علاوہ پاکستان کواٹرلی کی ایکٹنگ ایڈیٹر کے طور پر ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک کام کیا۔ اس محکمہ میں وہ تہذیبی وثقافتی موضوعات پر مضامین تحریر کرتی تھیں۔ لہٰذا وہ اپنے محکمے کے کام کی نوعیت کے سلسلہ میں ان الفاظ کے ساتھ وضاحت کرتی ہیں مگر وہ علامہ اقبال کے سلسلہ میں زیادہ متحرک نظر آتی ہیں۔

بحیثیت کاپی رائٹر میرا اور انور قریشی کا کام یہ تھا کہ فارن پبلسٹی کے لیے تہذیبی موضوعات پر بزبان انگریزی مضامین لکھیں۔ مثلاً لاہور اور ملتان کی تاریخی عمارتیں، مغل مصوری، فلسفہ اقبال، قاضی نذرالسلام کی شاعری، خوشحال خاں خٹک پاکستان کا عظیم شاعر، عبدالقیوم صاحب، یہ مضامین بیرونی ممالک کے پاکستانی سفارت خانوں کے پریس اتاشی حضرات کو بھیج دیئے تھے تاکہ ان ممالک کے اخبارات میں چھپیں۔ [۱۱۹]

۳۱رمئی ۱۹۵۷ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سبزہ زار میں ایک انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم اجلاس منعقد ہوا جس میں تمام دنیا سے تقریباً ایک سو کے لگ بھگ ماہرین اسلامیات لاہور پہنچے۔ اس تقریب میں قرۃ العین حیدر ڈاکومنٹری فلم بنانے کی غرض سے تشریف لائیں۔ اس تقریب میں مسلمان علما اور دانشوروں کے پورٹریٹ موجود تھے۔ جس میں علامہ اقبال کے پورٹریٹ کو ایک نمایاں اہمیت حاصل تھی۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال مرحوم سے کبھی ملاقات تو نہ کرسکی لیکن اس کے پورٹریٹ کے زیرسایہ بیٹھ کر دنیا کے دانشوروں اور علماً کے درمیان بیٹھ کر ایک روحانی لذت محسوس کرتی ہے۔ بقول قرۃ العین حیدر:

یورپ انگلستان اور امریکہ کے بیس عدد جغادری شرق شناس اور ماہرین اسلامیات اور ترکی، مصر، ایران، عرب ممالک، افغانستان، انڈونیشیا، افریقہ، کیمونسٹ چین، کیمونسٹ روس کے مسلمان علما اور دانشور اسٹیج پر علامہ اقبال کے پورٹریٹ کے نیچے ایک طویل میز پریس کے لیے سجھی تھی۔ جہاں صحافیوں کے ساتھ میں واحد خاتون بیٹھ کر نٹنگ کرتی اور بھانت بھانت کی اقوام کے نمائندہ دانشوروں کی صورتیں اور حرکات وسکنات ملاحظہ کرتی۔ [۱۲۰]

قرۃ العین حیدر گو علامہ اقبال سے ملاقات تو نہ کرسکی لیکن وہ اقبال کے متعلق بڑی متجسس اور معتقد نظر آتی ہیں اور اس سے والہانہ عقیدت کے باعث دلی لگاؤ رکھتی ہیں۔ وہ اقبال کے نوادرات کو دیکھنے کی بے حد متمنی نظر آتی ہیں اور انہیں نوادرات کی وہ تصویر بنانا چاہتی ہے جس میں اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کے متعلق وہ اظہارِ افسوس کرتی ہوئی نظر آتی ہیں:

کلوکیم کے دوران قلعہ لاہور کے شاہجہان اور جہانگیر کواڈ رانیگل میں اسلامی آرٹ کلچر کی بین الاقوامی نمائش منعقد ہورہی تھی......ایک کمرے میں اقبال پویلین سجایا گیا تھا۔جس کے لیے علامہ مرحوم کا حقہ، چارپائی اور قالین جاوید نے مستعار دیا تھا۔سارے قلعے میں نوادر کا ایک انتہائی بیش قیمت ذخیرہ سجایا جا چکا تھا۔میں نے فوٹوگرافر سے کہا کہ تصویریں لینی شروع کرے۔اتنے میں ایک صاحب لپک کر سامنے آئے اور کہا آپ تصویریں نہیں اتار سکتیں۔[۱۲۱]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے نوادر اپنے پاس محفوظ رکھنے کی زبردست خواہاں تھیں مگر یہ حسرت ناتمام کی صورت اختیار کرگئی۔نوادر محفوظ کرنے کی یہ خواہش انھیں علامہ اقبال کے اور بھی قریب لاتی ہے۔اقبال کے کچھ نوادر سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد نے بھی محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ انھیں بھارت چھوڑ آئے۔ بھارت دوبارہ منتقلی کے بعد اقبال کے یہ نوادر ان کی ایک عزیزہ نے فروخت کر دیئے جسے کھو کر قرۃ العین حیدر کو بے حد صدمہ ہوا۔جس کے متعلق وہ تفصیلاً بتاتی ہیں:

حسو باجی نے کہا۔''اگر صرف چار روز پہلے آئی ہوتیں تمہاری چیزیں بچ جاتیں......لیکن پچھلے ہفتے اقبال منزل[۱۲۲] کا بہت سارا سامان فروخت کیا گیا۔اس کے ساتھ ہی تمہارے چند صندوق اور بنڈل جو بے حد بوسیدہ ہو چکے تھے۔نیلام والا لے گیا۔[۱۲۳]

قرۃ العین حیدر پر اقبال منزل کے سامان کے فروخت کی خبر بجلی کی مانند گری اور وہ اس کے حصول کے لیے بے تاب و بے چین ہوگئی اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے نیلام گھر پہنچیں اور نیلام والے سے سامان کے متعلق استفسار کیا۔

میں نے کہا۔''مہاراج کمار محمود آباد کے ہاں اقبال منزل سے جو سامان آپ لوگ یہاں لائے ہیں۔اس میں کچھ باقی ہے یا سب بک گیا؟[۱۲۴]

نیلام گھر والا کاروباری نقطہ نظر سے قرۃ العین حیدر کی خواہش کو بھانپ گیا اور وہ اس سامان سے زیادہ منافع کمانا چاہتا تھا۔قرۃ العین حیدر اس اصرار پر تھیں کہ وہ یہ چیزیں واپس خریدنا چاہتی ہیں مگر اس نے چیزیں واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا اور برملا بدیانتی کا مظاہرہ کیا۔یہاں بھی قرۃ العین حیدر کو اقبال کے نوادرات کے حصول میں مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔جس کا وہ ذکر یوں کرتی ہیں:

مشکل ہے۔اقبال منزل سے جو سامان آیا تھا وہ تو سارا ہمارا ایجنٹ کہیں بھجوا چکا ہے۔میں معلوم کرتا ہوں اور دوسرے کمرے کو بڑھ گئے۔معاً میری نظر ایک الماری پر پڑی جس کے ایک تختے پر کشمیری فریم میں نانا نذر الباقر مرحوم لندن میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔[۱۲۵]

جیسا کہ اس سے قبل بھی ذکر کیا گیا ہے کہ قرۃ العین حیدر ۳۱ رمئی ۱۹۵۷ء کو انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کے منعقدہ اجلاس لاہور میں شرکت کے لیے کراچی سے تشریف لائیں۔ تو اس دوران علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال سے ملاقات ہوئی۔ جاوید اقبال نے قرۃ العین حیدر کو اپنے ہاں آنے کے لیے مدعو کیا تو قرۃ العین حیدر نے ریلوے ریزرویشن کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کراچی واپس جانے کی مجبوری بتائی مگر جاوید اقبال قرۃ العین حیدر کو اپنے گھر لے جانے کے لیے بضدر ہے۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر اور جاوید اقبال کے درمیان ایک دلچسپ مکالمہ بازی بھی ہوئی۔

جاوید اقبال انگلستان سے ڈاکٹریٹ اور بیرسٹری کر کے آچکے تھے اور جاوید منزل میں رہتے تھے اور قانون کی پریکٹس کر رہے تھے۔ انڈر اسٹیٹمنٹ والے برٹش سنس آف ہیومر کے مالک تھے۔ ایک روز فرمایا ''چاہتا ہوں فلاں تاریخ کو آپ کی دعوت کروں۔'' میں نے کہا۔ ''اس تاریخ کو کراچی واپس جا رہی ہوں۔ ریزرویشن ہو چکا ہے۔''

ریزرویشن کینسل ہوسکتا ہے۔

ریلوے والوں کا کہنا ہے کہ اس کے اگلے دس دن تک جگہ نہیں مل سکے گی۔

مگر آپ ریل سے کیوں جا رہی ہیں۔'' قدرت اللہ شہاب صاحب نے پوچھا جو لاہور آئے ہوئے تھے۔ چند ڈوکومنٹری فلموں کے پرنٹ تیار ہو چکے ہیں۔ ان کے ڈبے ساتھ لے جانے ہیں۔

چلیے ابھی ریلوے کے دفتر چلتے ہیں۔ جاوید کو دیکھتے ہی ریلوے والا موم ہو جائے گا۔

ایک صدر مملکت کا سیکریٹری اور شاعر ملت کا فرزند۔ ان دونوں کو دیکھ کر سارا ٹائم ٹیبل بدلا جا سکتا ہے...... ایسا ہی ہوا۔ [۱۲۶]

قرۃ العین حیدر جاوید اقبال کے اصرار پر جاوید منزل میورو ڈ پہنچیں اقبال کی کوٹھی کو دیکھ کر محظوظ ہوئیں اور ایک لمحہ کے لیے شیکسپیئر کے مکان میں پہنچ کر اقبال اور شیکسپیئر کی رہائش گاہوں کا موازنہ کرنے لگ گئیں مگر اقبال کی لائبریری اور ضخیم کتب دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گئیں کہ اقبال کس قدر بڑے فلاسفر تھے اور اس قدر وہ کتب بینی کرتے تھے۔ قرۃ العین حیدر ایسی صورت حال کا مظاہرہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

جاوید منزل میورو ڈ کو جواب علامہ اقبال روڈ کہلاتی تھی۔ ایک پرانی وضع کی کوٹھی تھی جس کی وہی اہمیت ہونی چاہیے جو اسٹریٹ فرڈ اون میں شیکسپیئر کے مکان کی ہے لیکن اقبال بلحاظ پیمانہ وقت ابھی ہم سے اتنے قریب ہیں کہ جاوید منزل جا کر وہ Sense of Awe نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جو مثلاً قونیہ میں محسوس ہوتا ہے۔ جاوید نے مجھے علامہ اقبال کی اسٹڈی دکھائی۔ الماریوں میں ضخیم جلدیں،

بڑی میز، یہ کتابوں کی مہک اس وقت میں چند لمحوں کے لیے ہیبت زدہ سی کھڑی رہی۔[۱۲۷]

جاوید اقبال اور قرۃ العین حیدر کی ادبی دوستی کے سبب ان کے حلقہ احباب میں اضافہ ہوا۔ قدرت اللہ شہاب جو قرۃ العین حیدر سے جاوید اقبال کی رہائش گاہ پر مل چکے تھے وہ بھی قرۃ العین حیدر کے متعلق جاوید اقبال سے استفسار کرتے رہتے تھے۔ جاوید اقبال قرۃ العین حیدر کی اقبال شناسی کے معتقد ہو گئے اور انھوں نے اسے ایک مقالہ ''اقبال۔ ایک باپ کی حیثیت سے'' بھیجا۔ جاوید اقبال قرۃ العین حیدر کو ان کی علم وفضیلت کی برتری کے سبب ''رابعہ بصری'' تصور کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں جاوید اقبال نے قرۃ العین حیدر کو ایک خط مورخہ ۱۹/اپریل ۱۹۵۸ء کو کراچی میں ارسال کیا۔

شہاب کئی مرتبہ حضور سے کراچی میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان کی اطلاع کے مطابق آج کل آپ شدت سے روزے رکھنے میں مصروف ہیں گویا اگر دفتر میں ٹیلی فون کیا جائے تو پتہ چلتا ہے آپ کسی میٹنگ پر گئی ہیں اور جب گھر پہ فون کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ سو رہی ہیں۔ حسب فرمائش مضمون ''اقبال ایک باپ کی حیثیت سے'' ارسال کر رہا ہوں اگر پسند آئے تو اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی تحریر کر کے ارسال کروں گا۔ چند ایک پرانے مضمون انگریزی میں لکھے ہوئے پڑے ہیں لیکن پرانے کاغذات ابھی کھولے نہیں اگر کوئی اچھی چیز نکلی ارسال کروں گا۔ میں ۲ یا ۳/مئی کو ایک بار پھر کراچی پہنچ رہا ہوں۔ ہفتہ عشرہ تک قیام ہوگا۔ شہاب اور میں آپ سے ملنے کی کوشش کریں گے اگر اجازت ہو تو۔ میرا ایک ننھا سا بھانجا ہے نام اس کا تحسین ہے جو آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ اسے ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن آپ کو رابعہ بصری سے کم نہیں سمجھتا۔[۱۲۸]

جاوید اقبال قرۃ العین حیدر سے ملنے کراچی آئے یہاں قرۃ العین حیدر اپنے محکمہ کی اعلیٰ افسر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین کارکن اور اپنے کام میں یکتا تھیں۔ قرۃ العین حیدر نے جاوید اقبال اور قدرت اللہ شہاب کی اپنے محکمہ کے آفیسر انور قریشی سے بھی ملاقات کروائی اور ان کی رہائش گاہ پر بھی لے گئیں اور انھیں کراچی کے بہترین کلب ''فرائیڈ کلب'' کی سیر کروائی جہاں شگفتہ اور خیرہ کن ادبی، نظریاتی اور سیاسی بحثیں جاری رہیں۔ جاوید اقبال کے ساتھ قرۃ العین حیدر اپنی ملاقات کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

جاوید کے کراچی آنے پر ایک شام میں جاوید اور شہاب کو ایئر کاٹج لے گئی جہاں حسب معمول کوئی زبردست نظریاتی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جاوید اقبال سیاسی لحاظ سے کنزرویٹو آدمی تھے۔[۱۲۹]

جاوید اقبال قرۃ العین حیدر کی اس ملاقات سے بے حد متاثر ہوئے اور اس ملاقات سے اُن کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی جہاں وہ سیاسی لحاظ سے کنزرویٹو رہتے تھے اب انھوں نے پاکستان کی سیاسی صورتحال کا جائزہ بھی لینا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں وہ قرۃ العین حیدر کے دل و جاں سے شکرگزار نظر آتے ہیں اور بالخصوص ''فرائیڈے کلب'' کے حوالے سے ممنون ہیں۔ جس کی وجہ سے انھوں نے فکرِ اقبال میں دلچسپی لیتے ہوئے ایک مقالہ بعنوان ''فکر اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاست حاضرہ کا جائزہ'' تحریر کیا اور ۳؍مئی ۱۹۵۸ء کو یہ مقالہ قرۃ العین حیدر کی خدمت میں ارسال کیا۔

ایک مقالہ بعنوان ''فکر اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاست حاضرہ کا جائزہ'' ارسال خدمت ہے۔ یہ مقالہ میں نے یومِ اقبال کے موقع پر لاہور میں پڑھا تھا اور بڑا پسند کیا گیا۔ اگر مجھے اور شہاب صاحب کو فرائیڈے کلب میں نہ لے جاتیں تو شاید یہ مقالہ کبھی تحریر نہ کیا جاتا گویا آپ کی اور آپ کے چند احباب کی پاکستان کے بارے میں نااُمیدی اور مایوسی کا اظہار اس مقالے کی تشکیل کا موجب بنا۔ اگر ہو سکے تو اسے پڑھ کر ان صاحبان کی نذر کر دیں تاکہ وہ شخصیتیں جو اس مقالے کی تحریر کا باعث بنیں۔ کم از کم اس مقالے کو ایک نظر دیکھ تو لیں اگر یہ مقالہ ان کی ناامیدیوں اور مایوسیوں کا ازالہ کر سکے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری کوشش ناکام ثابت نہیں ہوئی۔ میں انشاءاللہ جون کے شروع میں کراچی آنے کی کوشش کروں گا۔ نہ ہو نومید...... [۱۳۰]

جون ۱۹۶۰ء میں قرۃ العین حیدر کو محکمہ وزارت اطلاعات ونشریات کے ملازم کی حیثیت سے ایک بار پھر لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ اگر چہ لاہور میں ان کا قیام ان کی عزیزہ آپا حمّن کے گھر تھا مگر وہ جاوید اقبال کی ملاقات کی بھی متمنی تھیں کہ جاوید اقبال سے ملاقات ہو جائے۔ قرۃ العین حیدر نے جاوید کو اپنی آمد کے متعلق آگاہ کر رکھا تھا جبکہ اہل خانہ اس کی لاہور آمد سے بے خبر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اس واقعہ سے قرۃ العین حیدر اور اقبال کے خاندان کی دوستی اور تعلقات کی بنا پر قربت کا گہرا احساس ہوتا ہے اور رشتہ داروں عزیز بھائیوں کی مانند ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ جس کا اظہار وہ خود ان الفاظ میں کرتی ہیں:

جس وقت نشو اور میں لاہور ایئرپورٹ سے آپا حمّن کے ہاں نمبر ۴۹ لارنس روڈ پہنچے رات کے گیارہ بج چکے تھے گرمیوں کا زمانہ تھا۔ باغ میں رات کی رانی معطر تھی۔ سب لوگ باہر لان پر مچھر دانیاں لگائے محوخواب تھے...... جاوید مجھے اور نشو کو نمبر ۴۹ لارنس روڈ پہنچانے آئے۔ [۱۳۱]

اس سفر کے دوران قرۃ العین حیدر اور جاوید اقبال ''ادبی تخلیقات'' پر گفتگو کرتے رہے اور

ان دونوں کے درمیان قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' زیرِ موضوع رہا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر یوں ذکر کرتی ہیں:

میں نے کہا۔ ''یار لوگوں نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ ناول ورجینا وولف کی اور لینڈو سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ حد ہے''...... جاوید نے کار برساتی میں روکتے ہوئے کہا۔ ''کل ایک اردو دان کینڈین خاتون کہہ رہی تھیں کہ اس کے پہلے حصے میں ایک جگہ ہرمین ہمس کے سدھارتھ کی جھلک ہے۔ میں نے سدھارتھ نہیں پڑھی۔ [۱۳۲]

قرۃ العین حیدر جاوید اقبال کی شخصیت سے بے حد مرعوب ہیں اور اُن کی ادبی صلاحیتوں کی معتقد ہیں۔ جاوید ان کی نظر میں دورِ جدید کے ایک مثالی شخص کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے وہ بے حد متاثر نظر آتی ہیں۔

اسلامی نظریاتی قدامت پرستی سے قطع نظر جاوید خود بہت جدید ذہن کے آدمی تھے۔ نہایت جدید ترین تکنیک کے افسانے سویرا (لاہور) میں لکھے تھے۔ بعد میں اس شاہین بچے کی طبیعت ادب کی طرف سے ہٹ گئی...... انھی دنوں میں نے ''ایک مکالمہ'' میں سبط حسن ''کامریڈ صفتِ حسن'' اور جاوید کو ڈاکٹر عقاب آفاقی کے روپ میں پیش کیا...... جاوید اقبال اب مسٹر جسٹس جاوید اقبال جج لاہور ہائی کوٹ۔ [۱۳۳]

قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں علامہ اقبال کے انھی خاندانی تعلقات کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے افکار و نظریات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے یا انھی افکار و نظریات اور حالات و واقعات کو اپنی تصانیف میں آگے پھیلایا ہے۔ جس کی روشنی میں وہ علامہ اقبال سے بے حد متاثر نظر آتی ہیں۔

حواشی

۱۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۴۳۔
۲۔ پگڈنڈی یلدرم نمبر، ص ۳۔
۳۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۴۶۔
۴۔ بال جبریل، ص ۲۸۔
۵۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۴۴۔
۶۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۴۴۔
۷۔ گلگشت، ص ۱۴۵۔
۸۔ ایضاً، ص ۱۴۵۔
۹۔ ایضاً، ص ۱۴۵۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔
۱۱۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۴۵۔
۱۲۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۴۶۔
۱۳۔ سفینہ غم دل، ص ۱۳۴۔
۱۴۔ زندہ رود، جلد اوّل، ص ۷۔
۱۵۔ گلگشت، ص ۱۴۰۔
۱۶۔ زندہ رود، جلد اوّل، ص ۶۔
۱۷۔ ضرب کلیم، ص ۸۶۔
۱۸۔ زندہ رود، جلد اوّل، ص ۱۵۔
۱۹۔ روزگار فقیر، جلد دوم، ص ۱۵۔
۲۰۔ زندہ رود، جلد اوّل، ص ۱۸۔
۲۱۔ ذکر اقبال، ص ۸۔
۲۲۔ زندہ رود، اوّل، ص ۲۰۔

۲۳۔ کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۱۵۷۔

۲۴۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۵۷۔

۲۵۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۲۳۱۔

۲۶۔ ذکرِ اقبال، ص ۹۔

۲۷۔ کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۱۵۷۔

۲۸۔ اقبال کے حضور، اوّل، ص ۱۷۰۔۱۶۹۔

۲۹۔ کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۱۵۸۔

۳۰۔ ذکرِ اقبال، ص ۲۷۱۔

۳۱۔ کارِ جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۱۵۷۔

۳۲۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۵۸۔۱۵۷۔

۳۳۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۲۷۔

۳۴۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۲۷۔

۳۵۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۹۹۔

۳۶۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۲۵۔

۳۷۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۸۷۔

۳۸۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۹۳۔

۳۹۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۲۷۔

۴۰۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۲۹۔

۴۱۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۲۴۵۔

۴۲۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۲۹۔

۴۳۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۱۲۶۔

۴۴۔ انتخاباتِ سجاد حیدر یلدرم، ص ۱۲۔

۴۵۔ دیباچہ بانگِ درا، ص ۱۰۔

۴۶۔ اقبال نامہ، حصہ اوّل، ص ۳۔

۴۷۔ بانگِ درا، ص ۸۹۔

۴۸۔ پگڈنڈی یلدرم نمبر، ص ۵۳۔۵۲۔

۴۹۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۶۔۲۰۵۔

۵۰۔ ایضاً، جلد اوّل،ص ۲۰۶۔

۵۱۔ زندہ رود ،جلد اوّل،ص ۶۱۔

۵۲۔ بانگِ درا ،ص ۵۳۔

۵۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۱۲۸۔

۵۴۔ عروج اقبال ،ص ۱۵۹،تاریخ ادب اردو از ملک حسن اختر،ص ۵۳۷۔۵۲۷۔

۵۵۔ پگڈنڈی یلدرم،نمبر،ص ۱۱۰۔

۵۶۔ دیباچہ بانگِ درا ،ص ۱۳۔۱۲۔

۵۷۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۱۳۰۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۴۰۔

۵۹۔ مقالاتِ اقبال،ص ۵۱۔

۶۰۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۱۴۸۔۱۴۷۔

۶۱۔ انتخابات سجاد حیدر یلدرم ،ص ۹۳۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۹۴۔۹۳۔

۶۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۱۴۳۔

۶۴۔ انتخابات سجاد حیدر یلدرم ،ص ۵۷۔۱۵۶ اور کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۱۳۳۔

۶۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل ص ۱۷۱۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۷۲۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۷۴۔

۷۰۔ مقالاتِ اقبال،ص ۱۸۴۔

۷۱۔ ایضاً۔

۷۲۔ مفکر پاکستان ،ص ۲۱۵۔۲۱۴۔

۷۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۲۳۲۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۲۳۲۔

۷۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۲۳۳۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۲۳۳۔

۷۷۔ ایضاً، جلد دوم،ص ۲۱۳۔

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۱۴۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۲۱۷۔

۸۰۔ اقبال کے ان اشعار سے مراد پیام مشرق کی فارسی نظم ''تنہائی'' صفحہ نمبر ۱۱۸ پر درج ہے بحوالہ خطوط اقبال ،ص ۱۵۱۔

۸۱۔ اقبال کے یہ تینوں اشعار علی گڑھ میگزین میں ۱۹۲۵ء کو شائع ہوئے۔ یہ اشعار زبور عجم میں غزل نمبر ۳۷ پر درج ہیں مگر غزل کی ترتیب میں فرق ہے۔خطوط اقبال ،ص ۱۵۲۔

۸۲۔ پنجاب گزٹ ،ص ۲، ۳۲۹۔

۸۳۔ زندہ رود ،جلد دوم ص ۱۴۷۔

۸۴۔ انوار اقبال ،ص ۲۵۔

۸۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص ۴۳۔

۸۶۔ انتخابات سجاد حیدر یلدرم ،ص ۱۶۔

۸۷۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۸۸۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل ص ۱۸۷۔

۸۹۔ ایضاً، ص ۱۴۲۔

۹۰۔ متعلقات خطبات اقبال ،ص ۲۰۔۱۷۔

۹۱۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیه ،ص ۲۲۰۔

۹۲۔ ایضاً، ص ۲۲۹۔۲۳۲۔

۹۳۔ ایضاً، ص ۲۴۲۔

۹۴۔ ایضاً، ص ۲۴۳۔

۹۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۲۴۳، ۲۴۴۔

۹۶۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیه ،ص ۲۴۵۔

۹۷۔ ایضاً، ص ۲۴۸۔

۹۸۔ ایضاً، ص ۲۴۸۔

۹۹۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ،ص ۲۴۹۔
۱۰۰۔ ایضاً، ص ۲۴۲۔
۱۰۱۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل ،ص ۱۳۱، ۳۷۸،
۱۰۲۔ انوار اقبال ،ص ۳۱۷۔
۱۰۳۔ اقبال نامہ ،حصہ اوّل ،ص ۵۵۔
۱۰۴۔ ایضاً، حصہ دوم ،ص ۱۴۸، ۱۴۳، ۲۱۶، ۳۴۸۔
۱۰۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل ص ۳۷۸۔
۱۰۶۔ انتخابات سجاد حیدر یلدرم ،ص ۲۱۰۔
۱۰۷۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل ،ص ۳۱۲۔
۱۰۸۔ زندہ رود ،جلد اوّل ،ص ۱۳۷۔
۱۰۹۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل ۲۶۲۔
۱۱۰۔ شیشے کے گھر ،ص ۱۸۹۔۱۸۸۔
۱۱۱۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل ،ص ۴۱۲۔
۱۱۲۔ ایضاً، ص ،۱۴۰۔
۱۱۳۔ ایضاً، ص ،۴۶۲۔
۱۱۴۔ ایضاً، ص ۳۴۵۔
۱۱۵۔ ایضاً، ص ۳۸۲۔
۱۱۶۔ ایضاً، ص ،۳۴۵۔۳۴۴۔
۱۱۷۔ ایضاً، جلد دوم ،ص ۳۳۵۔
۱۱۸۔ ایضاً، ص ۳۱۶۔
۱۱۹۔ ایضاً، ص ۹۹۔
۱۲۰۔ ایضاً، ص ۳۳۲۔
۱۲۱۔ ایضاً، ص ۳۳۲۔
۱۲۲۔ مہاراجہ سر علی محمد خان (تعلقدار محمود آباد) کی جونیئر رانی اور حسو باجی کی سمدھن کا مکان۔
۱۲۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم ،ص ۳۴۵۔
۱۲۴۔ ایضاً، ص ۲۴۵۔

۱۲۵۔ کار جہاں دراز ہے ، جلد دوم، ص ۳۴۵۔

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۲۴۶۔۲۴۵۔

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۲۴۶۔

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۲۵۴۔

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۲۵۵۔

۱۳۰۔ ایضاً، ص ۲۵۵۔

۱۳۱۔ ایضاً، ص ۳۱۵۔۳۱۴۔

۱۳۲۔ ایضاً، ص ۳۱۶۔

۱۳۳۔ ایضاً، ص ۳۸۷، ۳۱۶۔

باب دوم

قرۃ العین حیدر کی اقبالیات سے دلچسپی

قرۃ العین حیدر کا تعلق جس خاندان سے ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں بلا شبہ اس کے والدین سید سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد ایک ادبی گھرانہ سے وابستہ تھے اور ادب کی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ قرۃ العین حیدر نے ایسے ہی ماحول اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی، پرورش پائی اور ادبی ماحول سے استفادہ کرتی رہی۔ علمی و ادبی ماحول اسے اپنے گھرانہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ یلدرم ایک افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے نقاد بھی تھے۔ وہ پہلے اقبال شناس تھے۔ جنھوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک مضمون ''ایک نیا ستارہ۔۔۔ اقبال''[1] تحریر کیا۔ یلدرم کی تنقید نگاری کے متعلق قرۃ العین حیدر شہادت دیتی ہے کہ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم کو علامہ اقبال اپنا کلام اشاعت سے قبل پرکھنے کے لیے روانہ کرتے تھے، جس کے متعلق ان کے والد محترم قرۃ العین حیدر کو بتاتے تھے۔ بقول قرۃ العین حیدر:

> ایک مرتبہ بتایا۔ اپنے اوّلین دور میں اقبال اپنا کلام اشاعت سے قبل ہمیں پڑھنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔[2]

یلدرم کلام اقبال کے بے حد شوقین تھے اور ان کی زبان پر، ہر لحظہ کلام اقبال جاری و ساری رہتا تھا اور وہ گھر میں کلام اقبال ہی گنگناتے رہتے تھے۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ کے ساتھ ذکر کرتی ہیں:

> اکثر صبح صبح ابا جان کے کمرے یا غسل خانے سے ان کے گنگنانے کی آواز آتی۔ وہ عموماً اقبال کے شعر ہوتے۔[3]

قرۃ العین حیدر اپنے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم کے علامہ اقبال کے کلام کے ساتھ لگاؤ پر ایک عجیب سی لذت محسوس کرتی تھیں جب وہ ہمہ وقت گھر میں کلام اقبال گنگناتے رہتے تھے۔

اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر اپنی کیفیت کے متعلق ان الفاظ کے ساتھ اظہار کرتی ہیں:

اقبال کے بعض اشعار جو ابا جان گنگناتے، انھیں سن کر پھریری سی آتی۔ ’’وہ تیرے شہدا پالنے والی دنیا۔ عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا‘‘ اور ’’ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا۔[۴]

قرۃ العین حیدر اپنے باپ یلدرم کی کلام اقبال سے دلچسپی کا ایک اور واقعہ بیان کرتی ہیں۔ جس میں اقبال کے اشعار یلدرم صبح کے وقت گھر میں گنگناتے تھے۔ وہ لائبریری میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھتے اور اپنی بیٹی کو آواز دیتے کہ ادھر آؤ اور مجھے بتاؤ کہ کیا لکھا ہے۔؟ اس واقعہ کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

وہ مجھ سے بے حد خوش تھے۔ اور انت سمے تک خوش رہے، چھٹیوں کی صبح کو اپنی آرام کرسی پر نیم دراز اخبار پڑھتے ہوئے اپنے پسندیدہ اشعار گنگناتے رہتے۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا اور آج میں خاموش وہ دشت جنون پر جہاں، رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے اور اخبار میں پڑھتے پڑھتے اپنے کتب خانے کی کھڑکی میں سے پکارتے۔ بیٹا یہاں آؤ اور مجھے پڑھ کر سناؤں...... ایک باپ بیٹی کی یہ کیسی مکمل دنیا تھی۔[۵]

سجاد حیدر یلدرم ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد لکھنؤ میں مستقل رہائش پذیر ہو گئے اور گھر میں ہمہ وقت کلام اقبال گنگناتے تھے کیونکہ انھیں علامہ اقبال سے شدید لگاؤ تھا۔ جس بنا پر وہ کلام اقبال کے شیدائی تھے۔ قرۃ العین حیدر بچپن ہی میں اپنے والد محترم سے بے حد مانوس تھیں اور انھیں اپنے والد سے جذباتی حد تک لگاؤ بھی تھا۔ اسی مانوسیت کی بنا پر اس پر ان کے والد کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ہر اولاد اپنے والدین کے نقش قدم پر چلتی ہے اور یہ ایک فطرتی عمل ہے۔ اسی فطرتی عمل کے تحت قرۃ العین حیدر بھی اپنے والد کی مانند علامہ اقبال سے متاثر ہوئیں کیونکہ اس کے والد اقبال کے اشعار دہراتے رہتے تھے۔ جس کے بارے میں وہ یوں ذکر کرتی ہیں:

نمبر ۲ فیض آباد روڈ پر اکثر صبح سویرے ابا جان کے کمرے سے اُن کے گنگنانے کی آواز آتی تھی۔

تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی[۶]

یلدرم اگر چہ ہر لحہ اور ہر گھڑی گھر میں اپنے بیوی بچوں کے روبرو کلام اقبال گنگناتے رہتے تھے مگر اس کے بچے اسے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ابو کیا گنگناتے رہتے ہیں۔؟ لہٰذا قرۃ العین حیدر اس بات کا واضح طور پر اعتراف کرتی ہیں کہ کلام اقبال کو اس دور میں سمجھنا ان کے لیے بالاتر تھا جب وہ لڑکپن کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ جس کا وہ ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں:

نجانے کیوں، گو اس وقت تک اقبال کو سمجھنے کی عقل بھی نہیں آئی تھی۔ [۷]

قرۃ العین حیدر ہمہ وقت اقبالیات کو سمجھنے کی کاوش میں لگی رہتی اور اقبال کی شاعری کو سمجھنے کی جستجو کرتی رہتی، جس سے انھیں والہانہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اقبالیات سمجھنے کے لیے اپنے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم سے رات گئے تک محو گفتگو رہتیں اور یلدرم بھی اپنی بیٹی کو اقبال کی شاعری کے متعلق دوستانہ ماحول میں آگاہ کرتے اور ان کے اندر اقبال شناسی کے لیے تجسس پیدا کرتے۔ قرۃ العین حیدر نے اقبال شناسی اپنے والد محترم سے دوستانہ ماحول میں سیکھی۔ بقول قرۃ العین حیدر:

رات کو ابا جان کے ساتھ میں دیر تک اقبال کی شاعری اور دنیا جہان کی باتوں پر بحث کرتی رہتی ابا جان میرے بہترین دوست تھے۔ [۸]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی تصانیف سے متعلق بچپن کے واقعات کا تذکرہ بیان کرتی ہیں کہ بچپن میں ان کے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم کے ہاں ان کے دوست احباب ملنے کے لیے آتے تھے تو وہ ان کو علامہ اقبال کی کتب اٹھا کر پڑھنے کے لیے دیتی تھیں۔ اس طرح بچپن ہی سے وہ علامہ اقبال کی کتب سے آشنا ہو گئی تھیں۔

مجھے اس وقت یاد آیا ایک افغان شہزادے سردار عمر خان جب نمبر ۲۰ کرزن روڈ دہرہ دون کے پہلو کے روشن برآمدے میں آکر بیٹھا کرتے تھے اور ابا جان کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ ایک بار میں نے ضرب کلیم میں سے ''رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان۔ تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان''۔ ان کو دی تھی اور وہ اٹک اٹک کر اس نظم کو پڑھ رہے تھے اور اس وقت علامہ عبداللہ یوسف علی کے مترجمہ قرآن شریف کا ایک پارہ ڈاک سے آیا اور ابا جان نہایت ذوق وشوق سے اس کے متعلق سردار عمر خان سے گفتگو کرنے لگے۔ [۹]

قرۃ العین حیدر کو اپنے والد کی وفات کا دلی صدمہ ہو، اور ان کی وفات کے بعد وہی کلام اقبال گنگناتی جو اُن کے والد محترم گھر میں گنگناتے تھے۔ یلدرم کی علامہ اقبال سے گہری دلچسپی انھیں اپنے ورثہ سے ملی اور اسی وراثت کو قرۃ العین حیدر نے اپنے والد کی وفات کے بعد مزید آگے پھیلایا۔ بقول قرۃ العین حیدر:

جون ۱۹۴۳ء میں نمبر ۲۱ فیض آباد روڈ سے منتقل ہونے سے چند روز قبل میں سامنے کے برآمدے میں متواتر گاتی پھر رہی تھی۔

تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

جو ابا جان اکثر گنگنایا کرتے تھے، بھائی نے اپنے کمرے سے نکل کر مجھے آہستہ سے منع کیا تھا۔ ماں کے پاس تعزیت کے لیے لوگ آئے بیٹھے ہیں، اور آپ ہیں کہ گاتی پھر رہی ہیں۔[۱۰]

قرۃ العین حیدر نے بحیثیت ناول نگار اپنے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۴۷ء کے بعد انیس سال کی عمر میں کیا۔ (اگر چہ ناول نگاری سے قبل انہوں نے افسانہ نگاری ستاروں سے آگے میں بھی قدم رکھ کر آغاز کر لیا تھا) جب انھوں نے والد کی وفات اور تقسیم ہند کے المیہ سے متاثر ہو کر اپنے شکستہ جذبات کی ترجمانی اپنے پہلے ناول میرے بھی صنم خانے میں کی۔ جس کی تحریر کا آغاز ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ اپنے اس ناول کے متعلق قرۃ العین حیدر اس بات کا اظہار کرتی ہیں:

میں نے تقسیم کے المیے پر...... ناول بعنوان میرے بھی صنم خانے رقم کرنا شروع کیا......

اپریل ۱۹۴۹ء میں میرے بھی صنم خانے مکتبہ جدید لاہور سے پہلی بار شائع ہوئی۔[۱۱]

قرۃ العین حیدر جب میرے بھی صنم خانے تحریر کر رہی تھیں تو ان کے ہاں ایک احساسِ تفاخر نمایاں نظر آتا ہے اور اپنے آپ کو مصنفین کی صف میں شامل کر کے فخر محسوس کرتی ہیں، جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

دارالاشاعت پنجاب کی عمارت کے پھاٹک کے اندر غلام عباس سامنے ہی نظر آئے گلے میں مفلر لپیٹے وہ تہذیب نسواں کے دفتر سے نکل رہے تھے۔ متانت سے، گویا رائٹر تو رائٹر دریافت کیا۔ ''آج کل آپ کیا لکھ رہی ہیں''؟ اسی متانت سے جواب دیا۔ ''ایک ناول لکھ رہے ہیں۔ میرے بھی صنم خانے۔[۱۲]

میرے بھی صنم خانے سے قبل قرۃ العین حیدر نے ایک افسانوی مجموعہ ستاروں سے آگے مکتبہ جدید لاہور سے پہلی بار ۱۹۴۷ء میں شائع کروایا اور اس افسانوی مجموعے کا عنوان بھی علامہ اقبال کے اس شعر سے منسوب کیا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں[۱۳]

علامہ اقبال کے مذکورہ بالا شعر سے ظاہر ہوتا ہے وہ کائنات کا راز جاننے کی جستجو کے خواہاں تھے اور وہ جدوجہد کے قائل اور جہانِ نو پیدا کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ یہی پیغام وہ نئی نسل کو منتقل کرنا چاہتے تھے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے مذکورہ بالا افسانوی مجموعہ میں علامہ اقبال کی مانند نوجوان نسل کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کاوش کرتے ہوئے علامہ اقبال کے کلام سے مستفید ہونے کی دعوت دی ہے۔

دو عالم کون ومکاں (VERSUS) لامکاں۔ اے طائرِ لاہوتی نہ تو زمین کے لیے ہے، نہ آسمان کے لیے۔ ہوا میں معلق رہ۔ اسرارِ خودی پڑھو، رموزِ خودی پڑھو، اگر قرآن پڑھنے کی توفیق نہ ہو تو اقبال کا مطالعہ کرو۔ [۱۴]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے ایک اور شعر کے نام ایک اور ناول کارِ جہاں دراز ہے منسوب کیا جو تین جلدوں پر مشتمل سوانحی ناول ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے خاندان کے تعلقات کا تذکرہ علامہ اقبال کے خاندان کے ساتھ کیا ہے، اس ناول کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں، دوسری جلد ۱۹۷۹ء میں مکتبہ جدید اردو ادب لاہور نے شائع کی، جبکہ تیسری جلد ۲۰۰۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔ ان تینوں جلدوں کو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ایک جلد میں یکجا کیا ہے۔ اس ناول کا نام علامہ اقبال کی تصنیف بالِ جبریل کی تیسری غزل کے چھٹے شعر سے ماخوذ کیا ہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر [۱۵]

قرۃ العین حیدر نے سفر ایران پر مبنی ایک سفر نامہ کوہ دماوند کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ کوہ دماوند ایران میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے درج ذیل شعر سے اس سفر نامے کا نام منسوب کیا ہے۔

مشکل ہے کہ اک بندہ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند [۱۶]

قرۃ العین حیدر نے اس سفر نامے میں تاریخ ایران کے ساتھ ساتھ زوال ایران پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کن حالات و واقعات کی وجہ سے شاہ ایران رضا شاہ برسرِ اقتدار آئے اور اس کی حکومت کو زوال آیا۔

اس اثنا میں پرشین کوزیگ بریگیڈ کے کرنل رضا خان احمد شاہ، قاچار کو معزول کر کے پہلے وزیر جنگ اور اب خود شہنشاہ بن چکے تھے اور اتاترک کی طرح اپنے آپ کو جدید بنانے میں کوشاں تھے۔ [۱۷]

قرۃ العین حیدر نے کوہ دماوند میں شہنشاہ ایران اور اس کی ملکہ فرح دیبا کی دلچسپ اور عبرت انگیز کہانی تحریر کی ہے اور مصطفیٰ کمال اور شہنشاہ ایران کی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کے متعلق علامہ اقبال پہلے ہی مایوس ہو چکے تھے۔

نہ مصطفیٰ، نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی [۱۸]

قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں، افسانوں اور ناولوں کے موضوعات بھی علامہ اقبال کے اشعار، الفاظ، تشبیہات و استعارات، مخصوص علامات اور اصطلاحات سے استفادہ کیا ہے اور اپنے قارئین کو علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے آگاہ کرتے ہوئے مزید ان کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک افسانے کا عنوان قلندر تحریر کیا ہے۔

قلندر

قلندر علامہ اقبال کی اہم ترین اصطلاح ہے۔ کلام اقبال کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرد مومن، مرد درویش، مرد حق، مرد مسلمان، وغیرہ تمام قلندر ہی کے نام ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں جہاں مرد حق، مرد مومن یا درویش کا تذکرہ کیا تو گویا وہ قلندر ہی کا مفہوم لے کر اُس کی صفات گنواتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک کوئی بھی فرد اپنی خودی کی تربیت، تعمیر اور استحکام سے جس بلند مقام کو حاصل کرتا ہے، وہ مقام محمود ایک قلندر یا مرد مومن کے لیے مخصوص ہے۔ قلندر دنیا کا بندہ نہیں بلکہ خدا کا بندہ ہے اور اقبال ایسے مومن کو اللہ تعالیٰ کا شیر کہتے ہیں۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی[19]

علامہ اقبال نے ''قلندر کی پہچان'' کے عنوان سے ضرب کلیم میں ایک نظم بھی تحریر کی ہے۔ جس میں اقبال نے ''قلندر'' کی علامت سے تمام تصورات کی وضاحت کی ہے جو انھوں نے قلندر کو مہر و ماہ و انجم کا محاسب اور زمانے کا راکب قرار دیا ہے، جو زمانے کو اپنی گرفت میں کر کے اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندہ حق تو بھی ادھر جا
مہر و مہ انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے، قلندر[20]

سید عابد علی عابد نے اقبال کے انسان کامل کی علامت درویش اور قلندر پر ان الفاظ کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے وضاحت کی ہے:

انسان کامل کے لیے اقبال درویش کی علامت بھی استعمال کرتے ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں درویش وہ ہے جو علائق دینوی سے بالکل کنارہ کر چکا ہو اور یوں خلوت گزیں ہو گیا ہو کہ کائنات سمٹ کر اس کے اندر سما گئی ہو...... درویشی اور قلندری انسانیت کی دو منزلوں کے نام ہیں...... قلندر

کے مقابلے میں اقبال کا درویش بے عمل تو نہیں لیکن کم عمل ضرور ہے، درویشی کے مرحلے پر اقبال طالب حقیقت کو تفکر کے مرحلوں سے گزارتا ہے۔قلندری عمل کا مقام ہے، درویش ہونے کی حیثیت سے طالب نے جو کچھ سوچا ہے، قلندر ہونے کی حیثیت سے اسے ایک شکل خارجی دیتا ہے۔[۲۱]

اقبال درویش، مردمومن، مردحق، مردتمام، خلیفہ اللہ فی الارض، فقیر وغیرہ قلندر کا رتبہ بلند تصور کرتے ہیں۔ اقبال نے اپنے لیے قلندر کا لقب بھی اختیار کیا ہے، جو ان کے درج ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے تو من تیرا نہ تن[۲۲]

خوش آ گئی ہے، جہاں کو قلندری میری
ورگرنہ شعر میرا کیا ہے۔ شاعری کیا ہے[۲۳]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی اسی علامت ''قلندر'' کو اپنے افسانے میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسے قلندر کی داستان ہے جو اپنے اندر قلندرانہ صفات رکھتا ہے اور مذہب وملت سے بالاتر ہو کر صرف اپنے آپ کو انسانیت کے لیے وقف کرنا اپنا نصب العین تصور کرتا ہے۔ اگر چہ وہ انفرادی سطح پر دکھ اور تکالیف برداشت کرنے کے باوجود قلندر کی مانند ہر چیز سے بے نیاز رہتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس افسانہ میں اقبال بخت سکسینہ کا کردار قلندرانہ صفات کے روپ میں پیش کیا ہے جو انھوں نے ''قلندرانہ صفات'' اور ''لفظ'' علامہ اقبال کے نظریات سے اخذ کیا ہے۔

یہ قلندر انسانیت پر یقین رکھنے والا انسانوں کا اس قدر نبض شناس ہے کہ وہ دکھی، جلاوطن، مالی طور پر یشان ہونے کے باوجود بھی ہر اک کی دلجوئی کرتا ہے اور فرشتہ رحمت دکھائی دیتا ہے۔ وہ دوسروں کی معمولی معمولی خواہشات کا احترام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور دوسروں کو خوش دیکھنا اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ وہ ہندو ہونے کے باوجود بھی لندن جا کر ایک مسلمان لڑکی کی دلجوئی کی خاطر اپنے آپ کو نہ صرف مسلمان بلکہ شیعہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ لڑکی اسلامی ملک کے سفیر کی بیٹی ہونے کے ناطے زبردست قسم کی اینٹی انڈین ہے اور ہمہ وقت ہندوستان کی برائیاں بیان کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اقبال بخت سکسینہ کا کردار جو قرۃ العین حیدر نے قلندر کے روپ میں پیش کیا ہے۔ کسی کی دل آزاری نہیں کرتا اور یہی علامہ اقبال قلندر کے متعلق نظریات رکھتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر انھی نظریات کو اقبال بخت سکسینہ سے ان الفاظ کے ساتھ بیان کرواتی ہیں:

بھئی اگر ہندوستان کو گالیاں دے کر اس کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے تو اس میں میرا کیا حرج ہے۔ اس کو اسی طرح شانتی ملتی ہے۔[۲۴]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک قلندر دوسروں کی خواہشات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے اور بقول اقبال ''خوش آ گئی ہے، جہاں کو قلندری میری'' پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے کہ دوسروں کو اس سے شانتی میسر ہو۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر قلندر کے روپ میں شانتی پہنچانے کی غرض سے طرح طرح کے کردار تبدیل کر کے یہ نصب العین حاصل کرتی ہے۔ یہ قلندر انسان شانتی کی تلاش میں دکھی انسانوں کو سکون دینے کے لیے فقیر بن جاتا ہے کیونکہ وہ ہر ایک کو دکھ اور پاپ میں ملوث دیکھنے کی بجائے سکھ اور شانتی کے ڈیرے پر دیکھنا چاہتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے بھی اقبال بخت سکسینہ کا یہی تصور ہوگا کہ دنیا جو شانتی کی تلاش میں دیوانی ہوگئی ہے، اب اگر اس بھیس میں دکھی آتماؤں کو تھوڑی سی شانتی مل جائے تو اس میں کیا حرج ہوگا۔ اس سلسلہ میں اقبال بخت سکسینہ کو گرو جی کے روپ میں گیتا کا درس دیتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔

اقبال بھائی۔ آپ نے اب کی بار اتنا لمبا چوڑا افراڈ کیوں کیا؟ تو وہ جواب دیتے۔ دیکھو منی...... دنیا شانتی کی تلاش میں دیوانی ہوگئی ہے۔ اب اگر میں اس بھیس میں چند دکھی آتماؤں کو تھوڑی سی شانتی دے سکتا ہوں تو اس میں میرا کیا حرج ہے؟[۲۵]

غازی

قرۃ العین حیدر نے ایک افسانہ یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے ۔ علامہ اقبال کی ایک نظم ''طارق کی دعا''، بال جبریل کے ایک شعر سے متاثر ہو کر تحریر کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس دعا میں ایک غازی کا مقصدِ حیات بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اسے تو صرف ذوق خدائی بخشا ہے جس بنا پر ان کی ہیبت سے پہاڑ، صحرا اور دریا ان کی ٹھوکر سے سمٹ کر رائی کا دانہ بن جاتے ہیں اور انھیں صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے لڑنا ہوتا ہے۔ انھیں نہ کسی ملک کی سلطنت اور نہ ہی کسی مال غنیمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہے بھی تو فقط انھیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہونے کی آرزو ہے مگر ان کی شہادت سے اہلِ عرب کو کب کامیابی نصیب ہوگئی۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ذوق خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی
خیاباں میں ہے، منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خون عرب سے[۲۶]

قرۃ العین حیدر نے اس افسانہ میں ''خون عرب'' کا ہیبت ناک منظر دکھا کر وقت کے اہم ترین موضوع کو زیر بحث لا کر عصری حسیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس افسانہ میں ایک فلسطینی دہشت گرد جو اپنے وطن کی آزادی کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس کی لرزہ خیز داستان محبت بیان کی ہے جو ایک روسی نژاد لڑکی سے منسلک ہے۔ یہ دونوں ایک یورپی ملک میں اتفاقاً ملتے ہیں اور محبت کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ فلسطینی کے متعلق آہستہ آہستہ اس کی محبوبہ کو تمام علم ہو جاتا ہے۔ تب تک وہ ایک جگہ بم نشانہ لگا کر مارتا ہے اور خود بھی ہلاک ہو جاتا ہے اور ایک مقصد پر اپنی جاں نثار کر کے موت کی آغوش میں سو جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے اس شعر

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی[۲۷]

کی روشنی میں بتانا چاہتی ہے۔ وہ جام شہادت تو پیتے ہیں مگر وہ بھی انسان ہیں اور انھیں بھی محبت کی شدید ضرورت ہے مگر قرۃ العین حیدر نے اس افسانہ میں فلسطینیوں کے متعلق گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے کہ کب تک اہل فلسطین پر اسرائیل ظلم وستم ڈھاتا رہے گا اور اس سلسلہ میں یہ خون عرب کب رنگ لائے گا۔ کیا واقعی منتظر لالہ کو خیاباں تہذیب میں اس خون سے قبا ملے گی؟ قرۃ العین حیدر اس قسم کے سوالات علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں ان الفاظ کے ساتھ کرتی ہے:

کتنے جذبات، تصورات، نظریے، خواب، کرب اندوہ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی۔ کافی کچھ جان جاننے کے باوجود منتظر لالہ کب سے کانٹا چمچے اور پلیٹ اٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی۔ قبا چاہیے۔ قبا چاہیے۔ اس کو خون عرب سے۔[۲۸]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے غازی سے بے حد مایوس اور افسردہ نظر آتی ہیں۔ انہیں اقبال کی مانند ان سے بے حد توقعات تھیں کہ یہ وہی غازی ہیں جن کے متعلق اقبال یوں کہا کرتے تھے:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ذوق خدائی

مگر یہ لوگ ''ذوق خدائی'' سے دلچسپی رکھنے کی بجائے عیاشیوں کا ساماں پیدا کرنے میں مصروف ہیں اور کاروبار سلطنت سنبھالنے کی اہلیت رکھنے کی بجائے امریکیوں کو کنٹریکٹ پر سب کچھ دے دیا ہے۔ اس عالم میں غازیوں کی صورت حال دیکھ کر وہ متعجب نظر آتی ہیں۔ جن کے متعلق علامہ اقبال کو کچھ اور ہی توقعات تھیں۔ ان کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں رقم طراز ہیں:

شہر کے دیسی حصہ سے باہر نکل کر دفعتاً ایک بے حد خوبصورت صاف شفاف اور شاداب مقام اسے نظر آتا ہے۔ جہاں خوبصورت عمارتیں اور کوٹھیوں کی قطاریں ہیں اور ہر پھاٹک پر ان گنت پیکارڈ اور نیش موٹریں کھڑی ہیں۔ اس آبادی کے گرد ایک اونچی سی چہار دیواری کھنچی ہے۔ جس کے سائے میں چھکڑے کھڑے ہیں اور اونٹ جگالی کر رہے ہیں اور سڑک پر دونوں طرف بے شمار دبلے پتلے رنگ برنگے انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے اونگھ رہے ہیں یا داڑھیوں میں انگلیاں پھر رہے ہیں یا حقہ پیتے پیتے آسمان کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب کون بے چارے ہیں اور سول لائینز ایسی آبادی کس کی ہے۔ وہ حیرت سے پوچھتی ہے۔ ہش پگلی۔ بے حد پُراسرار طریقے سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا ارشارہ کرتا ہے، انھیں بے چارے نہ، کہو۔ یہ سب غازی ہیں، ہم سب غازی ہیں۔ ہم نے اپنا سارا دنیاوی کاروبار امریکنوں کو کنٹریکٹ پر دے دیا ہے جو اس سامنے والی سول لائینز میں رہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حکومت بھی انھیں ٹھیکے پر دے دی ہے۔ ہم اطمینان سے اور فرصت سے بیٹھے ہیں۔ امریکن ہماری طرف سے حکومت کا انتظام کرتے ہیں اور ہم غازیوں کو فرصت مل گئی ہے تاکہ اور زیادہ غازی پیدا کر سکیں۔ [۲۹]

شاہین

علامہ اقبال نے مسلمانوں کے دلوں میں نورِ اسلام منور کرنے کی جدوجہد کی تو اسلامیانِ ہند ان کے کلام سے بہرہ اندوز ہو کر ان کے ہم نوا بن گئے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے اپنے کلام میں مختلف تشبیہات، تمثیلات اور علامات کی زبان میں آزادی و غلامی، قوت و شوکت اور ضعیفی کے رموز سمجھائے اور حصول آزادی اور شان و شوکت کے لیے رہبری کی۔ اقبال نے عظمت و قوت کے حصول کے لیے بحر و دریا، طوفان، سیل تندرو، پربت، کوہ، فولاد، شمشیر خنجر تیغ، ناوک، شاہین بچہ، شہباز اور شیر وغیرہ کی تشبیہات و علامات وضع کیں ہیں لیکن اس کے برعکس ضعف اور کمزوری اور حقارت کی گھناؤنی زندگی کی وضاحت کے لیے کرگس، روباہ اور زاغ وغیرہ سے تشبیہات پیدا کیں۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں مرد کامل کے لیے موثر علامات کا استعمال کیا ہے۔ جس میں

ایک علامت شاہین کی ہے۔اس سلسلہ میں سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

اقبال کے کلام میں انسان کامل کے لیے شاہین، مومن، قلندر اور درویش کے کلمات رمز کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اور یہ مختلف علامتیں استعمال کرنے کا منشا یہ ہے کہ انسان کامل کی ذات میں جو صفات مخفی و مستور ہیں۔ان کی ذہنی کیفیت و کمیت سے پڑھنے والوں کو آگاہی حاصل ہو جائے۔شاہین کہہ کر اقبال کامل انسان کے فقر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ اس فقر سے مراد ترک دنیا نہیں بلکہ وہ استغنا ہے جو دنیاوی جاہ وجلال اور دینوی خوف سے بے نیاز ہو کر طلب اور جستجو کی منزلیں طے کرتا ہے اور آخر تسخیر کائنات کے مقام پر پہنچتا ہے۔[۳۰]

علامہ اقبال سے قبل شاعری میں بہادری، بے باکی، جرأت اور شجاعت کے لیے شیر سے تشبیہ دی جاتی تھی لیکن اقبال نے قوت و عظمت کا پیغام دینے کی غرض سے شیر کی بجائے شاہین کو زیادہ بہتر تصور کیا ہے۔جس کے متعلق پروفیسر نذیر احمد نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

عربی، فارسی اور اردو شاعری میں قوت، دلیری، بےخوفی اور شجاعت کے لیے ہمیشہ ''شیر'' کی تشبیہ سے کام لیا گیا ہے۔لیکن اقبال نے ایسے مقام پر جواں مردوں کو شیر کی بجائے شاہین سے تشبیہ دینا بہتر سمجھا ہے اور قوت وشوکت کے مظہر کے طور پر شاہین یا شہباز کا ہی ذکر کیا ہے۔[۳۱]

علامہ اقبال شاہین کی علامتی حیثیت کے متعلق ظفر احمد صدیقی کو ایک خط میں تحریر کرتے ہوئے اس کی خصوصیات سے آگاہ کرتے ہیں۔

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں، اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے، تیز نگاہ ہے۔[۳۲]

قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں اقبال کے شاہین کی انھی صفات کا تذکرہ کیا ہے اور اسے اپنانے کے لیے اپنا نکتہ نظر بیان کرتے ہوئے قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ قوم ''مہاجر'' بن کر پاکستان آئی، یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارہ ملا مگر ایک مصیبت کا سامنا درپیش تھا، لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکے میں بنگالی، دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فرلڑیشن ہوا۔ لہٰذا ہر مہاجر نے ادابدا کر کراچی کا رخ کیا۔اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے۔[۳۳]

ان مہاجرین کی رہائش کا مسئلہ پاکستان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ان کی کالونیاں بنائی گئیں اور قرضہ حاصل کر کے بڑے بڑے، چھوٹے چھوٹے مکانات بنائے گئے اور بعض

لوگوں نے مکانوں اور زمینوں کے الاٹمنٹ کا روبار شروع کر کے بہت سی زمینیں اور مکانات بھی الاٹ کروالیے۔لوگوں نے بڑے خوبصورت بنگلے بنا کر ان میں معطر پودے لگائے اور ان کے نام بھی عجیب قسم کے رکھے جن میں ''خوابستان''، ''نسترن''، ''دولت''، ''شیم روک''، ''راج محل'' وغیرہ تھے۔[۳۴] لیکن غریب طبقہ کے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اور وہ در بدر کی ٹھوکریں کھا تے سڑکوں پر جن کی حوصلہ افزائی کے لیے قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار و نظریات کے حوالے سے ذکر ان الفاظ میں کرتی ہے:

ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہین بنا تا نہیں آشیانہ۔[۳۵]

علامہ اقبال شاہین کو ایک بلند پرواز، بے نیاز، تیز نگاہ، خلوت نشین اور غیرت مند پرندے کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں۔اقبال کے نزدیک یہی صفات ایک مرد مومن کی ہیں، انھی صفات کا پرتو وہ نوجوانوں میں دیکھنے کے خواہاں ہیں تا کہ وہ معاشرے کے مفید شہری بن سکیں۔اقبال کی نظر میں شاہین کے علاوہ کسی اور پرندے میں یہ خصوصیات موجود نہیں لہٰذا وہ نوجوانوں کے لیے شا ہین کو قابل تقلید نمونہ تصور کرتے ہیں۔اقبال کے علاوہ کسی اور اردو شاعر نے شاہین کو اس پہلو کی نظر سے نہیں دیکھا جو اقبال کو شاہین کی ذات میں وسعت نظر، دور بینی، بلند پروازی، خودداری، بے نیازی، درویشی، تیزی اور قوت کی صفات نظر آئیں۔

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں[۳۶]

اقبال ان صفات کو قوم کے بچوں اور نوجوانوں میں جلوہ گر دیکھنے کے متمنی ہیں۔اس سلسلہ میں ''شاہین'' کے عنوان سے بال جبریل میں ایک نظم بھی تحریر کی۔اقبال شاہین کی بلند پروازی کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ یہ اس کے عزائم کو نئے نئے امکانات سے روشناس کرتی ہے اور وہ شاہین کی اس خوبی کو مرد مومن میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے بعینہ انھی صفات کو عملی جامہ پہنا کر دکھایا ہے اور نوجوان نسل کو شاہین کی مانند ہواؤں میں اُڑتے ہوئے دکھا رہی ہے اور اس بلند پروازی میں صرف مرد ہی حصے نہیں لے رہے بلکہ نئی نسل کی خواتین بھی بڑھ چڑھ کر شریک ہو رہی ہیں اور اپنے اندر اقبال کے شاہین کی صفات پیدا کر رہی ہیں جنھیں علامہ اقبال ایک مرد مومن میں دیکھنا چاہتے تھے۔اس سلسلہ میں

قرۃ العین حیدر اپنے خاندان کی ایک فلائیٹ لیفٹیننٹ ڈاکٹر نور افشاں زیدی کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے فخریہ انداز میں بتاتی ہے:

بو ر صدیقی سیدھا فلائینگ آفیسر زیدی کے پتے پر ماری پور پہنچا۔ بلاک نمبر ۶ معلوم ہوا۔ تمام صاحبان جو ہیں وہ ہاکس بے تشریف لے گئے ہیں۔ اسی ٹیکسی پر براہ راست یہاں حاضر ہو رہا ہوں......''اسلام علیکم'' اب وہ عاصم (زیدی) کی طرف متوجہ ہوئے'' تو میاں آپ جو ہیں آپ فلائینگ آفیسر ہو گئے مبارک ہو''۔ عاصم سے گرمجوشی سے مصافحہ۔ پھر بولے۔'' تو شاہین ہے پرواز ہے......'' معاف کیجیے گا قطع کلام ہوتا ہے......'' عاصم نے کہا۔'' فلائینگ آفیسر زیدی وہ سامنے کھڑی نٹنگ کر رہی ہیں''۔ بو ر صدیقی نے نور افشاں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔[۳۷]

کلام اقبال میں شاہین ایک مثالی کردار کی حیثیت رکھتا ہے، جو نوجوانانِ قوم کے لیے راہ ہدایت تجویز کرتا ہے۔ اقبال ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کو شاہین بچے کہہ کر پکارتا ہے اور ان میں شاہین کی صفات کا متلاشی نظر آتا ہے مگر شومئی قسمت سے ان کی مناسب تعلیم و تربیت کا بندوبست نہیں کیا جاتا۔ جس سبب سے ان کا دماغ کند ہو جاتا ہے اور اقبال موجودہ تعلیم کو نوجوانوں کے لیے ناکارہ تصور کرتے ہیں کیونکہ یہ تعلیم نفی خودی کی طرف راغب کرتی ہے اور بلند و اعلیٰ کردار کے حامل انسان پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ جس بنا پر اقبال بچوں کو خودی کے احساس سے عاری دیکھتے ہوئے ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کر دے[۳۸]

علامہ اقبال یہ جان کر شدت سے غم محسوس کرتے ہیں کہ جدید تعلیم اور مغربی تہذیب ہمارے نوجوانوں کو بے راہروی، مذہب دشمن، بزدل اور غلام بنا رہی ہے۔ اس کا اصل سبب وہ غلامانہ نظام تعلیم کو ہی ٹھہراتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ارباب تعلیم کا گلہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا[۳۹]

علامہ اقبال کے جدید اور مغربی تہذیب کے رویہ کے متعلق گہرے دکھ اور رنج کو دیکھ کر قرۃ العین حیدر کو بھی سخت افسوس ہوا۔ وہ بھی علامہ اقبال کی مانند ارباب تعلیم کو ہی قصوروار ٹھہراتی

ہے جو قوم کے نونہالوں کے لیے مناسب نصاب تعلیم مہیا کرنے کی بجائے اسلحہ مہیا کرتے ہیں۔ جس کے سبب قرۃ العین حیدر کو قوم کے نوجوانوں کی قسمت پر گھرے دکھ والم کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ اس نونہالوں کو اقبال کے شاہین اور مردمومن کے روپ میں دیکھنے کی بجائے دہشت گرد دیکھتی ہے۔اس سلسلہ میں وہ بھی اقبال کی مانند ارباب تعلیم سے شکوہ کرتی ہے جو درحقیقت غریب بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ہی نہیں چاہتے اور مختلف حیلے بہانے بناتے رہتے ہیں۔

(الف)۔ ہمارے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تعلیم بیکار ہے۔

(ب)۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں ہمیں کتابوں کی بجائے بندوقوں کی زیادہ ضرورت ہے،قوم کے نونہالوں کو کتابوں کی جگہ بندوقیں دو تاکہ مجاہد بنیں......مردمومن،شاہین۔[۴۰]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے بیٹے جاوید اقبال کو بھی شاہین بچہ کہہ کر اس کی تعلیمی و ادبی مصروفیات کا تذکرہ کیا ہے کہ انھیں بھی ادب سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں حالانکہ علامہ اقبال ان کے متعلق بے حد متفکر رہتے تھے مگر نظام تعلیم کے سبب ان پر کوئی خاص اسلامی اثرات نہیں ہوئے۔ جن کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں انکشاف کرتی ہے:

> اسلامی نظریاتی قدامت پرستی سے قطع نظر جاوید خود بہت جدید ذہن کے آدمی تھے۔نہایت جدید ترین تکنیک کے افسانے سویرا (لاہور) میں لکھے تھے۔بعد میں اس شاہین بچے کی طبیعت ادب سے ہٹ گئی،آج کل کہا جارہا ہے،کہ جدید افسانے صرف پچھلے سال میں لکھے گئے ہیں۔[۴۱]

لالہ

کلام اقبال میں پھولوں کا تذکرہ وافر تعداد میں ملتا ہے جن میں نرگس،گلاب،نسترن،سوسن اور لالہ کنایہ ومجاز کی صورت میں تحریر کیا گیا ہے اور علامہ اقبال نے انھیں بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری[۴۲]

ان تمام پھولوں کے متعلق اگر کلام اقبال کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اقبال کی ''لالہ'' اور ''لالہ صحرا'' سے بے حد محبت وانس دکھائی دیتی ہے۔

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن[۴۳]

اقبال نے اپنے کلام میں پھول سے تشبیہات بھی پیدا کیں ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں اور

پھول کو انھوں نے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جو کسی اور شاعر کے دام خیال میں نہ آسکا۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن[۴۴]

اقبال نے اپنے کلام میں ''لالہ'' کو بانگ درا کے دوسرے حصے (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء) میں ایک زندہ علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ دوسرے حصے کی پہلی نظم ''محبت'' میں ''لالہ'' کا ذکر اس انداز میں کیا ہے۔

خرام ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے[۴۵]

علامہ اقبال نے جہاں بھی کہیں مسلماں کے محاسن کا ذکر علائم و رموز میں کیا ہے۔ لالے کے پھول کو نہیں بھولے۔ اس سلسلہ میں ان کی نظم ''مرد مسلمان'' واضح ثبوت پیش کرتی ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان[۴۶]

درحقیقت اقبال کی نظر میں ثقافتِ اسلامی کا منبع عرب ہی ہے اور امت مسلمہ کو صحت مندانہ اور جاندار افکار کے لیے اسی سرچشمے کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس کی تہذیب احیا کے لیے منتظر ہے۔

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے[۴۷]

قرۃ العین حیدر نے اپنے سوانحی ناول کار جہاں دراز ہے میں علامہ اقبال کے گلِ لالہ کا تذکرہ ایک باب بعنوان ''پھر چراغ لالہ...... مالکونس'' کے عنوان سے کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کو ایک بار کوئٹہ میں اپنے رشتہ کے ماموں میجر آل حسنین کے پاس جانے کا اتفاق ہوا اور کوئٹہ کے کوہ و دامن اور پھول دیکھ کر علامہ اقبال کی بال جبریل کی غزل نمبرے بے ساختہ یاد آ گئی۔ جس کا تذکرہ وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

پھر چراغ لالہ سے......روشن ہوئے......کوئٹہ چھاؤنی میں میجر آل حسنین کا وسیع باغ نیلے نیلے

اودے اودے۔ پیلے پیلے پھولوں سے معمور--- تھا۔ اور بادام کے اشجار اور انگور کی بیلیں۔
چند امّمانی انگور کا سرکہ بنانے میں مصروف۔ کوہ ودمن......روشن ہوئے۔ سرخ پہاڑوں پر دھوپ۔
ایرانی بلوچستان سے سرد ہواؤں کے ریلے۔ مجھ کو پھر نغموں پہ...... [۴۸]

قرۃ العین حیدر ''گل لالہ'' سے بے حد متاثر نظر آتی ہیں اور اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کی اسی غزل کا باقاعدہ موسیقی کے ساتھ اپنی کزن نورافشاں کے ہمراہ کمپوزنگ کے ساتھ گنگناتی ہیں اور مالکونس میں باقاعدہ کلام اقبال سنانے کے لیے ریہرسل کر رہی ہیں۔

اچھا اب ہم مالکونس میں کلام اقبال سنائیں گے......پھر چراآغ لالہ سے اے رواوش ہوئے اے۔
کوہوادامن۔اا آ آ آ۔ میں تان لگاتی۔ پھول ہیں......صحرا میں یوں۔ پریاں قطار اندر قطار۔ [۴۹]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی تشبیہات واستعارات جو اپنی مثال آپ ہیں انھیں بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے استعمال کیا ہے جو کسی اور شاعر یا ادیب کے دام خیال میں نہ آسکی۔ قرۃ العین حیدر کوئٹہ میں ایران کی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوئی جب انھوں نے وہاں ایرانی قالین پر بیل بوٹے، اشعار اور گل لالہ کی تصاویر دیکھیں تو اسے اپنے آباؤ اجداد یاد آ گئے۔ جنھوں نے ایرانی قالین جمع کر کے ایک خوبصورت دنیا قائم کر رکھی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ سب سے زیادہ گل لالہ سے متاثر نظر آتی ہیں اور اہل ایران کے فن کی داد دیتی ہیں۔

ایرانی قالین کی کائنات، گل بوٹے، اشعار، چنار کے پتے، گل لالہ، سرو وصنوبر، پویلین، آبجو، پرند، شجر حیات، کمرے کی چاروں دیواروں تک پھیلی نرم وگرم۔ رنگ برنگی نشاط آگیں پُرتکلف محدود دنیا ___ ماموں کو ایرانی قالین جمع کرنے کا شوق ہے۔ ایران سے لا لا کر ڈھیروں قالین مراد آباد میں جمع کر ڈالے۔ اب یہاں۔ ان کے تایا میر نذر الباقر نے بھی بہت قالین جمع کیے تھے۔ [۵۰]

اقبال کو گل لالہ دیکھ کر تہذیب حجازی کا منظر یاد آتا ہے کیونکہ انھیں امت محمدی ﷺ کی تمام مشابہت اس میں نظر آتی ہیں اور وہ امت محمدی ﷺ کے اس نشان میں دقیق سے دقیق معانی کے وسیلہ سے خلافت راشدہ کے نظام کے خواہاں ہیں۔ اقبال کے نزدیک ''لالہ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیب حجاز'' سے عرب کی مخصوص ثقافت کی علامت تصور کرتے ہیں۔ وہ ثقافت اسلامی کا اصل منبع عرب ہی سمجھتے ہیں جس سے امت مسلمہ کو صحت منداور جاندار افکار میسر آتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس قرۃ العین حیدر پر شیعہ مسلک کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور وہ اس سطح پر ایران کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتی اور وہ اہل تشیع ہونے کے ناطے اپنا تعلق ایران سے ظاہر کرتی ہیں۔

چندا ممانی۔۔سر اٹھا کر پہاڑوں کی سمت دیکھتی ہیں۔ یہاں سے زاہدان، زاہدان سے مشہد۔ انشا اللہ، محرم کرنے اب کی بار مشہد جاؤں گی۔" یہاں سے زہدان۔ زہدان سے تاشقند۔ میں اور سیلویا انگور کی بیل کے پیچھے چھپ کر خفیہ سازش کر رہے ہیں۔ بس ان پہاڑوں کے پیچھے چھپ کر ہٹ اینڈ رن۔ ہٹ اینڈ رن۔ لیکن سلو جو اچھو کی طرح بہت پریکٹیکل مزاج رکھتی تھیں۔ دفعتاً چونک کر کہتیں لیکن وہاں سردی میں ہوگیا نمونیہ......'' ماموں اور اماں کے بزرگ سنا ہے۔ مشہد و نیشا پور سے آئے تھے۔ جہاں وہ روضہ امام رضا کے کلید بردار تھے۔ کلید کس کے پاس ہے۔ کسی کے پاس نہیں۔ لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب۔ [۵۱]

قرۃ العین حیدر کے ذہن میں ایران کا تعلق سما چکا ہے۔ جو بار بار اسے ستاتا ہے لیکن وہ موسم کی زیادتی اور حالات کے پیش نظر ایران میں جانے سے قاصر ہے مگر وہ ماموں کے پاس ایران منگوائی ہوئی کار دیکھ کر پھر بے تاب ہو جاتی ہے اور وہ اقبال کے اس شعر کو پھر گنگنانے لگتی ہے۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن [۵۲]

جس کا اظہار قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں کرتی ہے:

اُکسانے لگا مرغ چمن...... پھر مجھ کو نغموں پہ۔ ماموں وردی پہن کر دفتر روانہ ہو جاتے ہیں۔ کار روانہ ہونے کی آواز آتی۔ دوسرے موٹر خانے میں ماموں کی شیو کھڑی تھیں جو ابھوں نے تہران سے براہ زاہدان واپس آ کر حسنین ماموں کے ہاں رکھ دی تھی۔ [۵۳]

قرۃ العین حیدر نے ایران کے شہر تہران کے حسن و خوبصورتی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ شہر کی سڑکوں پر دونوں طرف پھول ہی پھول اور صنوبر و شمشاد کے درخت کھڑے تھے جنھیں دیکھ کر طبیعت اس قدر خوش ہوتی تھی جیسے جگر میں ٹھنڈک پیدا ہو گئی ہو۔ قرۃ العین حیدر اس سلسلہ میں بھی وضاحت کے لیے علامہ اقبال کے اشعار سے حوالہ دیتی ہے۔

سڑکوں پر دورویہ صنوبر و شمشاد قطاریں، جس سے جگر لالہ میں پیدا ہو وہ ٹھنڈک۔ [۵۴]

شبنم

علامہ اقبال نے جہاں پھول کا تذکرہ کیا ہے وہاں شبنم کا بھی ذکر کیا ہے جو حسن کے نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک پھول تہذیبِ حجاز کی علامت ہے اور شبنم تہذیب اسلامی کے طور پر حسنِ اخلاق کا نمایاں وصف کے لیے بیان ہے۔ پھول کے حسن کو

شبنم ہی نکھارتی ہے۔عموماً شبنم کو آنسو کے قطرے یا موتی سے تشبیہ دے گئی ہے اور آنسو کو شبنم سے تشبیہ دیتے اور آنسو بہانے کو شبنم افشانی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا غزل میں اقبال نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن [۵۵]

قرۃ العین حیدر نے تہذیب ایران کوئٹہ میں بیٹھ کر محسوس کی ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اسلام بالخصوص اہل تشیع ایران کے ذریعے داخل ہوا۔اسی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ پھولوں پر شبنم کا ذکر کرتی ہے کہ اس کائنات کو نکھارنے میں جہاں گل موجود ہے وہاں شبنم اور سورج کی کرنوں کا بھی کردار موجود ہے۔قرۃ العین حیدر اقبال کے نقطہ نظر کو آگے پھیلانے میں گل، شبنم اور سورج کی کرنوں کی تشبیہات وعلامات کا ذکر انھی الفاظ میں کرتی ہیں:

صبح کو پھولوں کی شبنم پر سورج کی کرنیں پڑیں۔کتب خانہ گل کے ایک ایک حرف کی وضاحت...... اس وقت قالین میں بُنے ''شجر حیات'' کے پھول پتے تیز برقی روشنی میں بہت روشن نظر آرہے تھے اور زندگی کا تانا بانا حیرت انگیز تھا۔اب گلاب کے پھولوں پر شبنم کے قطرے منجمد ہو جاتے تھے۔ (اس موتی پہ سورج کی کرن)۔[۵۶]

علامہ اقبال نے شبنم کی ایک نئی تشبیہ پیدا کی ہے جو اس سے قبل اردو شعرا کے ہاں نہیں ملتی۔ یہ تشبیہ اپنی مثال آپ ہے۔اس کے متعلق پروفیسر نذیر احمد ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

شبنم سے اقبال نے ایک نئی تشبیہ پیدا کی ہے، غنچہ کھل کر پھول بنتا ہے تو اس شگفتگی کے عالم تک پہنچانے والی دو قوتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ایک شبنم، دوسری نسیم سحر، مسلمانوں کے نونہال بھی غنچوں کی مانند ہیں۔ان کی صحیح تربیت کے لیے، ان کو کھلا کر پھول بنانے کے لیے، بھی دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ایک علم اور دوسری قوت دین ہے۔ایک شبنم ہے تو دوسری نسیم سحر۔ چنانچہ ضرب کلیم میں ''علم اور دین'' کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں فرماتے ہیں۔

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرہ شبنم اگر شریک نسیم [۵۷]

قرۃ العین حیدر نے بھی قوم کے نونہالوں کی قسمت پر گہرے دکھ اور تشویش کا اظہار کرتے ہوئے علامہ اقبال کی طرح ان کے گلاب جیسے رخساروں پر آنسوؤں کو شبنم سے تشبیہ دی ہے۔وہ جنوری ۱۹۵۰ء کی سرد ہواؤں کا ذکر کرتے ہوئے معصوم اور نونہال بچوں کا ذکر بھی کرتی ہے۔وہ مکتب

میں تعلیم حاصل کرنے کی بجائے التجائی نظروں کے ساتھ ایک امید لیے چائے خانے آتے ہیں۔

اب گلاب کے پھولوں پر شبنم کے قطرے منجمد ہو جاتے تھے۔(اس موتی پہ سورج کی کرن)......اور شہر کے بازاروں میں چیتھڑے لپیٹے سرخ گالوں والے پُر امید بچے چاہ خانوں کے سامنے جمع ہوئے اور جنوری ۱۹۵۰ء میں ایرانی بلوچستان سے سرد ہواؤں کے ریلے بہتے ہوئے آکر چلتان کے پہاڑوں سے ٹکرائے اور برف پڑی تو۔[۵۸]

ستارہ

کلام اقبال آسمان یا عرش کی ہر قسم کی بلندی ظاہر کرنے کے لیے بھرا ہوا ہے۔جس کے لیے علامہ اقبال نے سورج ، چاند اور ستارے سے تشبیہات دی ہیں۔اس سلسلہ میں اقبال کو عالم افلاک میں تارے سے سب سے زیادہ دل بستگی ہے،تارے کی معمولی سی تابنا کی اپنی ہستی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔جس بنا پر علامہ اقبال تارے سے متاثر نظر آتے ہیں۔اسی لیے مفرد اشیاء میں تارا ہی شاید وہ خوش نصیب شے ہے۔جسے انھوں نے بار بار اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور طرح طرح کے تصورات ساتھ مضمون سمجھائے ہیں۔وہ کبھی تاروں کی انجمن کی دل فریبی سے متاثر ہوتے ہیں اور کبھی اس کے چمک کر ڈوب جانے سے مغموم ہوتے ہیں۔کبھی اسے اپنا ہم سفر تصور کرتے ہیں۔اس کی تنک تابی،اس کی عارضی نمود،اس کی انفرادیت،غرض تارے سے متعلق ہر قسم کے تصورات کلام اقبال میں ملتے ہیں۔گویا انھیں تارے میں اپنی ہی شخصیت کا اثر نظر آتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی مندرجہ بالا تمام باتوں کی پیروی کرتے ہوئے سیاروں اور ستاروں تک رسائی حاصل کی ہے اور اسے وہاں کی ذہین مخلوق کے پڑھنے اور بولنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا ایک نیلے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اڑاتا ہوا بہت دور افق کی تنہائیوں میں کھو گیا۔خاموش ستاروں اور دھندلی کہکشاں کے روپیلی راستوں سے پرے......بہت دور سے ایک مدھم آواز آہستہ آہستہ آرہی تھی۔[۵۹]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کے اسی ستارے سے بے حد متاثر ہوئیں اور انھوں نے اپنے افسانوی مجموعہ کی پہلی تصنیف کا نام بھی ستاروں سے آگے علامہ اقبال کے اس شعر سے متاثر ہو کر رکھا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں[۶۰]

اسی تصنیف میں قرۃ العین حیدر نے تین افسانوں کے نام بھی اقبال کے ستاروں سے متاثر

ہو کر تجویز کیے ہیں جن میں سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا، ٹوٹتے تارے اور ستاروں سے آگے ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ بھی قرۃ العین حیدر کے ہاں ستارے کا تذکرہ ملتا ہے۔ انھیں علامہ اقبال کی مانند اجرام فلکی سے ان کی حرکت کی بنا پر گہری دلچسپی ہے اور وہ ان کی طرح اجرام فلکی سے گہری وابستگی رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں چاند ستاروں اور فلکیات سے متعلق گیت بالخصوص علامہ اقبال کی ایک نظم ''محبت'' بے حد پسند ہے۔ جسے وہ بڑی پسندیدگی سے سنتی ہیں۔

> اور چاند کے سائے میں گیت گاتی ہوئی شامیں گزرتی چلی گئیں۔ پچھلی کوٹھی کے ہمارے کمرے کی سنگھار کمرے کی سمت والے سائیڈ روم میں وائلن بجتا اور صبیحہ پڑھتے پڑھتے کتابوں پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی سرو اور چنار کے پتوں کی سرسراہٹ میں سے اس کے پسندیدہ گیتوں کی آواز خواب میں کہیں پریوں کے ملک سے آتی ہوئی معلوم ہوتی۔ سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا۔[۶۱]

قرۃ العین حیدر کے ہاں عالم بالا کے متعلق ایک عجیب تجسس نظر آتا ہے اور وہ اقبال کی اس نظم کو بار بار سننے کی متمنی ہیں اور وہ التجائی لہجے میں اپنے احباب سے اس کے سنانے کے متعلق ان الفاظ میں کہتی ہیں۔

> آصف: اگر تم اترا نہ جاؤ تو تم سے کچھ نغمہ سرائی کی درخواست کی جائے، شکیلہ نے کہا۔ ''وعدہ کرتا ہوں قطعی نہیں اتراؤں گا۔ بے حد عمدہ موڈ ہو رہی ہے۔'' اس نے جواب دیا ''وہی عالم بالا والا'' صبیحہ نے کہا''۔[۶۲]

اقبال درحقیقت روشن اور چمکدار اشیا کو پسند کرتے ہیں جس بنا پر انھیں جگنو، جواہرات اور ستارے میں گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر ان کے نزدیک ستارہ انسانی زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔ اقبال کو آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے، زمین پہ بستے ہوئے انسانوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ ستاروں کی باہمی کشش ہی ان کی بقا کا باعث ہے۔ ستاروں کا سفر دائمی ہے وہ حرکت کرتے رہتے ہیں اور یہی حرکت ہی ان کے وجود کی ضمانت دیتی ہے۔ یہی کیفیت انسانی زندگی کی بھی ہے اور اقبال بھی انسان کو یہی درس دینے کے خواہاں ہیں۔ وہ ستارے کی عارضی نمود کو انسان کی عارضی زندگی سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔

علامہ اقبال کی نظم ''چاند اور تارے'' میں جب ستارے چاند سے اپنے ہر دم سفر میں مبتلا رہنے کی شکایت کرتے ہیں اور چاند سے استفسار کرتے ہیں کہ کیا یہ سفر کبھی ختم ہوگا یا نہیں اور ہمیں منزل کبھی نظر آئے گی یا نہیں۔

کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا، چلنا، مدام چلنا
ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا[۶۳]

علامہ اقبال کے انھی نظریات سے قرۃ العین حیدر اتفاق رائے رکھتی ہیں اور وہ ستاروں کے ہمیشہ سفر کو زندگی کی علامت تصور کرتی ہے مگر ایک نوجوان شاعر کیپٹن عثمان قرۃ العین حیدر کو اپنے مجموعہ کلام ''چھپر'' میں سے ایک خوبصورت نظم سناتا ہے۔ ''عرض کرتا ہوں کہ...... مجھ کو منظور نہیں چاند ستاروں کا سفر'' جسے سن کر وہ وقتی طور پر ہاں میں ہاں ملا دیتی ہے لیکن وہ علامہ اقبال کے افکار سے مکمل طور پر متفق ہے۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

عثمان، عثمان، سچ مچ میں بہت تھک گئی ہوں، سچ مجھے منظور نہیں چاند ستاروں کے سفر بالکل سچ، مجھے منظور نہیں، میں نے صاف جھوٹ بولا تھا کہ مجھے ان سایہ دار۔ خاموش، سکون بخش راستوں، اس سوتی ہوئی موسیقی۔ اس تیسرے درجے کی پٹی ہوئی رومان پرستی سے شدید نفرت ہے۔[۶۴]

علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ستارہ'' میں ذکر کیا ہے کہ ستارہ، صبح اور چاند سے خائف نظر آتا ہے تو اقبال اس سے استفسار کرتے ہیں۔ تجھے حسن کے انجام کی خبر مل گئی ہوگی یا اپنے متاع نور کے چھننے کا خوف ہوگا؟ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تیری ننھی سی جان کیوں تمام رات کپکپاتے ہوئے بسر کرتی ہے۔ علامہ اقبال کے ان سوالات کا جواب ستارہ نہیں دیتا تو وہ خود ہی ستارہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ قانون قدرت ہے کہ ایک کی فنا اور دوسرے کی بقا ہے۔ دنیا میں محض تغیر ہی تغیر ہے اور سکون نام کی کوئی چیز قدرت کے کارخانے میں موجود نہیں۔ علامہ اقبال در حقیقت ستارے سے مخاطب ہو کر انسانی زندگی کے اسرار سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ جس کا اظہار وہ ان اشعار میں یوں کرتے ہیں:

چمکنے والے مسافر، عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے، دوسرے کی پستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے، زمانے میں[۶۵]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے انھی افکار ''جو اوج ایک کا ہے، دوسرے کی پستی ہے۔'' کی وضاحت اپنے ایک افسانے ''ٹوٹتے تارے'' میں کی ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں قرۃ العین

حیدر نے بالائی طبقے کی ذہنیت اور رویے کی عکاسی کی ہے۔ جس میں زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے دوراہا قرار دیا ہے۔ جس میں ہمہ وقت نشیب وفراز آتے ہیں۔ زندگی کسی کے لیے المیہ اور کسی کے لیے طربیہ ڈرامے کی مانند ہے۔ وہ زندگی کے نشیب وفراز کا تعین ان الفاظ میں کرتی ہے:

نیلوفر اور نرگس کے شگوفوں سے گھرا ہوا راستہ اسی طرح طے ہوتا رہا ہے لیکن اگر منزلیں مختلف نہ ہوتیں تو ستاروں کی راہوں کا یقین کیسے آتا۔[۶۶]

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں دو طبقات کا موازنہ کرتے ہوئے عروج وزوال کی بہترین عکاسی کی ہے۔ رخشندہ جس کا تعلق نچلے طبقے سے ہے اور شاہینہ جو بالائی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ بالائی طبقہ کی لڑکیاں اپنی دولت کے سبب متوسط طبقہ کی لڑکیوں پر کس طرح سبقت لے جاتی ہیں۔ حالانکہ اسلم رخشندہ میں دلچسپی لیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود شاہینہ اسلم کی منگیتر بن جاتی ہے لیکن اسلم اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا کیونکہ وہ ایک نائٹ گرل ہے۔ دوسری جانب شاہینہ کمل کے ہاتھوں میں دل دے بیٹھتی ہے مگر کمل کا تعلق نچلے طبقے سے تھا جس بنا پر وہ اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ شاہینہ اسلم سے دریافت کرتی ہے کہ تم میرے ساتھ خوش رہ سکو گے تو وہ کہتا ہے کوشش کروں گا لیکن یکلخت اسے خیال آتا ہے کہ شاہینہ اور اس کے اہل خانہ کا رویہ رخشندہ کے ساتھ کیسا تھا؟ یہ یاد کر کے اسے بالائی طبقے سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

اسلم یکایک نہایت تلخی سے بولا! ''مجھے تم سے نفرت ہے تمھارے گھر والوں سے نفرت ہے۔ سچ کہتا ہوں مجھے اس دن سے تم سے سخت نفرت ہے جب میں نے پہلی مرتبہ بچپن میں تم کو رخشندہ کے ساتھ ایک خادمہ کا سا برتاؤ کرتے دیکھا تھا۔[۶۷]

اقبال نے ''بزم انجم'' میں ستاروں سے کہا ہے کہ اہل زمیں کو اپنے نغمہ وسرور چھیڑ کر انھیں جگا دو کیونکہ وہ تمھیں اپنی قسمتوں کے آئینے تصور کرتے ہیں اور تمھاری بات مانتے ہیں۔

چھیڑو سرود ایسا، جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تاب جبیں تمھاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہل زمین تمھاری[۶۸]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے انھی افکار کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے کہ لوگ ستاروں میں اپنی قسمت کا حال دیکھتے ہیں۔ ریٹا نامی لڑکی سے کیپٹن عثمان اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے صبح صبح دریچے میں کھڑے ہو کر بے فکری اور بے نیازی کے عالم میں سیٹی

بجاتا ہے جس سے ریٹا کی آنکھ کھل جاتی ہے مگر ریٹا کو اس کی سیٹی کا جواب دینے کی بجائے نیند پیاری ہے اور وہ کاہلی اور سستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کروٹ بدل کر اپنی قسمت کا حال ستاروں پر چھوڑ دیتی ہے اور نیند کا دوبارہ سلسلہ شروع کر دیتی ہے جہاں سے نیند کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ بقول قرۃ العین حیدر:

اس وقت ریٹا میری بہن کی آنکھ کھل جاتی ہے اور چند لمحوں تک اپنی بڑی بڑی سبز آنکھیں کاہلی سے جھپکانے کے بعد وہ دوسری کروٹ لے کر خوابوں کے نقرئی تار کو وہیں سے ملا دیتی ہے جہاں سے کیپٹن صاحب کی سیٹی نے اسے توڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں مجھے تاروں کی چھاؤں میں جنم لینے والے سپنے ہمیشہ خوش گوار اور سچے ثابت ہوتے ہیں۔[۶۹]

قرۃ العین حیدر دیگر افراد کی مانند بعض اوقات تصور کرتی ہے کہ واقعی یہ مدھم ستارے ہماری قسمت کی راہوں میں روشن ہوتے ہیں یعنی جس کی قسمت بہتر ہوتی ہے ان کے ستارے زیادہ روشن ہوتے ہیں جن کی قسمت میں عمر بھر کا رونا لکھا ہوتا ہے ان کی قسمت کی راہوں یہ مدھم ستارے روشن ہوتے ہیں۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہے:

کیا سچ مچ یہ مدھم تارے ہماری قسمتوں کی اکیلی راہوں پر جھلملاتے ہیں۔ صبیحہ نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔[۷۰]

علامہ اقبال اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ستارے یہ نیلگوں آسمان اور رات کو چمکتی ہوئی کہکشاں یہ تمام خود آدم خاکی کے عروج کے خواہاں ہیں جسے جنت سے نکالا گیا تھا۔ وہ اب دوبارہ جنت اور عظمتِ انسان کے حصول کے لیے عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں لیکن کم ہمت انسان ستاروں سے اپنی قسمت وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اقبال اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک[۷۱]

لیکن علامہ اقبال نے قسمت کا حال اپنے نالہ بیباک میں قرار دیتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ قسمت نہ ستاروں کی پابند اور نہ ہی گردش افلاک میں ہے۔

نہ ستارے میں ہے، نے گردش افلاک میں ہے
تیری تقدیر میرے نالہ بے باک میں ہے[۷۲]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی مانند قسمت کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ ستارے تو خود مرد کامل کے تابع ہیں بلکہ پوری کائنات اس کے مطیع ہے اور ستارے بھلا کیسے مرد کامل کی قسمت کا احوال بتا سکتے ہیں وہ تو خود مرد کامل کے ساتھ دکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ جب

کوئی مرد کامل پریشان ہو کر آہ وزاری اور نالہ غم سناتا ہے تو وہ بھی جھلملا اٹھتے ہیں۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

ایک مرتبہ عثمان صاحب کیرم میں ہارتے ہارتے جوش میں آ کر گانے لگے ''ستارے جھلملا اٹھتے ہیں جب میں شب کو روتا ہوں۔'' [۳]

علامہ اقبال تمام کائنات کو سرِ شام خاموش اور پرسکون دیکھتے ہیں مگر ستارے اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ گویا وہ اپنی تقدیر خود عمل پیہم کے ذریعے بناتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی نظم ''ایک شام'' میں یوں ارشاد کرتے ہیں:

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ ودشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا [۴]

قرۃ العین حیدر بھی ستاروں کی گردش رواں کی قائل ہے بے شک رات کو تمام کائنات خاموشی اختیار کر لیتی ہے مگر اسے بھی علامہ اقبال کی طرح ستاروں کی گردش ہی پسند ہے اور اسے زندگی کی علامت تصور کرتی ہے۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہے:

فضا خاموشی تھی...... دور آسمان کی نیلگوں بلندیوں میں چند چھوٹے چھوٹے روپہلے ستارے جگمگا کر دھندلکے میں کھو گئے۔ [۵]

''بزم انجم'' نظم میں جب علامہ اقبال نے اہل زمیں کو جگانے کی التماس کی تھی تب فوراً یہی التماس سن کر آسمان کی فضا تاروں کی آواز سے گونج اٹھتی ہے اور وہ متفق ہو کر انسان کو درس حیات دیتے ہیں۔

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواداری سے
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمیں والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں[۷۶]

علامہ اقبال نے جو نکتہ تاروں کی زندگی میں پوشیدہ بتایا ہے وہ انسانی زندگی کی رمز بھی ہے۔ستاروں کے وجود اور گردش سے جذبِ باہمی اور حرکت جیسی اقدار ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ''بزم انجم'' میں ستاروں کی ہم آہنگ حرکت درحقیقت انسانی زندگی کی مشترکہ جدوجہد کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔لہٰذا ان کا جذب باہمی انسانی معاشرے کو اخوت و محبت کا درس دیتا ہے۔ اقبال نے ستاروں کو انسان کی علامت بنا کر اپنا فلسفہ اس کی مدد سے ظاہر کیا ہے۔محبت کے اسی فلسفہ کو چاند ستاروں کی مدد سے انھوں نے اپنی نظم ''محبت'' بانگ درا میں بیان کیا ہے اور محبت کے متعلق تین بنیادی چیزیں بیان کی ہیں۔

(۱) محبت اکسیر کا ایسا نسخہ ہے جسے فرشتے آدمی سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔
(۲) محبت ہی کی وجہ سے اس دنیا میں زندگی پیدا ہوئی اور کائنات وجود میں آئی۔
(۳) محبت کائنات کی مختلف چیزوں کے خواص لے لے کر بنی اور کائنات کی تمام چیزوں کا حسن محبت ہی سے پیدا ہوا ہے۔[۷۷]

اقبال بتاتے ہیں کہ عرش معلیٰ پر محبت کے ان تمام رازوں کو پانے کے لیے کوئی کیمیا گر تھا۔جس کے پاؤں کی پاکیزگی جمشید کے پیالے سے بہتر تھی۔اللہ تعالیٰ کے عرش کے پائے پر اکسیر کا یہ نسخہ تحریر تھا جسے فرشتے روح آدمؑ کی آنکھ سے چھپانے کی جستجو میں تھے کہ کہیں یہ نسخہ انسان کو معلوم نہ ہو جائے مگر عالم بالا کا کیمیا گر اس نسخہ اکسیر کی تاک میں تھا وہ اسے اسم اعظم سے بھی بہتر تصور کرتا تھا آخر کار وہ خدائے پاک کی تسبیح کرنے کے بہانے عرش کی جانب گیا اور تگ و دو پیہم سے اس کے دل کی مراد بر آئی۔ پھر اس نسخے کے اجزا کی تلاش میں پوری کائنات میں پھرا۔وہ بارگاہ ایزدی کا رازدان تھا۔ بھلا اس کی نظروں سے کون سی چیز پوشیدہ رہ سکتی تھی۔آخر کار اس نے اس نسخے کے لیے جو اجزا جمع کر لیے اس کی صورت حال کچھ یوں تھی کہ تارے سے چمک اور چاند سے جگر کا داغ ،رات سے بکھری ہوئی زلف کی سیاہی ،حوا سے پاکیزگی مانگی اور حضرت مریمؑ کے بیٹے کے سانس سے حرارت حاصل کی اور بعدازاں رب ذوالجلال سے تھوڑی سی بے نیازی کی شان لے لی،فرشتے سے عاجزی اور شبنم کی قسمت سے مسکینی لے کر اسے ان تمام اجزا کو آبِ حیات میں گھول لیا۔اس طرح جو مرکب نسخہ تیار ہوا اسے عرش اعظم سے محبت کا نام ملا۔

سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیح ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیر شبنم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے[۸]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی ''محبت'' کے اسی فلسفہ سے بے حد متاثر ہوئیں اور ان کی نظم ''محبت'' کے فلسفہ کو اپنے ایک افسانہ ''سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا'' بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال کے افکار واضح الفاظ میں بیان کیے ہیں اور محبت کے تمام خصائص بیان کرتے ہوئے اس کے اجزا نسخہ کیمیا اقبال کے ہی اشعار کی روشنی میں بیان کیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے اس افسانے کا نام بھی اقبال کی نظم ''محبت'' کے ایک مصرع ''سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا'' سے اخذ کیا ہے جسے انھوں نے ہو بہو علامہ اقبال کے اشعار میں بیان کیا ہے۔

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیح ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیر شبنم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے[۹]

قرۃ العین حیدر نے اس افسانہ میں ''کیمیا گر'' کی حیثیت سے ایک آصف نامی کردار پیش کیا ہے جو تین بہنوں ذکیہ، شکیلہ اور پروین کا اکلوتا بھائی ہونے کے ناطے سب کی آنکھوں کا تارا

تھا۔ وہ ایک اور کھلنڈرے کردار کے روپ میں سامنے آتا ہے اور وہ اپنی انھی شوخیانہ اور کھلنڈرانہ باتوں کے سبب سب کو محظوظ کرتا ہے۔ جس کے اوصاف بتاتے ہوئے قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

آصف صاحب ان کے اکلوتے بھائی تھے سب کی آنکھوں کا تارا۔ متوقع تھے کہ ہم لوگ بھی انھیں آنکھ کا تارا سمجھ کر ہمیشہ ان کے fusses برداشت کریں گے آپ ایف۔ سی میں کیمسٹری میں ایم ایس سی فرما رہے تھے۔ پٹرول کے رنگ تبدیل کرنے کے تجربوں کے بے انتہا شوقین تھے۔ سیٹی کے ساتھ ساتھ وائلن بہترین بجاتے تھے۔ مغالطہ تھا کہ بے حد خوبصورت ہیں۔ گھر کی بزرگ خواتین اور بچوں سے خوب دوستی کر لی تھی۔ کار اتنی تیز چلاتے تھے کہ ہمیشہ چالان ہوتا رہتا تھا۔ لاہور کے سارے چوراہوں کے پولیس مین آپ سے اچھی طرح واقف تھے۔ مال پر پیدل جاتی ہوئی الٹراماڈرن لڑکیوں کو کار میں لفٹ دینے کے تجربوں کے بہت قائل تھے۔ مختصر یہ کہ انتہائی دلچسپ آدمی تھے آپ۔[۸۰]

قرۃ العین حیدر نے آصف میں کیمیا گر کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ آنکھوں کے تارا کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ آصف میں ایک بہادر اور عمل پیہم انسان کے خصائص نظر آئے ہیں۔ ایسے لوگ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے انھی لوگوں کو آنکھوں کا تارا کہا ہے جو موت کو سینے سے لگاتے ہیں۔

شرر بن کے رہتی ہے انسان کے دل میں
وہ ہے نور مطلق کی آنکھوں کا تارا[۸۱]

اقبال کے نزدیک ٹوٹے ہوئے تارے کی بھی اہمیت ہے جس سے وہ آدم خاکی کو تشبیہ دیتے ہیں۔ آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں مگر دوبارہ آسمان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ آدم خاکی جو ایک دفعہ ٹوٹے ہوئے تارے کی مانند زمین پہ اتارا گیا۔ اس کی ذہنی اور روحانی ترقی کو محسوس کرتے ہوئے ستارے خوفزدہ ہیں کہ کہیں وہ اپنا کھویا ہوا مقام یعنی جنت کو حاصل نہ کر لے جہاں سے اس کو نکالا گیا تھا۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا، مہ کامل نہ بن جائے[۸۲]

قرۃ العین حیدر بذات خود ترقی پسندوں پر تنقید کرتی ہیں کہ کیا یہی لوگ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر سکتے ہیں؟۔

اب یہاں سے بھاگنا چاہیے۔آصف نے چپکے سے کہا اور ہم سب ان سیاست دانوں کو وہیں چھت پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرتے چھوڑ کر منڈیروں پر سے چھلانگتے ہوئے نیچے اتر آئے۔[۸۳]

قرۃ العین حیدر ایسے ترقی پسند سیاست دانوں کو ٹوٹے ہوئے تارے سے تشبیہ دے کر ان کا مذاق بھی اڑاتی ہیں اور علامہ اقبال کے ٹوٹے ہوئے تارے کو لیڈر بنا کر مہ کامل کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔اس سلسلہ میں وہ آسمان پہ ستاروں کا بنظر غائر جائزہ لیتی ہیں۔جس کے متعلق وہ ان الفاظ میں ذکر کرتی ہے:

سیاہ افق کے قریب ایک بڑا سا روشن ستارہ ٹوٹ کر ایک لمبی سی چمکیلی لکیر بناتا ہوا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ہم آسمان کو دیکھنے لگے۔''کوئی بڑا آدمی مرگیا''۔میں نے کہا۔''واقعی؟ اینہ آپادی مہاتما گئے۔''آصف نے ذرا اُونچی آواز میں کہا۔دوسرے لمحے ایک اور ننھا سا تارا ٹوٹا۔''ارے ان کے سیکرٹری بھی......''عثمان چلایا۔اس رات بہت سے ستارے ٹوٹے اور ہم ساری باتیں چھوڑ کر آسمان کو دیکھتے رہے اور جو ستارہ ٹوٹتا اس کے ساتھ کسی بڑے لیڈر کو چپکا دیتے۔''ساری ورکنگ کمیٹی ہی سفر کر گئی''۔[۸۴]

دریا،ندی اور آب جو

کلام اقبال میں دریا،ندی اور آب جو کی تشبیہات وغیرہ بھی کثرت سے ملتی ہیں۔اقبال موج اور دریا کی تشبیہات فرد اور ملت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں[۸۵]

ان کے ہاں ملت اسلامیہ کی ترجمانی دجلہ اور فرات کے دریا سے واضح طور پر ملتی ہے۔وہ گیسوئے دجلہ وفرات کی تابداری سے مراد اصول اسلام کی صداقت اور دلکشی لیتے ہیں۔ویسے بھی ان دریاؤں کی وادی میں دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں نے پرورش پائی ہے۔نینوا اور بابل کے جاہ و جلال اور سحر و اسرار کے کرشموں سے یہ دریا واقف ہیں۔[۸۶]

اقبال ان دریاؤں کی تہذیب کے فروغ کے لیے قافلہ حجاز کے متمنی ہیں اور توقع کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی تو کاروانِ اسلام میں امام حسینؑ جیسا ہو۔امام حسینؑ سے مراد ایسا غازی جو صداقت کے لیے آج بھی سر کٹوانے یا جام''شہادت'' پینے کے لیے تیار ہو،مگر انھیں اسلام پر ایسا فدا ہونے والا شخص نظر ہی نہیں آتا۔

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات [۸۷]

اقبال کی مانند قرۃ العین حیدر بھی دریائے فرات کے حوالے سے تہذیب اسلام اور اصول اسلام کی صداقت و دلکشی اور امام حسینؑ جیسے غازی کی متلاشی نظر آتی ہیں اور انھیں بھی اقبال کی طرح مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس عرب تہذیب کے متوالوں کا تذکرہ بڑے دکھ کے ساتھ کرتی ہیں جو کبھی اسلام کی خاطر جان لٹاتے تھے۔ قرۃ العین حیدر نے اقبال کے مندرجہ بالا شعر کی روشنی میں ایک عرب ریستوران میں توحید کے پجاری کا احوال ان الفاظ میں بیان کر کے دریائے فرات کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے:

توحید کا پجاری ایک عرب ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مصری رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ جس میں مووی ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں...... یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے اس عرب کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ یہ میرے رسولؐ اور میرے امامؑ کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل وصورت کے رہے ہوں گے۔ لباس پہنتے ہوں گے، دریچے کے باہر فرات بہہ رہا ہے۔ جہاں میرے امام مظلومؑ کو پیاسا مارا گیا تھا، میرے اوپر کافی جذباتیت کی موڈ طاری ہو رہی ہے۔ عرب نے کولڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اٹھالیا۔ میں اس سے کہنا چاہتی ہوں میرے پیارے بھائی...... کوکا کولا پیو تو یاد کرو پیاس حسینؑ کی...... میرے پیارے بوڑھے عرب! تم جو ایک پوری تاریخ کے ایک بہت عظیم تمدن اور روایت کے بہت بیچارے نمایندے ہو اور تمھارے ہاتھوں میں یہ موویز کا رسالہ ہے اور تمھاری آنکھیں زندگی کی روشنی سے عاری ہیں۔ تمھارے پرکھوں نے مولا علیؑ اور جناب عباسؑ اور جعفر طیارؓ کا ساتھ دیا ہوگا۔ تم جو صدیوں کا بہت اذیت ناک اور عبرت انگیز سفر طے کرتے ہوئے اس لمحے تک پہنچے ہو کہ تمھارے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کولا کولا کا گلاس ہے۔ اب تم کدھر جانے والے ہو۔ [۸۸]

انھی علاقوں سے مسلمان اشاعت اسلام کے لیے برصغیر میں وارد ہوئے اور برصغیر میں اسلام پھیلانے کے ساتھ ساتھ حکومت بھی کی۔ جس بنا پر علامہ اقبال جیحوں کے باسیوں کے شکر گزار نظر آتے ہیں۔

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں [۸۹]

قرۃ العین حیدر نے علامہ قبال کے انھی دریاؤں کے متعلق انھی افکار کو مزید پھیلایا ہے اور وہ

فرات اور جیحوں کے ساتھ ساتھ جمنا، گنگا، گاگن اور گومتی کی تہذیبوں کے بارے میں بتاتی ہے۔ جسے انھوں نے اپنے سوانحی ناول کار جہاں دراز ہے کی فصل اول میں ''فرات و جیحوں'' اور ''جیحوں سے جمنا'' کے عنوانات تحریر کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر نے تہذیب حجازی کے زیر اثر ان دریاؤں کے علاقوں میں اسلام کی اشاعت کے متعلق ان الفاظ کے ساتھ وضاحت کی ہے:

فتح توران کو عرصہ ہو چکا۔ بخارا، سمرقند اور ترمذ میں عرب نو آبادیات قائم ہیں۔ دمشق اور بغداد سے بہت دور ماوراالنہر میں شاید امن نصیب ہو...... فرات سے جیحوں جیحوں سے جمنا اور گنگا اور گومتی اور گاگن تک کے راستے کچھ کم پیچ اور پُر خطر اور حیرت ناک نہ تھے؟[۹۰]

قرۃ العین حیدر دریا کو وقت کی علامت تصور کرتی ہیں اور وقت حرکت کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس پتھر سکون اور منجمد رہتا ہے۔

دریا بہتا ہوا وقت ہے پتھر (timeless become) کی علامت ہے، پتھر وقت کی منجمد شکل ہے۔[۹۱]

اسی بنا پر وہ دریاؤں کو والہانہ عقیدت کی بنا پر عشق کی انتہا تک چاہتی ہیں اور یہی توقعات وہ دوسروں سے رکھتی ہیں۔

مجھے دریاؤں سے عشق ہے، تم کو دریاؤں سے عشق ہے۔[۹۲]

علامہ اقبال نے دریا، یم اور جو کی علامات میں مختلف انسانوں کا کردار پیش کر کے ابلیس کے گھناؤنے خیالات اور مصمم ارادوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے گھناؤنے کارنامے بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں۔ جن کے پایہ تکمیل کے لیے مختلف لوگ پھیلے ہوئے ہیں لہٰذا ابلیس اپنے روبرو حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ کو بھی بے بس اور محتاج ظاہر کرتا ہے۔

خضرؑ بھی بے دست و پا، الیاسؑ بھی بے دست و پا
میرے طوفان یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو[۹۳]

قرۃ العین حیدر نے بھی علامہ اقبال کی مانند دریا کو ابلیس کے طوفانوں کی علامت قرار دیتے ہوئے ایک افسانہ ''دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم'' تحریر کیا ہے۔ جس میں انگریزوں کے گھناؤنے کارناموں کو ابلیس کے کارنامے قرار دیتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔

ساحل پر سرخ ناک والا موٹا انگریز اپنا چھوٹا سا موڈل طیارہ اڑانے میں مشغول تھا۔ کارڈ بورڈ کا بنا ہوا وہ چھوٹا سا طیارہ اپنے ڈیزل انجن کے زور سے گھوں گھوں کرتا اوپر اٹھتا اور ہوا میں کافی بلندی پر پہنچ کر دس پندرہ منٹ تک اڑتے رہنے کے بعد زمین پر اتر آتا۔ ہر اتوار کی صبح وہ موٹا انگریز اپنی اس ہوبی میں اس انہماک سے مشغول رہتا۔[۹۴]

علامہ اقبال کی شاعری میں کئی جگہ زندگی کو آب جو، جوئے کم، بحر، بحر بیکراں اور رواں دواں ندی سے بڑی خوبصورت تشبیہ دی ہے۔ اقبال کی ندی سے وابستگی کا واضح ثبوت ان کی متعدد نظموں میں ملتا ہے۔ جن میں ''ہمالہ''، ''شاعر''، ''فلسفہ غم''، ''جوئے آب'' اور ''ساقی نامہ'' میں مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ ''ہمالہ'' میں ندی کو گانے والی دوشیزہ کہا ہے۔ ''فلسفہ غم'' میں اسے زندگی سے مشابہ قرار دیتے ہوئے حیات وممات کی پیچیدہ گتھی سلجھانے کی کاوش کی ہے اور اسے ''نہر روانِ زندگی'' قرار دے کر بنی نوع انسان کی عظمت کا نقشہ بیان کیا ہے کہ مرنے والے انسان مر تو جاتے ہیں مگر وہ فنا نہیں ہوتے۔

ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوع انسان بن گئی
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں [۹۵]

قرۃ العین حیدر نے اقبال کی مانند ندی کو زندگی کی علامت قرار دیا ہے اور اقبال کی طرح حیات وممات کی پیچیدہ گتھیاں سلجھائی ہیں۔

یہ ندی ہماری زندگی کی علامت ہے...... میں ندی کے پانی میں ڈوب کر مروں گا۔ [۹۶]

پہاڑ

علامہ اقبال کی پہاڑوں سے دلچسپی دو وجوہات کی بنا پر زیادہ تر نظر آتی ہے۔ بالخصوص جو پہاڑ اسلامی تاریخ یا ہندوستان کی تاریخ سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتے ہیں مگر اس تہذیبی اور مذہبی تعلق کے علاوہ پہاڑوں سے وابستہ حسن ہیبت، وقار بھی ان کے لیے دل بستگی کا سبب رہا۔ مثلاً ''ہمالہ''، ''دماوند''، ''الوند''، ''البرز''، ''کوہ اضم'' اور ''کوہ طور'' وغیرہ۔ ''ہمالہ'' سے دلچسپی بانگ درا کی پہلی نظم سے ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ انھوں نے ہمالہ کو فصیل ہندوستان قرار دیا ہے اور اس کی بلندی کی بنا پر اس کی عظمت کو سراہا ہے کہ آسمان بھی اونچا ہونے کے باوجود تیری عظمت کو سلام کرنے کے لیے جھک کر تیری پیشانی چومتا ہے۔

ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان [۹۷]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی مانند ہمالہ کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ وہ

ہمیشہ کی مانند اپنا سر فخر سے بلند کیے قائم و دائم ہے اور اس کی چوٹیاں برف باری سے بھری پڑی ہیں۔ جس وجہ سے زندگی کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

ہمالہ اپنی جگہ پر عظمت اور اپنی ہیئت کے ساتھ ہمیشہ کی طرح سر بلند اور اٹل کھڑا تھا۔ اس کی وادیوں اور اس کی چوٹیوں پر پھیلی ہوئی اس زندگی پر انھوں نے کبھی غور نہ کیا تھا۔ [۹۸]

اقبال نے نظم ''ہمالہ'' میں بتایا ہے کہ ہمالہ سے ندیاں ایک دوشیزہ کی طرح گاتی ہوئی نکل رہی ہیں۔ جس سے کوثر و تسنیم کے پانی کی لہریں بھی شرماتی ہیں اور انھی ندیوں کو اقبال نے زندگی سے مشابہت دی ہے۔

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی [۹۹]

قرۃ العین حیدر نے ہمالہ سے نکلنے والی ندیوں اور دریاؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کی ابتدا بھی یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ جس کے متعلق ان الفاظ میں اظہار کرتی ہے:

یہاں سے گنگا اور جمنا آتی تھیں۔ یہاں سے شاردا اور گومتی اور گھاگرا نکلتی تھیں۔ یہاں سے کائنات کی تخلیق ہوئی تھی۔ [۱۰۰]

علامہ اقبال ہمالہ کو مسکن آبا قرار دے کر انسان کی اولین رہائش گاہ قرار دیتے ہیں اور سیدھی سادھی انسانی زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں جو قطعاً پر تکلف نہ تھی۔ اسی بنا پر اقبال گزرے ہوئے زمانے کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ جب سے کائنات تخلیق ہوئی تھی۔

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انسان جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازہ رنگِ تکلف کا نہ تھا [۱۰۱]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے مندرجہ بالا افکار کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ میرے آباؤ اجداد نے کوہ ہمالیہ کے دامن میں کس شوق سے مکان تعمیر کروایا تھا اور پُر امن زندگی بسر کرتے تھے، اسے یاد کر کے روتی ہے۔

وہ اپنے ہمالیہ کے پرانے گھر واپس پہنچ گئی۔ اس نے دریچے میں کھڑے ہو کر ان نیلی فضاؤں کی سمت دیکھا۔ جدھر سے وہ جا کر لوٹ آئی تھی۔ وہ دریچے میں جھک کر باہر دیکھنے لگی۔ جہاں وہ آلوچے کے زرد شگوفے کھل رہے تھے...... میرے عزیز، میرے بھائی تم میرا مرثیہ لکھو گے۔

میرے باپ کا مرثیہ، میرے دادا کا مرثیہ، سگنل اپ اینڈ سگنل ڈاؤن ویٹس دی وے ٹو لنڈن ٹاؤن۔ آہ میرا وہ الزبیتھن وضع کا کنٹری ہاؤس جو میرے باپ نے ہمالیہ کے دامن میں کس شوق سے بنوایا تھا۔[۱۰۲]

علامہ اقبال نے ہمالہ کی عظمت کو سراہتے تھے ہوئے ''کلیم طور سینا'' کہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر صرف ایک بار جلوہ نظر آیا تھا لیکن تو چشم بینا کے لیے مکمل طور پر جلوہ ہی جلوہ ہے۔

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے[۱۰۳]

کوہ طور کے مقام اور محل وقوع کے متعلق سید عابد علی عابد بتاتے ہیں کہ

یہ کوہستانی سلسلہ بحیرہ قلزم کے دو شاخے کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا۔ اس کی وادی، وادی ایمن ہے۔[۱۰۴]

قرۃ العین حیدر ہمالہ کی عظمت کو تسلیم کرتی ہے مگر قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ کے سرسبز پہاڑ اس کی نظر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر اسے ایرانی بلوچستان سے سرد ہواؤں کے رسیلے نغموں پر اُکسانے لگے۔ وہ ان پہاڑوں پہ کھڑے ہو کر ایران کی مذہبی لحاظ سے اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں کوہِ طور سے مماثلت دیتی ہے۔ وہ علامہ اقبال کی مانند ہمالہ کی طرح کوئٹہ کے پہاڑوں کو کوہِ طور کہتی ہے۔

سر اٹھا کر پہاڑوں کی سمت دیکھتی ہیں۔ یہاں سے زاہدان......زاہدان سے مشہد......انشااللہ محرم کرنے اب کی بار مشہد جاؤں گی......کوئٹہ ہے یا کوہ طور۔[۱۰۵]

''کوہ دماوند'' ایران کا مشہور و معروف پہاڑ ہے۔ اس سلسلے کے پہاڑوں کے درمیان وادیاں انتہائی زرخیز ہیں۔ ان کے زرخیز پن کی بنا پر اقبال اس پہاڑ کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔

مشکل ہے کہ اک بندہ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند[۱۰۶]

قرۃ العین حیدر اقبال کی اس غزل جس میں ''کوہ دماوند'' کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بڑے شوق سے اس غزل کو پسند کرتی ہیں۔ ذرا غور فرمائیے کیا صوتی شکوہ ہے ان اشعار میں:

خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
لگتا ہے دہل بج رہا ہے اور طبل جنگ[۱۰۷]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی مانند ''کوہ دماوند'' کی اس قدر اہمیت سے متاثر ہیں کہ انھوں

نے ایران کی شہزادی کی داستان اور اہل ایران کی تاریخ پر مبنی ایک سفر نامے کی صورت میں ایک تصنیف کوہ دماوند تحریر کی ہے اور اس میں علامہ اقبال کے اشعار اور افکار کا تذکرہ کیا ہے۔

خونِ جگر

''خونِ جگر'' کی اصطلاح علامہ اقبال نے اپنے نظریہ فن کے اظہار کے لیے اکثر استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح ابہام کے دھندلکوں میں چھپے ہوئے ہونے کے باوجود مفہوم کی جدت وندرت بڑی واضح کرتی ہے۔ بعض ناقدین اسے فنی خلوص کا مترادف تصور کرتے ہیں اور بعض اسے جذبہ تخلیق کا ہم معنی اور کوئی اسے تکمیل عشق کا نام دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک یہ فنکار کا کربِ تخلیق ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے نزدیک ''خونِ جگر'' سے مراد فنی خلوص ہے۔

اقبال نے جس چیز کو ''خون جگر'' کہا ہے وہ یہی خلوص ہے۔ جس کی پرورش جذبے کی آغوش میں ہوئی ہو۔ اپنی نظم ''مسجد قرطبہ'' میں وہ کہتا ہے کہ معجزہ ہائے ہنر آنی اور فانی ہیں۔ سوائے ان کی جن کی تہہ میں جذبہ وخلوص کارفرما ہوں۔ [۱۰۸]

اقبال شعر وادب اور فکر وفن کے متعلق اظہار کرتے ہیں کہ جو فلسفہ ''خونِ جگر'' سے تحریر نہ کیا گیا ہو اور جس فن اور آرٹ میں فنکار کا خون دل شامل نہ ہو۔ جس شاہکار کے لیے ادیب اور مصور کا موئے قلم روح کی روشنائی سے آشنا نہ ہو، اس میں زندگی نہیں ہوتی بلکہ وہ لفظ وصوت، رنگ و روغن اور کنکر و پتھر کا ایک کھوکھلا مجسمہ ہوتا ہے۔ اس میں نہ زندگی کی رعنائی وتازگی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی جان ہوتی ہے لہٰذا فنی شاہکار، گہری محبت، جذبہ کی گرمی اور خلوص کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ محبت ہی زندہ انسان اور پتھر کے مجسمہ میں فرق و امتیاز پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ فن پارہ فنا پذیر سریع الزوال ہے جس میں خون جگر شامل نہیں اور وہ نغمہ جاوداں نہیں بن سکتا جس میں نئے نواز کا سوز نہ ہو اور دل کی گہرائیوں سے نہ پھوٹا ہو۔ یہ نظریہ فن ہی نہیں بلکہ نظریہ حیات بھی ہے۔ لہٰذا ادب و زندگی دونوں کے لیے خون دل وجگر کی اشد ضرورت ہے۔

رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزہ فن کی ہے، خون جگر سے نمود
قطرہ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر[۱۰۹]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے ''خونِ جگر'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے ''معجزہ فن'' کی داد اقبال کے اس مصرع ''معجزہ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود'' کے ساتھ دیتی ہیں کہ روسیوں نے ادب میں ''خونِ جگر'' کے ساتھ محنت و مشقت کر کے ترقی کی ہے۔ روس میں اٹھارویں صدی فرانسیسی ادب کا چرچا ہوا۔ جس سے روسی ذہن کی آبیاری ہوئی۔ نئے تصورات اور سیاسی آزادی کی باتیں روسی شعرا اور مصنفین نے شروع کیں۔ جس سے روسیوں کو ماضی پر ناز کرنے کا احساس پیدا ہوا۔ کیتھرین دی گریٹ کے دور میں اسلامی حکومتیں زیر ہوئیں اور نئے مقبوضات روسیوں کے ہاتھ لگے جس سے انھیں سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ امرا نے ذاتی لائبریریاں قائم کیں اور کتب خانوں کو فروغ دیا۔ اب تک تعلیم گرجا گھروں، راہبوں اور خانقاہوں تک محدود تھی مگر اس دور میں روس ایک طاقتور اور وسیع السلطنت بن چکا تھا اور غریب کسانوں کو خوشحالی کے ساتھ ساتھ زیادہ تر عظیم الشان ادب کو ''خون جگر'' سے سینچا تھا۔ بقول قرۃ العین حیدر:

> روس اب تک با اقتدار وسیع، امپریل طاقت بن چکا تھا۔ ایک کٹر اور کلیسا، مطلق العنان زار، جابر زمیندار، مظلوم اور نیم غلام کسانوں کے اس معاشرے نے روس کی اس غمگین روح کو جنم دیا جس نے ایک عظیم الشان ادب تخلیق کیا کہ ''معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود''۔[۱۱۰]

اقبال نے فن برائے زندگی کے متعلق بہت سے نظریات بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ زوال پذیر دنیا فانی ہے اور اس کے ساتھ ہی قوموں کی عظیم یادگار و آثار اور انسانی عبرت انگیز کے نشانات اور شاہکار سب منزل فنا اور عالم بے نشانی کی طرف گامزن ہیں مگر مردِ مومن کے ہاتھ کا بنا ہوا شاہکار اپنے جذبہ ایمان کی بدولت ان میں جان ڈال دیتا ہے اور اسے لافانی بنا دیتا ہے۔ وہ اسے عشق و محبت کی قوت و تاثیر سے انھیں زندگی جاوداں بخش دیتا ہے۔ اقبال فن کے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ''مسجد قرطبہ'' سے خطاب کیا ہے کہ اے عظیم مسجد! تیرے وجود و نمود اس پاک محبت اور شدید جذبات کی رہین منت ہے۔ اس لیے تو بھی لازوال اور دوامی ہے۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اوّل و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات و دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام[۱۱۱]

قرۃالعین حیدر نے اقبال کے فن کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ''مسجد قرطبہ'' کے ساتھ ساتھ ''انگ کور کا مندر'' کا تذکرہ کرتے ہوئے موازنہ کرتی ہے۔ انگ کور بنکاک سے کچھ فاصلے پر تھائی لینڈ کی قدیم راجدھانی ایودھیا کی سرحد کے دوسری طرف کمبوڈیا میں انگ کورواٹ ہے جسے پانچویں صدی عیسوی میں مشرق کے انام اور مغرب کے تھائی لوگوں کے حملوں نے کمزور کردیا تھا۔ سارا سیام کو چین، چائنا کمبوڈیا، برما، لاؤس، ملایا کے کچھ حصے اس میں شامل تھے۔ انگ کورواٹ کا مندر دنیا کے عجائبات میں شامل ہے اور آج بھی قائم ودائم ہے۔ چھٹی وساتویں صدی عیسوی میں یہاں کے فن سنگ تراشی عروج پر تھا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کا حوالہ دیتی ہے کہ جس میں ''خونِ جگر'' شامل ہو وہ فن کبھی تباہ نہیں ہوتا۔

انگ کور کا مندر۔ قرطبہ کی مسجد۔ اوّل وآخر فنا۔ انگ کوروٹ آج بھی ایک خواب کی طرح موجود ہے۔ خاموش' مہیب سنسان' جنوبی ہند اور اڑیسہ کی طرز کے مندر، موکیشور اور ہری ہر کے عظیم الشان بت شو کے لرزہ خیز مجسمے ایلورا اور کھجوراور پہاڑ پور کی روایت کے دیوتا اور دیویاں اور ودیادھر اور گندھرو دیواروں کے ریلیف مجسمے مکمل خاموشی، مکمل حسن، چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں یہاں کا فن سنگتراشی جس بلندی پر پہنچ گیا۔ صرف دیکھ کر اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ گپتا عہد کے کتنے فنکار یہاں آئے ہوں گے۔ مردوں کا خاموش شہر...... مہاراج، دھیراج سری جے اندرو امن کا ملک۔ سولہویں صدی میں قبلائی خان کے حملہ آوروں نے ان ساری جگہوں کا خاتمہ بالخیر کردیا۔ اوّل وآخر فنا...... ظاہر وباطن فنا۔[۱۱۲]

قرۃ العین حیدر کی امیجری

قرہ العین حیدر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن ان کا لب ولہجہ ان کی نثر سے شاعرانہ ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر تصانیف میں اپنے شاعرانہ لب ولہجہ کو علامہ اقبال کی شاعری کے روپ میں اس شعر

میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو[۱۱۳]

کی روشنی میں دیکھتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو شاعرہ کہلانے میں زیادہ فخر محسوس کرتی ہوئی دکھائی دیتی

ہیں۔ چنانچہ وہ دیگر شعرا سے زبردستی داد وصول کرتی ہیں۔

امید ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ایک بڑی سحر طراز افسانہ نگار ہوں۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔ خوب! مس حیدر آپ کی نثر میں نظم کی سی حلاوت، روانی اور لچک ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے تازہ ترین قطعات آپ کے گوش گزار کروں جو میرے نئے مجموعے ''چھپر'' میں بھی شامل ہیں۔ عرض کرتا ہوں کہ...... مجھ کو منظور نہیں چاند ستاروں کا سفر میرے کھوئے ہوئے......۔[۱۱۴]

قرۃ العین حیدر نثر میں نظم کی سی حلاوت پیدا کرتے ہوئے امیجری یعنی تصویر کشی بڑی ہنرمندی سے کرتی ہیں۔

سامنے ایک جنگل ہے۔ پگڈنڈیاں، دلدل، نیلے اور اودے پھول، سرخ پتوں نے سڑک پر چاروں اور آگ لگا رکھی ہے۔[۱۱۵]

علامہ اقبال کے کلام میں اعلیٰ شاعرانہ مصوری کے نمونے ملتے ہیں۔ جن میں بانگ درا کی نظم ''آرزو'' اور فارسی نظم ''کشمیر'' نمایندہ نظمیں ہیں۔ وہ لفظوں کی مدد سے عالم فطرت کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔ جس سے پوری حقیقت آنکھوں کے روبرو چھا جاتی ہے۔ اقبال نے دامنِ کوہسار میں بہتی ہوئی ایک ندی کی عمدہ تصویر کشی خوبصورت انداز میں کی ہے۔

ہو دل فریب ایسا کوہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو[۱۱۶]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی تقلید کرتے ہوئے خودرو کوہستانی پھولوں کی خوشبو اور انجیر کے درختوں کی جھکی ہوئی ڈالیوں کو شفاف ٹھنڈے پانی کے چشموں کا منظر بڑی خوب صورتی کے ساتھ کرتی ہیں۔

اس وقت بل کھاتے طویل پہاڑی راستے کے کنارے کنارے بکھرے ہوئی سرخ چٹانوں کے پیچھے بہار کا نارنجی آفتاب مدھم ہو کر چھپتا جا رہا ہے۔ شام کی ہواؤں میں ابھی خنکی باقی تھی لیکن ان میں خودرو کوہستانی پھولوں کی تیز مہک تیرنی شروع ہوگئی تھی اور شفاف، ٹھنڈے پانی کے چشموں پر جہاں انجیر کی ڈالیاں جھکی ہوئی تھیں، شام کا اندھیرا گرتا آ رہا تھا۔[۱۱۷]

قرۃ العین حیدر اپنی تصانیف میں اقبال کی امیجری پیدا کرنے کی زبردست آرزومند ہیں مگر وہ حیران ہیں کہ اقبال نے اپنی امیجری کہاں سے حاصل کی ہے۔ وہ اقبال کی اس خوبی کا اظہار

برملا کرتی ہیں اور اس کے نقش قدم پر چلنے کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں۔

نوشہرہ چھاؤنی ضلع پشاور میں دریائے کابل کے کنارے واقع ہے۔ یہ سرد اور پُر فضا خطہ عمرانی لحاظ سے افغانستان و توران سے قریب اور وادی گنگ و جمن سے اتنا دور ہے کہ شمال مغرب کے چاق و چو بند قوی ہیکل باشندے ستلج پار کے باسیوں کو ''کالے ہندوستانی'' اور ''پوربیے'' کہتے ہیں۔ فرحت بخش ہوائیں، ترکستانی اونٹوں کے قافلے، سرد چشمے، برف پوش پہاڑ، آسمان پر اڑتے باز۔ ہمیں ضرور جاننا چاہیے کہ اقبال نے اپنی امیجری کہاں سے حاصل کی۔ ہر سمت وہ میدان کارزار پھیلے ہیں۔ جہاں سو سال سے شاہین صفت افغان اور پختون برطانوی افواج کا مقابلہ کر رہا ہے۔[۱۱۸]

قرۃ العین حیدر کی نظر میں علامہ اقبال

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں علامہ اقبال کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور بیسویں صدی کا بہترین شاعر تصور کرتی ہیں۔ ان کی نظر میں اس رتبہ تک اردو ادب میں کسی اور کو مقام حاصل نہ ہو سکا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی میں اور ادیبوں نے کام کیا مگر انھیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا۔ جس کا انھیں بڑا دکھ ہے۔ اس مقام کے حصول کے لیے نقاد ہی بہتر کام کر سکتا ہے' جسے قرۃ العین حیدر نے بہتر انداز میں نبھایا ہے۔ وہ علامہ اقبال کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتی ہیں۔ ''بیس صدی کے اردو ادب میں فقط ایک Olympian Immortal نمودار ہوا۔ جس کا نام اقبال تھا اردو فکشن نے اب تک اس مرتبے کی کوئی ہستی پیدا نہیں کی۔ لہٰذا آج ''خدایان ادب'' کا ذکر ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن ''انسانی سطح'' پر بات کیجیے تو ۱۹۰۰ء سے لے کر آج تک چند مشہور ترین شخصیتوں کے علاوہ بہت سے اچھے ادیب سامنے آئے۔ ان کو طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ ضروری نہیں کہ ایک شخص پچاس برس ایک سے ایک بڑھیا کہانیاں لکھے تب ہی اسے یاد کیا جائے۔[۱۱۹]

قرۃ العین حیدر کو اس بات کا زبردست گلہ ہے کہ مشرقی ادب اعلیٰ پائے کا ہونے کے باوجود بھی اسے مشرق و مغرب میں وہ اعلیٰ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ بھی ہونے والی ناانصافی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ رومی، غالب اور اقبال جیسے عظیم شعرا کو وہ مقبولیت نہ مل سکی۔ جس کے وہ مستحق تھے۔

اچھا مشرقی ادب اپنے آپ میں محصور رہتا ہے اور دوسرے درجے کی مغربی چیزیں عالم گیر شہرت حاصل کرتی ہیں۔ عزیز احمد اور ہم آپ تو خیر بونے لوگ ہیں۔ رومی، غالب اور اقبال کو اسی ترسیلی خلیج کی وجہ سے وہ عالم گیر شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوئی، جو عمر خیام اور جاپانی ہائیکو نظم کو ملی۔[۱۲۰]

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں نہ صرف اپنے آپ کو ایک اعلیٰ ادیب گردانتی ہے بلکہ وہ علامہ اقبال کی عظمت کا واضح اور ٹھوس ثبوت پیش کرتی ہے کہ یو۔این کے ایک سروے کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کے عظیم اور قومی شاعر کی کتب کو اہمیت حاصل ہے۔جس کے لیے وہ ان الفاظ میں باور کروانا چاہتی ہیں:

ایک عزیز جو عالم طیر رکھتا ہے۔دو سال قبل کراچی سے ٹوکیو جاتے ہوئے سانتا کروز ائیر پورٹ بمبئی پر ٹکا۔اس جہت سے کہ ویزا نہ رکھتا تھا۔ائیر پورٹ سے میرے دفتر فون کیا اور باتوں میں بتلایا کہ یو۔این کے سروے کے مطابق پاکستان میں شاعری کی کتابوں میں اقبال اور فیض اور نثر میں آگ کا دریا مقبول ترین کتابیں ہیں۔[۱۲۱]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فیض احمد فیض کے حوالے سے بتاتی ہیں کہ وہ بھی اقبال کی عظمت کے قائل تھے اور اقبال کو لیجنڈ تصور کرتے تھے۔جس کے متعلق وہ ان الفاظ میں اظہار کرتی ہیں:

ایک پائیپر ہماری گلی میں آیا تھا۔اس کی موسیقی سن کر سب لوگ،مرد،عورتیں،بچے اپنے اپنے کام چھوڑ گلی میں ناچنے لگے اور ایک سنہرے زمانے کی طرف رقص کرتے چلے گئے۔ایک آئرش شاعر نے بچوں کی ایک نظم میں لکھا تھا۔ہم سب مختلف پائیپر کے پیچھے پیچھے جارہے ہیں۔جن میں سب سے بڑا پائیپر خود بڑا ضمیر ہے۔آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر فیض صاحب نے اقبال کے لیے لکھا تھا۔اقبال کو ایک لیجنڈ بنے زمانہ ہوگیا۔اب خود فیض صاحب ایک لیجنڈ بنتے جارہے ہیں۔بلی بھائی کے ہاں دریچے میں کھڑے ہو کر صبح صبح ڈان اخبار کی سرخی دیکھی۔فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کے لیے سزائے موت۔[۱۲۲]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اہل مغرب کو آگاہ کرتی ہیں کہ عیسائی لوگ تاریخ اسلام سے اس قدر نجانے کیوں متعصب ہیں۔وہ اسلامی ہیروز کے افکار ونظریات پڑھنے کی بجائے ٹیگور بنگالی شاعر کو اہمیت دیتے ہیں جو قرۃ العین حیدر کو علامہ اقبال کی نسبت قطعاً ناپسند ہیں۔

''رونلڈ برطانوی ہے۔نسلاً خالص اینگلوسیکسن''،تم برصغیر کی ساری خرافات سیاسیات کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتی ہو،یہ تمھاری بھول ہے۔وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ڈاکٹر الٹ ملر کرسٹفر لی سے ٹیگور کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔''حضرت علیؓ اور امام غزالی اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی مطالعہ کیجیے۔مگر آپ عیسائیوں کا قدیم تعصب کب مٹے گا''۔میں کہتی ہوں۔[۱۲۳]

قرۃ العین حیدر کو ایک دفعہ روس جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں مشرق و مغرب کے تمام ممالک سے ادبا و شعرا نے شرکت کی اور انھیں بھی ادبی تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔ بنگلہ دیش کے قائد نے ٹیگور کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالی جبکہ قرۃ العین حیدر نے پچاس ہزار افراد کے روبرو علامہ اقبال کے متعلق بزبان انگریزی فی البدیہہ تقریر کر کے روشناس کروایا۔ قرۃ العین حیدر نے اس موقع پر نہ صرف روس میں بلکہ عالم تمام میں علامہ اقبال کے افکار و نظریات کو اجاگر کیا۔ قرۃ العین حیدر اس کے متعلق نہایت خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

بہت وسیع ڈائیس پر مندوبین کی تقاریر شروع ہوئیں۔ پچاس ہزار کا مجمع گھاس پر نہایت عقیدت سے بیٹھا سن رہا تھا۔ میں نے اپنی فی البدیہہ تقریر بزبان انگریزی میں علامہ اقبال کو بہت Quote کیا جو ایسے موقع پر بہت کام آتے ہیں۔ ایرا نے روسی میں ترجمہ کیا۔ بنگلہ دیشی قائد نے ٹیگور سے شروع کر کے ٹیگور پر ختم کیا۔[۱۲۴]

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں الم پرستی، رومانی کرب اور رابندر ناتھ ٹیگور کی غم پسندی کا ذکر بڑے دکھ کے ساتھ کرتے ہوئے ناپسند کرتی ہیں جب کہ علامہ اقبال کی شاعرانہ خصوصیات کو اُجاگر کرتے ہوئے تاریخ ادب اردو میں ان کا ایک مقام متعین کرتی ہیں۔ انھیں علامہ اقبال کی نسبت دیگر تمام مصنفین اس دور کے قابل رحم نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے اردو ادب کو درس حیات دینے کی بجائے درس موت دیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ایسے ادیبوں کے متعلق بڑے گہرے دکھ، غم اور افسوس کا اظہار کیا ہے جو قوم کو کچھ دینے کی بجائے صرف ان کے سامنے آنسو بہانا جانتے ہیں۔ اس الم پرستی کو صرف اور صرف علامہ اقبال نے ختم کرنا چاہا مگر رابندر ناتھ ٹیگور جیسے ہندو بڑا عظیم شاعر تصور کرتے ہیں اور اس کے گن گاتے ہیں۔ اس نے دوبارہ اردو شاعری میں الم پرستی کو فروغ دیا۔ قرۃ العین حیدر نے اس کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

۱۹۰۸ء میں عصمت کا اجرا ہوا۔ اس کے بانی علامہ راشد الخیری نے جو ''مصورِ غم'' کہلائے اس رویے کو عروج پر پہنچا دیا۔ خواجہ حسن نظامی کی ''غدر کی ماری شہزادیاں'' راشد الخیری اور خواتین ناول نگاروں کی مظلوم ہیروئینیں رومانی ہیرو ہر طرف دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ سارا ہندوستان غم پسندی میں مبتلا تھا۔ اقبال کی گھن گرج نے اردو شاعری کی الم پرستی کو ذرا کم کیا لیکن ٹیگوریت اور رومانی کرب نے پھر آنسوؤں، آہوؤں اور ٹھنڈی سانسوں کا مینہ برسا دیا۔ کولونیل سماج کا ادیب و شاعر رونا ہی جانتا ہے۔[۱۲۵]

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ترقی کی خواہاں ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اردو ادیب کوئی روایت

کے ساتھ ساتھ قدیم روایت سے بھی تعلق رکھنا چاہیے تا کہ وہ مستقبل پر بھی نظر رکھے۔اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کو ایک خدشہ لاحق ہے کہ ہمارا روایت سے تعلق ختم ہوتا جارہا ہے۔لہٰذا اس روایت پر چل کر ہم علامہ اقبال کی تعلیمات اور افکار سے استفادہ کر سکتے ہیں۔چنانچہ وہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے مستفید ہونے کی دعوت ان الفاظ میں دیتی ہیں:

> اسداللہ شاہ بخاری کے خیال میں روایت سے رشتے ٹوٹتے جارہے ہیں۔زیادہ تر نوجوان اردو ادیب اگر وقت سے پہلے مرگئے تو عالم بالا میں قدماً اور اقبال سے مل کر خود کو اجنبی محسوس کریں گے......آج کے مصنف کو نہ صرف یہ کہ نئی چیزیں کے نئے نام دریافت کرنے میں بلکہ ان چیزوں جو پہلے سے جانی یا محسوس کی گئی ہیں، از سر نو پہچاننا اور ان کے نام تلاش کرنے کے لیے کمر بستہ ہونا ہے۔اردو مصنف ایک ایسی پھیلی ہوئی کمیونٹی میں رہتا ہے۔جس کی اب تک توضیح نہیں کی گئی۔ ایک وژن، ایک فوکس کی تلاش اور ایک مقصد اور آگے دیکھنے کی جسارت اور ہمت اس کے لیے ضروری ہے۔[۱۲۶]

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی بہتری کے لیے کوشاں ہیں۔اس سلسلہ میں انھوں نے ایک طویل مضمون ''افسانہ'' تحریر کیا جس میں ترقی پسند مصنفین کو داد دی ہے۔جنھوں نے ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اور قیام پاکستان کے بعد سے لے کر آج تک اس قدر افسانوی ادب کے متعلق لکھا ہے۔جن میں ''لندن کی ایک رات'' اور ''انگارے'' نے ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے مگر مصنفین جدت پسند نہیں اور وہ بار بار سوال اٹھاتی ہے کہ اس ملک میں اچھا ادب کیوں نہیں تخلیق کیا جاتا؟ چند ایک اچھے افسانہ نگاروں کے نام بھی گنواتی ہیں۔جن میں سعادت حسن منٹو غلام عباس، ہاجرہ مستور اور خدیجہ مستور بہترین افسانہ نگار ہیں۔نئے لکھنے والوں میں جیلانی بانو کا بھی تذکرہ کرتی ہیں۔ان کے خیال میں یہ چند ایک ادیب کب تک اردو ادب کی گاڑی چلائیں گے؟اس سلسلہ میں وہ اظہار افسوس کرتی ہے کہ ویسے تو ہم بڑے ذہین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو علامہ اقبال، حالی، غالب اور میر تقی میر جیسے عظیم شعرا کے وارث گردانتے ہیں مگر ادبی لحاظ سے بہتر کارکردگی ظاہر نہیں کرتے جو علامہ اقبال نے ظاہر کی۔بقول قرۃ العین حیدر:

> دعوے تو آپ کو بہت ہیں۔ہم انٹلیکچول ہیں (بہت ہیبت ناک لفظ ہے) ہم معاشرے کا ضمیر ہیں، ہم میر و غالب و حالی و اقبال کے وارث ہیں۔تہذیب کے محافظ ہیں (وغیرہ وغیرہ)۔اپنے آپ کو ''ادیب'' کہلا کر پھولے نہیں سماتے مگر جو حالت ہے وہ یہ ہے۔[۱۲۷]

قرۃ العین حیدر کی نظر میں علامہ اقبال نہ صرف شاعر، ادیب، فلسفی، سیاست دان اور مفکر

پاکستان تھے بلکہ وہ ایک بہت بڑے فلمی کہانی نویس بھی تھے۔انھوں نے ایک فلم افغان شہزادہ کی کہانی تحریر کی۔وہ نہ صرف علامہ اقبال کی ذہانت کی قائل ہیں بلکہ ان کے ہرفن مولا ہونے کا ثبوت بھی پیش کرتی ہیں۔

۱۹۳۴ء میں لاہور میں ایک فلم بن رہی تھی۔اس کی کہانی علامہ اقبال نے لکھی تھی۔فلم کا نام افغان شہزادہ اناؤنس ہوا تھا۔خواجہ حسن نظامی اس کے ڈائیلاگ رائیٹر تھے۔[۱۲۸]

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ترقی کے لیے ادیبوں کی اصلاح کے لیے''اقبال ایوننگ اکیڈمی'' قائم کرنے کی خواہاں ہیں تاکہ دورِ جدید کے ادیب علامہ اقبال کے افکار ونظریات سے آگاہ ہوسکیں۔اس نے اس سلسلہ میں برطانیہ میں انگریزوں سے بھی رابطہ کیا اور تگ ودو کی تاکہ لوگ علامہ اقبال کے افکار سے آگاہ ہوسکیں مگر قرۃ العین حیدر ٹیگور کا ذکر سن کر چڑ سی جاتی ہیں اور وہ اقبال کے نظریات کے فروغ کے لیے مزید کوشاں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور وہ اقبال ایوننگ اکیڈمی قائم کرنے کی زبردست خواہاں ہیں۔

پرسوں میلہ کمیٹی کی میٹنگ ہے۔اقبال ایوننگ کے سلسلے میں اقبال سنگھ سے ملنا ہے......رائف رسل اور انگریزوں کے جگر مرادآبادی سے بھی اقبال ایوننگ کے لیے بات کرنی ہے اور افسوس ہے کہ احتشام صاحب اس سے پہلے ہی لکھنؤ لوٹ جائیں گے......میں شام کو سخت ڈپریسڈ گھر پہنچی۔ اس وقت اوجیت کا فون آیا۔''ہلو--- سنو......وہ دھاڑ رہا تھا۔دیکھو یہ ٹیگور ٹیگور ہر وقت بنگالی کا شور مچا رہتا ہے۔اب اقبال ایوننگ ہونی ضروری ہے۔ضرور ایسا ہی ہوگا۔میں نے کہا۔اگلے روز پریس کلب سے میں نے رائف رسل کو فون کیا۔(رائف علی گڑھ سے اردو پڑھ کر آئے تھے اور یہاں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پڑھاتے تھے۔نہایت فصیح وبلیغ اردو بولتے تھے اور اکثر ہم لوگوں کو اردو کی غلطیوں پر ٹوکتے رہتے تھے۔) بھئی یہ علامہ اقبال کا سلسلہ ہے کچھ''۔[۱۲۹]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار ونظریات سے مستفید ہونے کے متعلق پاکستانیوں کے بارے میں اظہار تعجب کرتی ہیں کہ پاکستانی اپنے قومی شاعر کے نظریات کے متعلق اس قدر آگاہ نہیں۔جس قدر ہندوستانی لوگ ہیں اور انھوں نے اقبال کے متعلق بے حد کام کیا ہے اور علامہ اقبال کی اہمیت سے اس قدر آگاہ ہیں کہ انھوں نے برطانیہ میں انڈیا ہاؤس پر اقبال ایوننگ کے پوسٹر لگائے ہوئے ہیں جسے دیکھ کر پاکستانی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔

آج میں نے ایک عجیب بات دیکھی......''ایک پاکستانی نے دوسرے سے کہا۔انڈیا ہاؤس میں چاروں طرف''اقبال ایوننگ'' کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔میں نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا

اور پھر کام میں لگ گئی۔[۱۳۰]

قرۃ العین حیدر برطانیہ میں انگریزوں کی علامہ اقبال سے متعلق دلچسپی اور افکار و نظریات سے مستفید ہونے کا تذکرہ کر کے علامہ اقبال کی اہمیت اُجاگر کرتی ہیں کہ اقبال کے متعلق انگریزوں کی دلچسپی کوئی دورِ جدید کا واقعہ نہیں بلکہ اقبال کی اولین تصنیف اسرارِ خودی کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا جس سے اقبال یورپ میں روشناس ہوئے۔ انگریزوں نے علامہ اقبال کو ایک عظیم شاعر تصور کرتے ہوئے اسے سرکاری طور پر اہمیت دی اور ''اقبال ڈے'' منایا۔

دیکھو یہ ٹیگور ٹیگور ہر وقت بنگالی کا شور مچا رہتا ہے۔ اب اقبال ایوننگ ہونی ضروری ہے......اچھا ......تو خیال یہ ہے کہ اقبال اتنا بڑا شاعر تھا کہ ایک انگریز بھی اس کے متعلق تقریر کر رہا ہے......

قصہ یہ تھا کہ سرکاری اقبال ڈے کے موقعوں پر سلطنت برطانیہ کے بڑے بڑے نائیٹ حضرات کو مدعو کر کے جن کو اقبال یا ان کے کلام سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان سے تقریریں کروائی جاتی تھیں۔ انگریزوں کے جگر مراد آبادی صاحب انگریزی کے اچھے خاصے مشہور شاعروں میں سے تھے اور روحانی طور پر بڑے سخت مسلمان تھے۔ مشرق کے افلاس میں ان کو خدا کی قدرت نظر آتی تھی۔ سرکار ''یومِ اقبال'' پر یہ ہر سال مسجدوں کے میناروں کی تعریف میں اپنی ایک آدھ انگریزی نظم پڑھ ڈالتے تھے۔[۱۳۱]

قرۃ العین حیدر پریس اتاشی کی ملازمت کے دوران لندن تشریف لے گئیں۔ وہاں انھوں نے اقبال ایوننگ کی تیاری میں بڑی محنت و مشقت سے کام لیا، ان کے ہمراہ رمیش سنگوی بھی تھے۔ جنھوں نے مل کر اقبال کے کلام کا انگریزی ترجمہ کرنے میں محنت و مشقت سے کام لیا۔ قرۃ العین حیدر دورِ جدید کے ادیبوں کی کاوش کو سراہتے ہوئے، اپنی کوششوں کا ذکر بھی اقبالیات کے حوالے سے کرنا چاہتی ہیں کہ انھوں نے اقبالیات کے حوالے سے بہت کام کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں سے لطف اندوز ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

مڈل ٹمپل کی لائبریری میں بیٹھے ہوئے میں اور رمیش سنگوی اسکرپٹ کے لیے اقبال کی نظموں کو جلدی جلدی انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مشغول رہے۔ ہمارے ساتھ ہی آلِ حسن کی خوبصورت بیوی کرشنا اور پی ایس ایف کا بنگالی پریذیڈنٹ ہمایوں رشید اور ترونا دیدی کے میاں دلیپ بیٹھے حسبِ معمول کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ سب قانون کے طالب علم تھے۔ اقبال کا اسکرپٹ ایک طرف رکھ کر ہم نے کسی بات پر ہنسنا شروع کیا۔ حسب معمول پھر شور مچنے لگا۔[۱۳۲]

قرۃ العین حیدر ''اقبال ایوننگ'' میں جن حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان کا ذکر کیے بغیر رہ

نہیں سکتیں اوران کی کاوشوں کا تذکرہ کر کے ''اقبال ایوننگ'' کی کامیابی کا ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں:

اقبال ایوننگ'' نہایت شاندار اور کامیاب رہی۔ ہندی سیکشن والے بی بی سی تھیٹر میں اپنی ''سبھا'' پیش کر رہے تھے، آمنہ، سریکھا، انور اور غزالہ سب کے سب اس میں جٹے تھے۔[۱۳۳]

قرۃ العین حیدر نے ''اقبال ایوننگ'' کے حوالے سے نوجوان ادبا کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انہوں نے اقبال کے فلسفہ پر لندن میں تقاریر کیں اور اقبال ایوننگ کو اپنی غربت کے باوجود کامیاب بنانے کے لیے عطیے دے کر اعانت کی۔ حالانکہ انہیں اپنے مکان کو مرمت کروانے کے لیے رقم کی شدید ضرورت تھی مگر انہوں نے علامہ اقبال کے نظریات اور تعلیمات کے فروغ کے لیے حتمی کاوش کی۔ جس سے اقبالیات کے ساتھ گہری دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

طلعت اور کمال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراہتے تھے۔ اقبال ایوننگ میں جا کر انھوں نے اقبال کے فلسفے پر تقریر کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے۔ حالانکہ رنجور صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کروا سکتے تھے۔[۱۳۴]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے متعلق ادبا کی گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بتانا چاہتی ہے۔ جہاں لوگ نگر نگر گھوم کر مختلف نوادر جمع کرنے کے شوقین ہیں۔ وہاں ان کے کمروں میں اقبال جیسے عظیم شاعر کی کتب الماریوں سے بھری پڑی ہیں۔ جن سے وہ استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات، علامہ اقبال، فیض، کرشن چندر، پھر سریکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی، بیلے، کر بوگرافی، سارے کمرے میں نفیس آرٹسٹک چیزیں لگی تھیں۔ جو سریکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یورپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا بیلا لیکا چین کے نوادر، ہنگری کی گڑیاں، اٹلی اور فرانس کی پینٹینگز۔[۱۳۵]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے آگاہ کرنا چاہتی ہیں کہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات یا تصانیف سے فقط ادبا ہی مستفید نہیں ہو رہے بلکہ بڑے بڑے روسا اور نواب کلام اقبال سے زندگی کے تلخ حقائق کا حل تلاش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر بھی یہی درس نوجوان نسل کو دینے کی زبردست خواہاں ہیں کہ زندگی کے مسائل کا حل فلسفہ اقبال میں موجود ہے۔ لہٰذا ہمیں اقبال کے افکار و نظریات سے استفادہ کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

نواب سید عاشق حسین مرحوم کے جس مکان میں حسنین ماموں اور چندا ممانی کی شادی ۱۹۳۲ء

میں رچی تھی۔اس میں اب نواب سید حامد علی خان (ابن نواب سید عاشق حسین خان مرحوم) کے نہوڑی داماد سید حسین مہدی رضوی ایڈوکیٹ فروکش ہیں اور اقبال کی اسرارِ خودی کا منظوم اردو ترجمہ لکھنے میں مصروف۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق کا فلسفے اور مابعد الطبیعات سے کیا رابطہ اور کس نوع کی مطابقت ہے؟ ایک نوابزادہ کزن کارل مارکس کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کچھ لوگ فلسفہ اقبالؒ میں زندگی کا حل تلاش کرتے ہیں۔ [۱۳۶]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کو پاکستان کا قومی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اعلیٰ افکار و نظریات کی بدولت پاکستان کا روحانی باپ تصور کرتی ہیں۔ وہ اس بات کا اظہار خیال کرتی ہیں کہ علامہ اقبال میں بے حد صفات تھیں۔انھوں نے مغربی فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا۔ وہ جمہوریت پسند تھے اور جمہوریت کو اسلامی الٰہیات اور قوانین کے مطابق ڈھالنے کی خواہش رکھتے تھے۔

اقبال پاکستان کا روحانی باپ تھا۔ وہ Westernizer تھا۔اُس نے فلسفے کا مغرب میں مطالعہ کیا اور مغربی فلسفیوں کے متعلق لکھا۔اسے صرف دو مفکر پسند آئے۔St.Thomas Aquinas اور Max Sholer (بیسویں صدی کا مابعدالطبیعاتی مفکر جس کا نظریہ مذہبی تھا) اقبال جمہوریت پرست بھی تھا۔لیکن جمہوریت کو اسلامی الٰہیات اور قوانین کی مطابقت کے ساتھ رائج کرنا چاہتا تھا۔آج کل طرز حکومت کے مسائل کے متعلق جو پاکستان میں لکھا جا رہا ہے اور تحریروں اور مباحثوں میں مضمر stimulation, shock,challenge سارا کا سارا مغربی ہے۔ [۱۳۷]

علامہ اقبال کو بعض ادبا پروگریسو گردانتے ہیں اور بعض ری ایکشنری۔قرۃ العین حیدر کے نزدیک اقبال پروگریسو ہیں۔اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کا ذکر کرتی ہیں۔ جسے بعض لوگ ری ایکشنری کہتے ہیں لیکن قرۃ العین حیدر یہ واضح کرنا چاہتی ہیں کہ اقبال ایک پروگریسو ذہن کے مالک ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں فیصلہ ہم پر چھوڑتی ہیں کہ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے۔تب آپ فیصلہ کر پائیں گے کہ آیا اقبال پروگریسو تھے یا ری ایکشنری۔اس کے لیے وہ ان الفاظ میں سوال کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے نزدیک علامہ اقبال بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ نہ صرف قومی شاعر ہونے کے ناطے ان کی معتقد ہے بلکہ ایک اسلامی شاعر ہونے کی بنا پر ان کی پیروکار ہے۔ وہ اقبال کو ایک سچا مسلمان اور عاشق دین تصور کرتے ہوئے ان کے افکار و نظریات کی قائل ہیں اور وہ اقبال کے اسی پہلو کو سب سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔

اب علامہ اقبال کو لیجیے اور اسلامی کلچر کے متعلق ان کے نظریات...... انتہا پسندی ہمیشہ پرکشش

ہوتی ہے۔مزید برآں اقبال کا ایک پہلو ہمیشہ آپ کو جماعت اسلامی کی طرف لے جائے گا۔ مجھے ہے حکم اذان۔ [۱۳۸]

قرۃ العین حیدر کی نظر میں اقبال کے سیاسی کارنامے

دوقومی نظریہ

علامہ اقبال برصغیر پاک و ہند میں سرسید احمد خاں کے سیاسی افکار سے متاثر تھے اور فکری اعتبار سے وہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کی پریشانی اور بدحالی دیکھ کر اندازہ لگا چکے تھے۔ ہندوؤں کی اکثریت میں مسلمانوں کو اقلیت بن کر ہمیشہ ہمیشہ زندگی بسر کرنا پڑے گی۔اقبال کی تمنا تھی کہ مسلمان سیاسی طور پر بیدار ہوں اور غلامی کے طوق کو گلے سے اتار پھینکیں۔یہی سبب تھا کہ انھوں نے کانگریس کی شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔لہٰذا علامہ اقبال پر ۱۹۰۹ء میں واضح ہو چکا تھا کہ ہندو اور مسلمان متحد نہیں رہ سکتے اور مسلمانوں کو اپنا علیحدہ وجود رکھنا ہوگا۔اس سلسلہ میں اقبال نے منشی غلام قادر فرح کو اپریل ۱۹۰۹ء میں اس وقت خط تحریر کیا جب انھوں نے اقبال کو امرتسر میں مسلمان، سکھ اور ہندو ارباب ذوق کے علمی و ادبی مرکز ''منروالاج''میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔۲۸/مارچ ۱۹۰۹ء کو اقبال نے غلام قادر فرح کو ہندو مسلم رجحانات اور تعلقات کے متعلق بتاتے ہوئے شرکت کرنے سے انکار کیا۔

میں دیکھتا ہوں کہ جس شہر یا گاؤں میں دو سکول تھے۔ایک ہندوؤں کا دوسرا عیسائیوں کا، تو مسلمان فطرۃً عیسائیوں کے سکول کی طرف متوجہ ہوئے۔خواہ ہندوؤں کا مدرسہ بھی ان کے لیے کشادہ ہو۔یہ ایسے واقعات ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے کوئی متفقہ حکمت عملی سوچنے کے لیے ان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ [۱۳۹]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے اسی افکار کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ صدیوں سے ہندو مسلم ایک ساتھ رہے، ایک ہی تہذیب وتمدن کے گہوارہ بن کر زندگی بسر کرتے رہے مگر مذہبی اور تاریخی لحاظ سے متحد نہ ہو سکے اور نہ ہی ان کے تاریخی ہیرو ایک ہی بن سکے۔اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر نے دوقومی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک ہندوستانی لڑکی سیتا ہرن اور مسلمان لڑکے عرفان کی داستان بیان کی ہے جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک ساتھ کئی ممالک کی سیر کرنے کی غرض سے ہندوستان سے نکلتے ہیں مگر دونوں تہذیبی، مذہبی اور ادبی لحاظ سے متفق نہ ہو سکے۔جس بنا پر وہ آپس میں شادی نہ کر سکے۔

خزاں کے موسم میں وہ دونوں اسپین گئے۔ وہاں مسجد قرطبہ کی سیڑھیوں پر چاندنی رات میں انھیں ایک پاکستانی طالب علم ملا۔ جس نے بے حد پیاری آواز میں گٹار پر اقبال کی نظم سنائی۔ سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات۔ سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات۔ ''اب مجھے اس کا مطلب سمجھا۔'' سیتا نے عرفان سے کہا۔ بہت دیر تک اشعار کی تشریح کرنے کے بعد عرفان نے جھنجھلا کر اس سے کہا۔ ''تم اپنا کالی داس، تلسی داس کرتی رہو، اقبال تمہارے بس کی بات نہیں۔''...... ''ہاہا''......اب آیا تمہاری عقل میں؟ میں نہ کہتا تھا کہ تمہارا سارا کالی داس والی داس، شاعری' ادب، فلسفہ سب فراڈ ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے سامنے سب خرافات معلوم ہوتا ہے کہ نہیں؟ [۱۴۰]

پنجاب مجلس قانون ساز

علامہ اقبال نے ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کی ممبری کا الیکشن جیت کر باقاعدہ مقامی سیاست کا آغاز کیا۔ جس کے متعلق ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو راجہ پرشاد کشن کے نام خط تحریر کرتے ہیں۔

میں اہل لاہور کے اصرار سے پنجاب کونسل الیکشن میں گرفتار تھا۔ الحمد اللہ تین ہزار کی مجارٹی سے کامیاب ہوا۔ [۱۴۱]

اقبال نے بحیثیت ممبر کونسل مختلف امور پر اچھی اور موزوں تجاویز پیش کیں۔ جن میں پنجاب میں زمین کا مالیہ اور مذہبی توہین کے خلاف قوانین منظور کروائے۔ زمین کے مالیہ میں خصوصاً کمی اور طریقہ محصول میں ناانصافی کے لیے آواز اٹھائی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۲۳ر فروری ۱۹۲۸ء کو مالیہ اراضی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ مالیہ کی وصولی کا طریقہ کار بالکل غلط ہے۔

اگر کوئی شخص زمیندار ہو تو خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اس کو لازماً مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے لیکن اگر کوئی شخص زمین کے سوا کسی اور ذریعے سے دو ہزار روپے سالانہ سے کم آمدنی حاصل کرئے تو آپ اس پر ٹیکس عاید نہیں کرتے۔ لہٰذا پانچ ایکڑ رقبہ کے مالکان کو ٹیکس میں چھوٹ ہونی چاہیے۔ [۱۴۲]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی ان کاوشوں کو سراہتے ہوئے کسان طبقہ پر روشنی ڈالی ہے کہ پاک بھارت دونوں ممالک نے زرعی اصلاحات کی طرف اقبال کے افکار پر عمل کرتے ہوئے توجہ دی ہے لیکن پنجاب کا کسان خوشحال ہے مگر سندھ کا کسان ابھی تک پسماندہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ زرعی اصلاحات پر فلم بنانے پر قرۃ العین حیدر کو برلن میں انعام سے نوازا گیا۔ قرۃ العین حیدر عملی طور پر کسان طبقہ کی صورت حال کو اجاگر کرنے کے لیے گاؤں گاؤں جاتی ہیں۔

زرعی اصلاحات کا دونوں ملکوں میں بڑا شور شرابہ ہے۔ میں محکمے کے لیے زرعی اصلاحات پر ایک

ڈوکومنٹری فلم بنانے پنجاب اور سندھ کے گاؤں میں جاتی ہوں۔ جہاں جاگیرداروں اور پیرزادوں کا گہرا تسلط رہا۔ وہی حضرات اب طاقتور لیڈر بن چکے ہیں۔ پنجاب کے کسان عموماً خوشحال ہیں۔ سندھ کے خوار وخستہ......کئی مہینے بنگال اور پنجاب اور سندھ کے گاؤں میں گھوم کر دو تین ڈوکومنٹری فلم بنائے ہیں اور زرعی اصلاحات والی فلم کو برلن کے ڈوکومنٹری فلم فسٹیول میں ابھی ایک انعام بھی ملا ہے۔[۱۴۳]

پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی افتتاحی رسم ۳؍جنوری ۱۹۲۷ء کو ہوئی۔ پنجاب کونسل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کی اکثریت تھی۔ اقبال بھی ان کے ساتھ ہو گئے لیکن اس پارٹی نے شہری اور دیہاتی، مزدور اور سرمایہ دار کی وجہ سے طبقات پیدا کیے ہوئے تھے۔ جس بنا پر علامہ اقبال یونینسٹ پارٹی سے منحرف ہو گئے مگر سر فضل حسین کے بیٹے عظیم حسین کے بقول فضل حسین کی خواہش تھی کہ صدر چوہدری شہاب الدین کے عہدے کی معیاد مکمل ہونے پر ڈاکٹر علامہ اقبال کو صدر کونسل منتخب کیا جائے لیکن پارٹی کی اکثریت نے چوہدری شہاب الدین کو دوبارہ صدر کونسل منتخب کر لیا، درحقیقت علامہ اقبال سر فضل حسین کے ہاتھوں کٹھ پتلی نہیں بننا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنا سیاسی مستقبل سر ظفر اللہ خان جیسا بنانا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے علامہ اقبال ہر لمحہ ان سے مایوس ہوئے۔

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اسی بنا پر سر فضل حسین اور اس کے بیٹے عظیم حسین کو طنز ومزاح کا نشانہ بناتی ہے۔ جس وجہ سے سیاسی طور پر علامہ اقبال کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور سیاسی لحاظ سے مسلم لیگ کو نقصان اٹھانا پڑا۔ یہی صدمہ قرۃ العین حیدر کے ذہن میں نقش دوام کی حیثیت اختیار کر گیا اور وہ انتقاماً انھیں تضحیک کا نشانہ بناتی ہیں۔

سر فضل حسین مرحوم کے صاحبزادے میاں عظیم حسین انڈیا کے دونوں مسٹر حسین کہلاتے تھے۔ کونسلر حلقوں اور امریکنوں میں یہ لطیفہ مشہور تھا کہ ہمیشہ یاد رکھو کہ کون سے مسٹر حسین سے کیا بات کہی جائے۔[۱۴۴]

مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی

قائداعظم نے ۳۰؍مئی ۱۹۳۶ء میں اقبال کو پنجاب لیگ کا دوبارہ صدر منتخب کیا تو انھوں نے علالت کے باوجود مسلم لیگ کو ایک عوامی جماعت بنانے کے لیے کوشش کی مگر یونینسٹ پارٹی کے سر فضل حسین کی وفات کے بعد ان کی جگہ سر سکندر حیات پنجاب میں حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو یونینسٹ پارٹی اور بنگال کے فضل الحق کی ''پروجا پارٹی'' کی خواہش تھی کہ مسلم

لیگ سے سمجھوتہ کرلیں جس کے لیے احمد یار دولتانہ ۲۴؍جون ۱۹۳۶ء کو ''لیگ'' اور ''یونینسٹ پارٹی'' کے باہمی تعاون کے لیے مصالحاتی اور مفاہمتی فارمولا لائے کہ تمام امور جو کل اقلیت ہند سے متعلق مسلمانوں کے لیے مقرر کیے ہیں۔ وہ مسلم لیگ کے فیصلے کے پابند ہوں گے اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم پارٹی سے اتحاد نہیں کریں گے۔ بشرطیکہ صوبائی مسلم لیگ بھی اس پر متفق ہو۔ یہی تجویز سر سکندر حیات قائداعظم کے پاس لے کر جارہے تھے۔ جس کے متعلق اقبال نے ۲۵؍جون ۱۹۳۶ء کو قائداعظم کے نام اسی گفت وشنید کے متعلق ایک خط روانہ کیا۔

> سر سکندر حیات دو ایک روز ہوئے روانہ ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی میں آپ سے مل کر بعض امور پر گفتگو کریں گے۔ کل شام دولتانہ مجھ سے ملے تھے۔ وہ کہتے تھے یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبران حسب ذیل اعلان کے لیے تیار ہیں...... از راہ کرم اولین فرصت میں مجھے مطلع فرمایئے کہ اس تجویز کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ سر سکندر حیات سے جو گفتگو ہو۔ اس کے نتیجے سے بھی مطلع فرمایئے۔ اگر آپ سر سکندر حیات کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔[۱۴۵]

علامہ اقبال کو قوی امید تھی کہ قائداعظم اور سر سکندر حیات کے درمیان ملاقات سے مفاہمت ہو چکی ہو گی مگر سر سکندر حیات نہ قائل ہوئے اور نہ ہی مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ اقبال اس سلسلہ میں سر سکندر حیات کے متعلق قائداعظم کو گاہے بگاہے آگاہ کرتے رہے لیکن اقبال نے محسوس کیا کہ سر سکندر حیات ''جناح سکندر معاہدہ'' کے باوجود بھی مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد نہیں کریں گے تو اقبال نے معاہدہ کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہوئے مسلم لیگ کے لیے ہمہ تن کاوشیں مزید تیز کر دیں۔ اس سلسلہ میں یونینسٹ پارٹی سے مسلم لیگ کو بچانے کے لیے اقبال نے ۱۴؍اپریل ۱۹۳۸ء کو ایک معرکتہ الآرا بیان غلام رسول خان سیکریٹری پنجاب مسلم لیگ کو تحریر کروایا۔ جس کی ایک کاپی محمد علی جناح کو ارسال کی مگر جناح نے اس کی اشاعت سے منع کیا۔ اقبال نے یہ بیان تحریر کروایا:

> اب یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اور اب توقع رکھنا کہ ''جناح سکندر پیکٹ'' کے بعد یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے۔ ایک امید موہوم ثابت ہو رہی ہے۔[۱۴۶]

علامہ اقبال سر سکندر حیات سے اتحاد کے سلسلہ میں قوی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے مگر آخر میں مایوس ہو گئے۔ قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی ان کاوشوں کو منظر عام پر لاتے ہوئے آگاہ کیا ہے کہ آخر کار سر سکندر حیات نے ۱۹۴۱ء میں معافی مانگ کر مسلم لیگ میں شمولیت

اختیار کرلی۔اسی وجہ سے سر سکندر حیات کو علامہ اقبال کے قریب بادشاہی مسجد لاہور میں دفن کیا گیا۔قرۃ العین حیدر سجاد حیدر یلدرم کے ایک مراسلہ جوانہوں نے قائداعظم کو تحریر کیا تھا اس کا حوالہ دے کر علامہ اقبال کے کام کو سجاد حیدر یلدرم کے ذریعے آگے بڑھاتے ہوئے آگاہ کرتی ہیں کہ جس کام کو علامہ اقبال نے شروع کیا تھا آخر کار اُسے سجاد حیدر یلدرم نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

۲۶/اگست ۱۹۴۱ء السلام علیکم۔کل مسلم لیگ کی میٹنگ میں سر سکندر حیات نے معافی مانگ لی اور جنگ کی کونسل سے استعفٰی دے دیا۔آج پھر میٹنگ ہے......سجاد۔[۱۴۷]

علامہ اقبال کی کاوشوں کے سبب مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے پنجاب مسلم لیگ ایک مضبوط جماعت بن گئی اور ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔اس کے بعد واقعی مسلم لیگ عوامی سطح پر رونما ہوئی اور لوگ جوق در جوق اس میں شمولیت اختیار کرنے لگے اور ایسے افراد بھی شامل ہونے لگے جو پہلے کانگریس یا دیگر سیاسی جماعتوں کے رکن تھے۔مولانا ظفر علی خاں نے بھی اسے عوام کی جماعت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔جن کا مشہور مصرع ہے۔

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ۔

قرۃ العین حیدر اس سلسلہ میں علامہ اقبال کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ مسلم لیگ ایک عوامی تحریک بن گئی۔جس کی وہ مثال ایک مستری مبارک حسین کی پیش کرتی ہیں جو کبھی کانگریس میں شامل تھے۔بعدازاں ''احرار پارٹی'' میں شمولیت کرلی،اور پھر عبدالغفار کی پارٹی میں شامل ہوگئے۔آخر کار ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوکر مسلم لیگ کے نعرے لگانے لگے۔اس مسلم لیگ کے جس کے علامہ اقبال خواہاں تھے۔

ان میں ایک مستری مبارک حسین پہلے بہت آسودہ حال تھے۔اپنی لاری چلاتے تھے۔پھر لاری احرار پارٹی کو بخش کر خان عبدالغفار خان کے بلانے پر پشاور چلے گئے......غرضیکہ مستری مبارک حسین اور ان کے ساتھیوں نے زندگیاں اسی جدوجہد کے لیے وقف کر دیں......۱۹۴۱ء میں محلے کے لڑکے بالے پلکھن تلے جمع ہوکر گا رہے ہیں۔

کشکول گدائی لے کر پھرا
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

نقشہ ہی بدل گیا میاں۔[۱۴۸]

علامہ اقبال ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق ہمیشہ غور و خوض کرتے تھے اور

ان کے متعلق فکر مند رہتے تھے۔ مسلمانوں کی بہتری کے لیے آپ نے محمد علی جناح کو خطوط لکھے اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے لاہور میں ۹ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو یوم اقبال کے موقع پر ارشاد کیا۔

وہ پیغمبر اسلام کے سچے اور راسخ العقیدہ پیروؤں میں سے تھے۔ مسلمان اوّل اور مسلمان آخر۔ وہ اسلام کے ترجمان اور اس کی آواز تھے۔ انھیں اسلامی اصولوں پر غیر متزل اعتقاد تھا۔ رموز زندگی کی کامیابی ان کی نظر میں تھی کہ خودی (اپنے آپ کو سمجھنا) کو پروان چڑھایا جائے اور اس مقصد کے حصول کا واحد طریقہ یہ تھا کہ اسلامی تعلیمات کی پیروی کی جائے۔ اگر چہ وہ ایک بڑے شاعر اور فلسفی تھے تاہم وہ کچھ کہ سیاست دان کم نہ تھے۔[۱۴۹]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے انھی سیاسی کارناموں کو سراہتے ہوئے تسلیم کرتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے سچے خیر خواہ تھے۔ وہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں پاکستان کے لیے جمہوریت کی خواہاں ہے اور ایسی جمہوریت جو اسلامی الہیات اور قوانین کے مطابق ہو وہ پاکستانی عوام کو آگاہ کرتی ہیں کہ اقبال ایک پہلو سے جماعت اسلامی سے بھی تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے ان دلائل کو بتانے سے قطعاً خوفزدہ نہیں ہے۔ وہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں بتانا اپنے لیے اسلامی نقطہ نظر سے ایمانی تقاضا نبھاتی ہیں کہ اقبال کے افکار ان کے لیے مشعل راہ کا ساماں پیدا کرتے ہیں۔

اقبال پاکستان کا روحانی باپ تھا......اقبال جمہوریت پرست بھی تھا لیکن جمہوریت کو اسلامی الٰہیات اور قوانین کے ساتھ رائج کرنا چاہتا تھا آج کل طرز حکومت کے مسائل کے متعلق جو پاکستان میں لکھا جارہا ہے اور تحریروں اور مباحثوں میں مضمر، Stimulation, Shock, Challenge سارا کا سارا مغربی ہے۔ آج کی دنیا میں رہنے کے لیے پاکستانی اور دوسرے ایشیائی اپنے مسائل، کردار، حسیت، ضروریات وغیرہ کے تناظر میں مغربی خیالات کو منظور یا مسترد کر سکتے ہیں......مزید برآں اقبال کا ایک پہلو ہمیشہ آپ کو جماعت اسلامی کی طرف لے جائے گا مجھے سے حکم اذان۔ لا الٰہ الا اللہ۔[۱۵۰]

تحریک خلافت

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ جس میں ترکی، آسٹریلیا، جرمنی ایک جانب اور دوسری جانب برطانیہ، روس اور فرانس تھے۔ ترکی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اتحادیوں نے ترکی کے حصے علیحدہ کر دیئے۔ سلطان وحیدالدین خان کی خلافت ختم کر کے اسے قیدی بنایا

گیا۔معاہدہ سیورے کی رو سے خلیفہ سے ایسی شرائط پر دستخط کروالیے جو درحقیقت ان کے لیے پیغام اجل تھی۔جس وجہ سے برطانیہ نے کڑی شرائط رکھ کر پابند رضا کر دیا اور انھیں صرف پندرہ ہزار فوج رکھنے پر مجبور کر دیا۔

جنگ کی ابتدا ہی میں اہل ہند میں بے چینی اور بے قراری پھیل گئی۔جس بنا پر حکومت برطانیہ نے مولانا حسین احمد مدنی،مولانا محمود الحسن شیخ الہند اور مولانا عزیز احمد گل کو حجاز سے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں قید کر لیا۔۱۹۱۵ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی،۱۹۱۶ء میں مولانا ظفر علی خاں،مولانا حسرت موہانی اور ابوالکلام آزاد کو گرفتار کر لیا۔قرۃ العین حیدر تحریک خلافت کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ ہندوستان میں حکومت برطانیہ نے لوگوں کو کڑی سزا دی جن میں محبّ مذہب افراد شامل تھے۔

جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی بھی مخبری کرتا ہے۔کوئی شکری حصار درنہ میں محصور ہو گیا کوئی بندہ حُر مالٹا میں اسیر ہوتا ہے۔صدا آئی کہ میں ہوں روح تیمور۔اگر محصور ہیں۔[۱۵۱]

۲۲؍ستمبر ۱۹۱۹ء کو ترکی کی حمایت میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور مولانا فضل الحسن،حسرت موہانی کی زیر صدارت نومبر ۱۹۱۹ء میں کمیٹی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا اور ولائتی مال کی خرید و فروخت پر بائیکاٹ کیا گیا۔[۱۵۲]

اسی دور میں ۱۸؍مارچ ۱۹۱۹ء کو حکومت ہند نے رولٹ بل کی منظور کیا تا کہ لوگ دنگا فساد نہ کریں،پولیس کو گھر گھر تلاشی اور بغیر وارنٹ گرفتار کرنے کے اختیارات دے دیئے گئے۔اس موقع پر گاندھی جی بھی مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور احتجاج کیا گیا جس سے ہندو مسلم اتحاد میں اضافہ ہوا۔جس کے متعلق قرۃ العین حیدر روشنی ڈالتی ہیں:

کشور ہند کی مساجد میں بروز جمعہ سلطان وحید الدین وسلطان عبدالمجید خامس کے نام کا خطبہ بصد جوش و خروش ورقت ہنوز پڑھا جا رہا ہے۔امیر المومنین۔خلیفہ المسلمین۔سلطان المعظم پائندہ باد......کشور ہند کا عام غیر مسلم خلافت کو برطانیہ کی ''مخالفت'' سمجھا اور سرکار کی ''خلافت'' کرنے میدان عمل میں کود پڑا۔ہندو مسلم بھائی بھائی۔ہندو مسلم اتحاد زندہ باد۔گاندھی جی۔[۱۵۳]

تحریک خلافت کی حمائت میں ہندو مسلم اتحاد ہوا اور ۱۳؍اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا جس پر جنرل ڈائر نے سینکڑوں افراد پر گولی چلا کر موت کی وادی میں دھکیل دیا۔محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیل میں تھے۔اس عرصہ میں ان کی والدہ نے ایک نظم ''صدائے خاتون'' گلیوں اور بازاروں میں گائی۔

''بولی اماں محمد علی کی...... جان بیٹا خلافت پر دے دو۔''[۱۵۴]

اسی عرصہ میں اقبال طبعاً اور مصلحتاً عملی سیاست سے دور تھے اور اسرار خودی اور رموز بے خودی تحریر کرنے میں مصروف تھے تو مولانا شوکت علی نے علامہ اقبال کو علی گڑھ کے سالانہ اجلاس ''اولڈ بوائز ایسوسی ایشن'' میں مدعو کیا تو اقبال نے ان الفاظ میں معذرت کی:

بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوحؑ سمجھتا ہوں۔ دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو۔ میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔[۱۵۵]

قیام خلافت کمیٹی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی پابند سلاسل تھے مگر رہائی ملتے ہی خلافت کمیٹی پر چھا گئے۔ قائد تحریک خلافت محمد علی جوہر اقبال کو انارکلی والے مکان میں ملاقات کے لیے آئے۔ ان کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ اقبال کو دیکھتے ہی از راہ مذاق یوں گویا ہوئے:

ظالم ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں لیکن تو ویسے کا ویسا دھسہ اوڑھے حقہ کے کش لگا تا رہتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اقبال نے برجستہ جواب دیا۔ مولانا میں قوم کا قوال ہوں اگر قوال خود ہی وجد و حال میں شریک ہو کر محوِ حق میں تہہ و بالا ہونے لگا تو قوالی ہی ختم ہو جائے گی۔[۱۵۶]

قرۃ العین حیدر محمد علی جوہر کے متعلق علامہ اقبال کے اشعار اور تصانیف کے بارے میں بتاتی ہیں۔ وہ تحریک خلافت کمیٹی کے ارکان میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کے لیے علامہ اقبال کے افکار و نظریات کا سہارا لیتے اور ان کے اشعار کی تشریح کے لیے قرآنی آیات اور حدیث مبارکہ کی سند بطور نقل پیش کرتے۔ قرۃ العین حیدر تحریک خلافت کی اہمیت کی روشنی میں علامہ اقبال کے کلام کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

ہمارے محمد علی چچا۔ چاند تارے والی ٹوپی اوڑھے فرغل ڈانٹے جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر بھکاریوں اور فاقہ کش مغل شہزادوں کی بھیڑ میں کھڑے کوچ کا بگل بجا رہے ہیں۔ ہوتا ہے جادہ پیما...... علی گڑھ میں گاندھی جی خواجہ عبدالمجید کے ہاں آن کر ٹکے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی نے بڑے دلدوز معرکوں کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا۔ خیموں میں کلاسیں لگیں۔ مولانا محمد علی اسرار خودی اور رموز بے خودی کا درس دیتے۔ ایک ایک شعر کی تفسیر کرتے، روتے رلاتے اور سند میں قرآن و حدیث نقل کرتے۔ خودی اتنی بیدار ہوئی کہ ''حضور وائسرائی صاحب سے

ملاقات کر کے بھی چنداں خوشی نہ ہوئی تھی۔[۱۵۷]

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ، کانگریس اور خلافت کانفرنس کے مشترکہ اجلاس امرتسر میں علی برادران پانچ سالہ قید فرنگ سے رہائی پا کر پہنچے۔ اس موقع پر گاندھی، موتی لعل نہرو، مسز بینسٹ، تلک اور دیگر قائدین نے شرکت کی۔ علامہ اقبال اور مرزا جلال الدین ہمراہ نواب سر ذوالفقار علی خان کی موٹر کار میں کانفرنس میں شرکت کے لیے امرتسر روانہ ہوئے۔ یہ وہی موٹر کار ہے، جس کے متعلق علامہ اقبال نے بانگ درا کی ایک نظم بعنوان ''موٹر کار'' تحریر کی۔

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش[۱۵۸]

قرۃ العین حیدر نے بھی علامہ اقبال کی اس نظم سے متاثر ہو کر علامہ اقبال کی زبان میں سر ذوالفقار اور لیڈی ذوالفقار کی موٹر کار کا تذکرہ کیا ہے۔ یونہی وہ لیڈی ذوالفقار یا ذوالفقار علی کی کار کسی کے پاس یا کسی اور جگہ پر دیکھتی ہے۔ وہ علامہ اقبال کی زبان میں ذکر کرتی ہیں:

جگندر نے کیسے پتے کی بات کہی۔ نوبہار کے نیچے ذوالفقار علی خاں کا موٹر خموش تھا۔[۱۵۹]

ایک بار قرۃ العین حیدر بیمار ہوئیں تو ان کی عیادت کے لیے لیڈی ذوالفقار علی خاں تشریف لائیں تو قرۃ العین حیدر کی نظر ان کی موٹر کار پر پڑی تو لامحالہ انھیں علامہ اقبال پھر یاد آ گئے۔

رات کو لیڈی ذوالفقار علی خاں دیکھنے آئیں۔ ناچیز آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں ربن لگانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ معلوم ہو گیا تھا کہ مزاج پرسی کے لیے مہمان آ رہے ہیں۔ حلیہ درست کر لینا چاہیے۔ لیڈی ذوالفقار یہ تیز فہمی دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ باہر ان کا موٹر بخود کھڑا تھا۔[۱۶۰]

امرتسر جلسہ میں اقبال علی برادران سے بغل گیر ہوئے تو عوام جذبہ جوش و خروش سے اشک بار ہوئے۔ اقبال نے اس موقع پر علی برادران کے اعزاز میں ایک مختصر سے نظم ''اسیری'' پڑھی۔ اسی اجلاس میں ایک قرارداد منظور ہوئی کہ محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد برطانوی وزیر اعظم اور عوام سے یورپ میں ملاقات کرے تاکہ اسلامی خلافت کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے لیکن علامہ اقبال نے اس کی سخت مخالفت کی اور ایک نظم ''دریوزۂ خلافت'' تحریر کی۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی تحریک خلافت کے متعلق اس مخالفت پر اظہار فخر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ علامہ اقبال نے جرأت مندانہ انداز میں مخالفت کی تھی اور ان کی نظم ''دریوزۂ خلافت'' کا حوالہ دیتی ہے۔

بعد کچھ عرصے کے حکیم الامت نے للکار کر دریافت کیا۔

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگاہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے
مسلمانوں کو ہے ننگ وہ پادشائی[۱۶۱]

جلسہ امرتسر کے زیر اثر ہندو مسلم اتحاد عروج پر پہنچ گیا۔ کانگریس کے ہندو رہنماؤں نے تحفظ خلافت کی برملا حمائت کی۔ ۱۹۱۹ء کی تمام تر اصلاحات مسترد کی گئیں۔ حکومت نے جلیانوالہ باغ اور مارشل لأ کے حوادث میں ملوث افسران کو بری کر دیا۔ جس سے مولانا محمود الحسن کی قیادت میں پانچ سو علما ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کی تحریک کا اعلان کیا۔ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا شوکت علی خاں اور محمد علی جوہر نے ملک بھر میں اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے دورے کیے۔[۱۶۲]

اقبال نے اسی عرصہ میں انجمن حمائت اسلام میں ''ارتقا'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس کا مفہوم تھا دشمنان اسلام چراغ مصطفیٰ کو گل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جمعیت العلما ہند نے ترکِ موالات کی وجہ سے فتویٰ جاری کیا کہ ترکی کے صلح نامہ کی شرائط میں مسلمانان ہند کو شمولیت نہیں دی گئی۔ جس بنا پر ہندوستان دارالحرب بن چکا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہجرت کر کے کسی مسلم مما لک میں آباد ہو جائیں۔ فتوی کے زیر اثر پنجاب، سندھ، سرحد کی عوام اپنی جائیداد، زمین، رقبہ اونے پونے داموں فروخت کر کے افغانستان روانہ ہو گئے۔ افغانستان کے لیے اتنی بڑی آبادی کو برداشت کرنا نہایت مشکل تھا۔ لہٰذا لوگ ذلیل وخوار ہو کر واپس لوٹے۔

اقبال کو اس کا بے حد صدمہ اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑا جس کا اظہار پروفیسر محمد اکبر منیر کے نام ۴/ اگست ۱۹۲۰ء کے ایک خط میں کیا۔

> ہندوستان اور بالخصوص پنجاب سے بے شمار لوگ (مسلمان) افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اس وقت تک پندرہ بیس ہزار آدمی (اور ممکن ہے کہ زیادہ ہو) جا چکا ہوگا۔[۱۶۳]

قرۃ العین حیدر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیئے جانے پر مسلمانوں کی ہجرت کے واقعہ کا نقشہ کھینچتی ہے کہ اس ہجرت سے ہزار ہا لوگ ذلیل وخوار ہوئے۔ فاقہ کشی کی، ہاتھوں میں سوائے ستو کی پوٹلی کے اور کچھ نہ تھا۔ جیلوں میں بند کیئے گئے۔ پھانسی کے پھندے پہ انھیں لٹکایا گیا۔ یہ اہل ایمان فقط خدا کے رسولؐ کے عاشق بن کر علامہ اقبال کے اشعار کی روشنی میں جوش و جذبہ سے گھر سے نکلے جن کے متعلق قرۃ العین حیدر نے گہرے دکھ و رنج کا اظہار کیا ہے۔

سوختہ ساماں ہندی کلمہ گو جوق در جوق دارالحرب سے ہجرت کر رہا ہے۔غریب الوطنی مزید فاقہ کشی۔ بربادی، ناکامی اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر ڈوبے۔ بے شمار دیو بندی مولانا۔ ذہن پرست انقلابی، جوشیلا قوم پرست۔سر پہ کفن باندھ جیل میں گھس گیا۔ پھانسی چڑھا۔ کابل، تاشقند، ماسکو برلن۔امریکہ فرار ہوا۔ یہاں اور وہاں بھوکوں مر۔ مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ ہزار ہا غریب ہندی مسلمان خدا رسولؐ کا عاشق فرنگی سے مقابلہ کرنے کوچہ بازار کھیت کھلیان سے نکلا۔ گلے میں حمائل شریف۔ ہاتھ میں ستو کی پوٹلی کہ جہاں میں نانِ جویں پر ہے مدارِ قوت حیدریؓ مارا گیا۔قید خانہ میں بند ہوا۔کالے پانی بھیجا گیا۔فراموش ہوا۔آج گم نام ہے، نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ۔[۱۶۴]

جنگ عظیم اوّل کے مضر اثرات ودل خراش سانحات وواقعات نے جہاں خلافت پر کاری ضرب لگائی وہاں اقبال کے دل پر بھی گہرا اثر چھوڑا۔انھوں نے عالم اسلام بالخصوص ترکان آل عثمان کی بے دست وپائی،مفتوح اقوام کی دھاندلی،ابلیسانہ سیاست،سرمایہ داری کی عیاری، مزدور کی بیداری کے پیش نظر ۱۶/اپریل ۱۹۲۲ء کو انجمن حمایت اسلام میں ایک نظم ''خضر راہ'' کے عنوان سے پڑھی اور سارا مجمع بالخصوص اس شعر پر رونے لگا:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک وخون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

جب اقبال نے اس شعر کو پڑھا تو خود اس قدر روئے کہ سارا مجمع آبدیدہ ہوگیا:

ہوگیا مانند آب ارزاں مسلمان کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز[۱۶۵]

قرۃ العین حیدر تحریک خلافت کے پس منظر میں اسلام پر جو کاری ضرب لگی اس کا جائزہ علامہ اقبال کی نظم ''خضر راہ'' کے ایک حصہ بالخصوص ''دنیائے اسلام'' کی روشنی میں گہرے دکھ اور افسوس کے ساتھ لیتی ہیں کہ کیسے کیسے عالم اسلام پر طوفان بن کر ٹوٹے اور بجلی بن کر ان کے آشیانہ کو خاکستر بنا دیا۔ برطانیہ اور اس کے حلیفوں نے مشرق وسطیٰ مثلاً عرب، عراق، فلسطین اور شام میں ترکی کے خلاف بغاوت کرائی اور ان پر حسب منشا حکمران مقرر کیے۔جن میں شریف حسین مکہ، امیر عبداللہ اور امیر فیصل ان باغیوں کے سرغنہ تھے جنھوں نے انگریزوں کا آلہ کار بن کر قومی عصبیت کا شکار ہوکر ترکی سے علیحدگی اختیار کی۔جس کے متعلق قرۃ العین حیدر تحریک خلافت کا جائزہ علامہ اقبال کے افکار ونظریات کی روشنی میں براہ راست ان کے اشعار میں لیتی ہیں:

۱۹۱۴ء۔۱۹۲۰ء ہوگئی۔رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ۔باب عالی کے جگمگاتے فانوس ایک ایک کر کے بجھتے جارہے ہیں۔جو سراپا ناز تھے۔ہیں آج مجبور نیاز۔گرد صلیب گرد قمر حلقہ زن ہوئی۔ ہوائیں ان کی،فضائیں ان کی،سمندر ان کے۔بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیؐ لے گئے تثلیث کے فرزند۔یا مقتدائی تاتار افغانی امام۔سیدالسادات مولانا جمال۔پس چہ باید کرد۔اے درویش سوڈانی؟ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر۔قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں۔البتہ شریف حسین۔خاک وخون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش۔[۱۶۶]

عربوں کی بغاوت سے خود انھیں مفاد نہ پہنچا۔البتہ عراق،مصر،شام،فلسطین پر انگریزوں کا تسلط مضبوط ہوگیا مگر ترکی پر صحیح طور پر گرفت نہ آسکی۔مصطفیٰ کمال پاشا نے ماندہ فوج کو متحد کر کے اناطولیہ میں قائم مقام حکومت قائم کر لی اور یونانیوں کو شکست فاش کر کے اپنا مقبوضہ علاقہ واپس لے لیا۔۱۹۲۴ء میں عصمت پاشا کی تدبیر نے لارڈ کرزن کی سیاسی چالوں کو لوازن کے مقام پر شکست دے کر ترکوں کے لیے آبرومندانہ زندگی کا معاہدہ کیا۔ترکی کے حصول آزادی میں کامیابی سے ہم کنار ہونے پر اقبال نے ۱۹۲۴ء ''طلوع اسلام'' ''انجمن حمایت اسلام'' کے جلسہ میں پڑھی جس میں امید افزا،روشن درخشاں اور ولولہ انگیز مستقبل کی نوید سناتے ہوئے ایشیا اور اسلام کے حالات پر روشنی ڈالی اور ترکوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔

عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں، اس راز کو سینا و فارابی
اگر عثمانیوں پہ کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا[۱۶۷]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی مانند اہل ترکوں کی کاوشوں کو سراہتی ہے کہ انھوں نے ترکی کو از سر نو تہذیب دے کر ایک مستحکم ملک بنایا۔اتاترک،روف پاشا،عصمت انونو،جنرل فخری پاشا اور وزیر تعلیم خالدہ ادیب خانم جن کے یلدرم کے ساتھ گہرے مراسم تھے اور خط و کتابت بھی جاری تھی۔ان لوگوں نے ترکی کے لیے دن رات محنت کی۔جس وجہ سے وہ سرخرو ہوئے۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار ونظریات کی روشنی میں آگاہ کرتی ہیں کہ اہل ترکوں کے خلافت ختم کرنے سے ہندوستانیوں میں ایک کہرام برپا ہوگیا۔اہل ہند ترکی سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔جن کے متعلق قرۃ العین حیدر اہل ہند کو حوصلہ اور ہمت علامہ اقبال کی زبانی دیتی ہے۔

اب ہندی مسلمان جمہوری ترکی اور مصطفیٰ کمال کے عشق میں مبتلا ہو چکے تھے...... ہندی مسلمان

اپنے نوزائیدہ لڑکوں کے نام انور پاشا، جمال پاشا، کمال پاشا، مدحت پاشا رکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔ ناؤ ماختہ و محمل گراں۔عسا کر عثمانیہ کے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا۔حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے البتہ مصطفیٰ کمال، عصمت پاشا انور بے، خالدہ خانم جوانان تتاری کس قدر صاحبِ نظر نکلے۔آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا۔اگر عثمانیوں پہ کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے۔جہاں میں اہل ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں۔[۱۶۸]

مصطفیٰ کمال نے اتحادیوں کے پنجہ غلامی سے آزادی حاصل کی تو عالم اسلام بالخصوص اہل ہند کی نظران کی طرف متوجہ ہوئیں مگر انھوں نے مغربی تہذیب کی کوارانہ تقلید کی اوران کی ناعاقبت اندیش اصلاحات کو اپنایا جس سے عالم اسلام میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور مسلمانوں کو گہرے رنج و الم کا سامنا کرنا پڑا۔لہٰذا ان کی مجددیت سے اسلام کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ترکی اور ایران نے ان چیزوں کو اپنانا شروع کیا جن کے مضر احساسات خود یورپ کو ہو چکے تھے۔لہٰذا انھوں نے قرآنی تعلیمات کی پیروی کرنے کی بجائے یورپی تعلیمات کو درس حیات بنایا۔جس سے علامہ اقبال کو اتاترک سے ناامیدی ہوئی۔

میری نوا سے گریبان لالہ چاک ہوا
نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
میری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دارورسن کی تلاش میں ہے ابھی[۱۶۹]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی مانند اہل ترک سے ناامید اور مایوس ہیں۔وہ انھیں ایک مذہبی علامت تصور کرتی ہیں۔تحریک خلافت جس کے لیے اہل ہندوستان نے بے شمار قربانیاں دیں تھیں۔آج اہل ترک اس سے لاعلم نظر آتے ہیں۔حتیٰ کہ وہ اسلام دوستی کے جذبات سے بھی عاری نظر آتے ہیں۔البتہ اہل ترک میں اسے ایک خاص خوبی نظر آئی جو اِس دور میں بھی مائیں اپنے بیٹوں کو محاذ جنگ پر بھیجتی تھیں۔علاوہ ازیں قرۃ العین حیدر کو اہل ترک کے اس رویہ سے مایوسی ہوئی۔

یہ ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔مذہبی اور قومی جذباتیت کا ایک اور سمبل کیا شاندار ترک ہے۔پلونہ، اورنہ اور سالونیکا سب ایک جھنکار کے ساتھ کانوں میں گونج گئے۔وہ کوریا سے لوٹ رہا ہے اور یو۔این۔او کا ایک اہم رکن ہے۔کوریا کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا تھا۔اس نے ترک

بریگیڈ کا ذکر کیا اور ترکی جمہوریت کا۔ میں نے جنرل فخری پاشا کا قصہ اسے سنایا جو میرے ابّا کے بہت پیارے دوست تھے اور جنرل انور پاشا اور کمال اتاترک وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت تحریک کی داستان میں نے اس کے گوش گزار کر دی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چارے اور اسلامی دوستی کے جذبے پر کچھ ٹھنڈا پانی پڑھ گیا۔ وہ اطمینان سے صرف یو۔ این۔ او میں اپنے کام کا تذکرہ کرتا رہا۔ پھر اس نے قدرے جذباتیت سے اپنی بوڑھی ماں کا ذکر کیا جو بیمار تھی اور جس نے اس کی روانگی کے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے تم کو آزادی اور سچائی کی فتح کی خاطر کوریا بھیج رہی ہوں کامران لوٹنا۔ بیٹوں کو لڑائیوں پر بھیجنا ترک ماؤں کی اچھی خاصی ہوبی اور عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ [۱۷۰]

قرۃ العین حیدر اور کشمیر

قرۃ العین حیدر کو مئی ۱۹۷۹ء میں کشمیر سیاحت کی غرض سے جانے کا اتفاق ہوا۔ جس کے متعلق انھوں نے اپنی تصنیف گلگشت میں تفصیلاً کشمیر کے بارے میں بیان کیا ہے۔

کل رات سون مرگ میں برف پڑی تھی۔ یہ مئی ۱۹۷۹ء کا مہینہ ہے اور اتر پردیش اور بہار میں لوگ لُو سے مر رہے ہیں۔ سون مرگ کے مکانوں کی چھتوں پر سے برف پگھل رہی ہے۔ ہوٹل کے سبزہ زار پر متمول ہندوستانی سیاحوں کا ہجوم ہے۔ [۱۷۱]

قرۃ العین حیدر کو کشمیر میں جا کر علامہ اقبال بے ساختہ یاد آتے ہیں۔ علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی ذات سپرو گوت (کشمیری پنڈت) تھی۔ ان کے متعلق علامہ اقبال کے بیٹے جاوید اقبال نے بھی بیان کیا ہے۔

ایک قلمی رجسٹری شدہ دستاویز میں اقبال نے اپنی قومیت سپرو (کشمیری پنڈت) تحریر کی ہے۔ انھوں نے اپنے والد سے سن رکھا تھا کہ ان کا تعلق کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے ہے۔ گوت ان کی سپرو ہے۔ اور ان کے جدِ اعلیٰ جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا بابا لول حج یا لولی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ [۱۷۲]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کے متعلق تصور کرتی ہیں کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے ہندوؤں کے روپ میں زندگی بسر کرتے ہوں گے اور کشمیر کے ایک حیرت انگیز مارتنڈ مندر کے آثار جو اسے رومن کھنڈر معلوم ہوتے ہیں اس میں عبادت کرتے ہوں گے۔ اس کے متعلق وہ علامہ اقبال کی ایک نظم ''آفتاب'' (ترجمہ گایتری) کا حوالہ دیتی ہیں۔

اور عین ممکن ہے اقبال کے لاتی ومناتی آباؤ ''گامنتری منتر'' پڑھتے اس رفیع الشان مندر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوں۔

اے آفتاب! روح وروان جہاں ہے تو
شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو[۱۷۳]

اسی بنا پر علامہ اقبال کو اپنے قدیم وطن کشمیر سے گہری محبت تھی وہ اپنے آپ کو اس آبائی وطن کی شدید محبت میں محکوم ومجبور وفقیر تصور کرتے تھے اور اسے کبھی ''ایران صغیر'' کہتے اور کبھی گلے زخیابان جنت کشمیر کا لقب دیتے ہوئے حجاز مقدس کا رتبہ دیتے ہیں۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر[۱۷۴]
تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز ونوا زشیراز است[۱۷۵]

اقبال کی مانند قرۃ العین حیدر بھی کشمیر کو مقدس گردانتے ہوئے حضور پاک ﷺ کا شہر مدینہ قرار دیتی ہے کیونکہ سری نگر کی مسجد میں حضور پاکؐ کے موئے مبارک پڑے ہوئے ہیں۔جس وجہ سے کشمیر کا رتبہ قرۃ العین حیدر کی نظر میں بھی بلند وبالا نظر آتا ہے۔

پونے تین سو سال قبل ایک بزرگ خواجہ نورالدین موئے مبارک سری نگر لائے۔اسے جہانگیر کی بنوائی ہوئی مسجد میں محفوظ کیا گیا شاعر نے تاریخ کہی۔

کشمیر مدینہ شد از موئے نبیؐ[۱۷۶]

۱۹۰۷ء میں چند معززین روشن دماغ افراد نے انجمن کشمیریاں کی بنیاد ڈالی جو عرصہ دو سال کے بعد ختم ہوگئی۔اقبال نے زمانہ طالب علمی میں (فروری ۱۸۹۶ء) کو کشمیری عوام پر ظلم وستم کا اظہارِ ہمدردانہ کرتے ہوئے منظوم تحریر کیں۔بعدازاں انہوں نے ''انجمن کشمیریاں جموں کا حشر'' ایک مضمون میں تحریر کیا جو ستمبر ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا اور کشمیری میگزین میں اکتوبر ۱۹۰۹ء میں رباعیات بھی شائع ہوئیں۔

کشمیر پر مسلمانوں کی ۱۳۲۰ء سے ۱۸۱۹ء تک حکومت رہی۔اس عرصہ میں شمیری خاندان، چک خاندان، مغلیہ خاندان، افغان خاندان برسراقتدار رہے۔افغان خاندان نے اہل کشمیر کو لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا۔یہ دور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یکساں تھا۔۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء تک سکھوں کی کشمیر پر حکومت رہی۔۱۶/مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزوں کے ساتھ معاہدہ امرتسر قرار پایا اور

انگریزوں نے گلاب سنگھ کے ہاتھوں کشمیر فروخت کیا اور ظلم و ستم کی انتہا کشمیر میں جاری رکھی۔ علامہ اقبال نے کشمیریوں پر اس ظلم و ستم کے متعلق اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے۔ اسی ظلم و ستم کے متعلق قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار میں بیان کیا ہے۔

کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقان پیر...... کشمیر کے حالات کبھی یکساں نہیں رہے، زلزلے، قحط سیلاب، مکانوں چوبی مکانوں کی آتش زدگی، حکام اور بادشاہوں کے مظالم، اس فنکار، نرم مزاج اور جفاکش، بقول اقبال، زیرک ادراک، خوش گل، قوم نے کم از کم ریکارڈ ہسٹری کے دو ہزار سال میں تمام آفات سماوی وارضی کو نہایت صبر سے جھیلا ہے۔ انحطاط سلطنت مغلیہ ۱۸۵۳ء میں کشمیر پر احمد شاہ درانی نے تسلط جمایا۔ ۱۸۱۶ء میں سکھوں نے

قوم سکھاں وارد کشمیر شد

کشمیر میں پٹھان، خالصہ اور ڈوگرہ راج کے مظالم ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

پرسیدم از خرابی گلشن ز باغبان
افغان کشید و گفت کہ خراب کرد افغان

ادھر جموں کے یہاں گلاب سنگھ نے اپنے آقا سلطان خاں کو رنجیت سنگھ کے حوالے کیا۔ صلے میں سکھ فوج میں عہدہ پایا۔ ڈوگرہ بغاوت فرو کرنے کے صلے میں رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۰ء میں جموں گلاب سنگھ کو جاگیر میں دے دیا۔ ۱۸۴۱ء میں جب انگریزی فوج جلال آباد میں تھی گلاب سنگھ نے انگریزوں کی مدد کی۔ ۱۸۴۶ء میں سکھوں کے خلاف جنگ میں بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس وفاداری کے انعام میں ۱۶/مارچ ۱۸۴۶ء کے روز امرتسر میں انگریزوں نے کشمیر مبلغ چالیس لاکھ روپے میں گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا۔

دہقان وکشت وجوئے خیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند[۱۷۷]

قرۃ العین حیدر نہ صرف کشمیری مسلمانوں اور ہندوؤں پر ہونے والے ظلم و ستم کے احوال پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ انگریزوں کو بھی مسلمانوں کے ظلم و ستم کے اظہارِ غم کرنے پر سکھوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارتے دکھاتی ہے۔

۱۸۳۳ء میں ایک انگریز لفٹیننٹ کرنل تھروپ سیاحت کے لیے کشمیر آیا تھا۔ امیرزادی پر عاشق ہوا۔ اس سے نکاح کر کے لندن لے گیا۔ ان کا بیٹا رابرٹ تھروپ ۱۸۶۵ء میں کشمیر آیا۔ یہاں کے بھیانک حالات دیکھ کر اس نے *Miss Governance in Kashmir* کے عنوان

سے کتاب لکھی۔ کچھ عرصہ بعد وہ نوجوان کوہ سلیمان پر مردہ پایا گیا۔[۱۷۸]

علامہ اقبال جون ۱۹۲۱ء میں پہلی بار کسی مقدمہ کے سلسلے میں کشمیر گئے۔ مولوی احمد دین اور منشی طاہرالدین ان کے ساتھ تھے۔ اقبال اپنے احباب کے ہمراہ شالامار باغ، نشاط باغ سری نگر میں گئے وہاں نشاط باغ میں پیام مشرق کی ایک نظم ''ساقی نامہ'' تحریر کی۔[۱۷۹]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی کشمیر میں آمد کی تصدیق کرتے ہوئے یہ بتاتی ہیں کہ انھوں نے نشاط باغ میں بیٹھ کر ''ساقی نامہ'' تحریر کیا اور کشمیر کی دکھی عوام اور عہد ماضی کے متعلق تحریر کیا۔

نشاط باغ میں بیٹھ کر جون ۱۹۲۱ء میں علامہ اقبال نے ساقی نامے میں لکھا تھا۔۔۔۔۔۔اقبال کے مشہور ساقی نامے کا پہلا مصرع ہے۔۔۔۔۔اقبال نے نشاط باغ میں بیٹھ کر کشمیر کے شاندار ماضی کو یاد کیا اور اپنے عہد کی زبوں حالی پر آنسو بہائے۔ اقبال سے قبل فارسی شعرا نے کشمیر کے مغلیہ باغات پر شعر کہے تھے۔[۱۸۰]

اقبال ایک درددل رکھنے والے شاعر تھے۔ انھوں نے کشمیریوں کی تباہی و بربادی دیکھ کر رنجیدگی کا اظہار کیا اور ان کی غم ناکی اور جذباتی وابستگی سے اپنے کرب کا اظہار عہدِ ماضی کی روشنی میں کیا۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
سینہ افلاک سے اٹھتی ہے آہ دردناک
مردحق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستان بے دردی ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقان پیر
آہ یہ قوم نجیب وچرب دست وتر دماغ
ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر[۱۸۱]

علامہ اقبال نے کشمیریوں پہ ڈوگرہ کے ظلم وستم کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک میں حصہ لیا حتیٰ کہ ہندو راجہ کی حکومت نے اقبال کا کشمیر میں داخلہ ممنوع قرار دیا مگر آہستہ آہستہ تاریخ کشمیر کے عمیق مطالعہ سے علامہ اقبال کی فکر اور شاعری میں آزادی کشمیر کے لیے تڑپ بڑھتی گئی۔ کشمیر کی ممتاز ہستیوں یعنی حضرت سید علی ہمدانیؒ، ملا طاہر غنی اور ملازادہ ضیغم کا ذکر اکثر آیا ہے مگر سب سے زیادہ آزادی کشمیر کی آرزو اور دردناک اشعار جاوید نامہ کے باب ''آں سوئے افلاک'' میں موجود ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی کشمیر سے متعلق مندرجہ بالا تحریر کی روشنی میں دلچسپی اور

آزادی کے متعلق اپنی تصنیف گلگشت کے باب ''خانقاہ معلیٰ کے مجاہد'' کے عنوان میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ علامہ اقبال آزادی کشمیر اور کشمیر کے افراد سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں اظہار کرتی ہے:

جاوید نامے میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی اور طاہر غنی کاشمیری والی نظمیں کشمیر کے متعلق ہیں اور ارمغان حجاز میں شامل ''ملازادہ ضیغم لولابی'' والی نظم (پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب، مرغانِ سحر، بڑی فضاؤں میں ہیں بے تاب، اے وادی لولاب) بہت مشہور ہیں اور مظفر آباد ریڈیو سے روزانہ گائی جاتی ہے۔ اسی طرح کشمیر کے کلیشے بن چکے ہیں۔ (ابھی ابھی معلوم ہوا کہ اس رپورتاژ کا عنوان بھی سرینگر کے ایک روزنامے کے روزانہ کالم کی سرخی ہے) جاوید نامہ میں زندہ رود شاہ ہمداں سے کشمیریوں کے متعلق کہتا ہے۔

دست مزداد بدست دیگراں
ماہی رودش بہ شست دیگراں

اور سوال کرتا ہے۔

ما فقیر و حکمراں خواہد خراج
چیست اصل اعتبارِ تخت و تاج

ارمغانِ حجاز میں۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
کہہ رہا ہے داستان بے دردی ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقان پیر
آہ یہ قوم نجیب وچرب دست وتر دماغ
ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر
چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گہرہیں آب ولر کے تمام یک دانہ[۱۸۲]

کشمیر میں شہمیری خاندان کی حکومت ۱۳۵۴ء تا ۱۳۷۳ء تک رہی۔ سلطان شہاب الدین کے دور حکومت میں حضرت سید علی ہمدانیؒ کشمیر میں وارد ہوئے۔ یہ پہلا کشمیری بادشاہ تھا۔ جس نے کشمیر سے نکل کر بیرونی فتوحات کا سلسلہ جاری کیا۔ جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے انھیں

خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے۔

عمرہا گل رخت بربست وکشاد
خاک ما دیگر شہاب الدین نزاد[۱۸۳]

قرۃ العین حیدر نے سلطان شہاب الدین کی عظمت کو سراہا جنھوں نے کشمیر میں اسلام کو فروغ دیا گو کشمیر میں بیسیوں سلاطین برسر اقتدار رہے مگر وہ قرۃ العین حیدر کی نظر میں علامہ اقبال کی مانند اوّلین نمبر پر تھے جسے وہ علامہ اقبال کی زبان اور اشعار میں بیان کرتی ہے۔

کشمیر پر ۲۰ سلاطین نے حکومت کی ان میں سے سلطان شہاب الدین اقبال کا ہیرو ہے۔

خاک ما دیگر شہاب الدیں نزاد

۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان شہاب الدین سید السادات امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیر میں وارد ہوئے۔[۱۸۴]

علامہ اقبال جاوید نامہ کے باب ''آں سوئے افلاک'' میں سید علی ہمدانیؒ جو کشمیر میں شاہ ہمدان کے نام سے مشہور ہیں۔ کشمیر کے سلسلہ میں ان کی مذہبی کاوشوں کو سراہا ہے۔ شاہ ہمدان اپنے سات صد احباب کے ہمراہ سلطان شہاب الدین غازی کشمیر ۱۳۷۲ء میں کشمیر آئے۔ شاہ ہمدان مذہب، اخلاقیات، سیاسیات کے عالم کے علاوہ فارسی کے شاعر بھی تھے۔[۱۸۵]

اقبال جاوید نامہ میں مولانا روم کے ہمراہ شاہ ہمدان سے متعارف ہوئے مولانا روم شاہ ہمدان کے متعلق بتاتے ہیں جسے علامہ اقبال نے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

سید السادات سالار عجم
دست او معمارِ تقدیر امم
مرشد آں کشور مینو نظیر
میر درویش و سلاطین را مشیر[۱۸۶]

قرۃ العین حیدر نے بھی سید السادات امیر کبیر سید علی ہمدانی کے متعلق علامہ اقبال کے اشعار کی روشنی میں کشمیر کے لیے، مرشد، میر و درویش اور بادشاہوں کا مشیر قرار دیا ہے اور اس کی تاریخ پیدائش بتاتے ہوئے اس کا خاندانی سلسلہ بیان کیا ہے اور کشمیر میں ان کی آمد کی تصحیح یلدرم اور اقبال کے استاد پروفیسر آرنلڈ کے حوالے سے کی ہے۔ کشمیر میں ان کی آمد کی مشکلات بیان کی ہیں کہ آپ کیسے ایران، افغانستان اور کشمیر کے دروں، پہاڑوں اور گھاٹیوں کے راستوں سے پہنچے۔ وہ ان کی عظمت کا اعتراف علامہ اقبال کے جاوید نامہ کے حوالے سے کرتی ہیں۔

۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان شہاب الدین سید السادات امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیر میں وارد ہوئے۔

مرشد آں کشور مینو نظیر
میر و درویش وسلاطین را مشیر

سید علی ہمدانی ۱۳۱۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ایران کی کبریٰ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو سہروردی سلسلے کی ایک شاخ تھی۔ حضرت علی ہمدانیؒ اپنے ہمراہ سات سو سادات (سر تھامس آرنلڈ نے دی پریچنگ آف اسلام میں بھی یہی تعداد لکھی ہے۔) ایرانی ہنرمندوں، صناعوں، فنکاروں اور قالین بافوں کا ایک بڑا گروہ ہمراہ لے کر تشریف لائے وہ ایک تاریخ ساز کارواں تھا جو ایران، افغانستان اور کشمیر کے دروں، پہاڑوں اور گھاٹیوں کو عبور کر کے وادی کشمیر میں پہنچا۔ شاہ ہمدان نے وادی میں اسلام پھیلایا۔ اقبال جاوید نامہ میں فرماتے ہیں:

سید السادات سالار عجم
دست او معمار تقدیر امم
خطہ را آں شاہ دریا آستین
داد علم وصنعت و دین
آفرید آں مرد ایران صغیر
باہنر ہائے غریب و دل پذیر[۱۸۷]

علامہ اقبال کشمیر کے حسن سے بے حد متاثر ہوئے اور ''ساقی نامہ'' میں وادی کشمیر کے حسین ترین خطہ نشاط باغ میں تحریر کیا۔ جس میں انھوں نے جھیل وُلر کی فسوں کاری کی ہے۔ جس سے واقعی جنت کے نظارے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نظم کے پہلے آٹھ اشعار قابل نظر ہیں۔

خوشا روز گارے، خوشا نو بہارے
نجوم پرن رست از مرغزارے
لب جو خود آئی غنچہ دیدی
چہ زیبا نگار، چہ آئینہ دارے
چہ شیریں نوائے، چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوت شاخسارے[۱۸۸]

قرۃ العین حیدر کو وادی کشمیر میں ایک یادگار جھیل وُلر جس کا رقبہ ایک سو پچیس مربع میل پر پھیلا

ہوا ہے۔ اب جس کا رقبہ کم ہوتا جا رہا ہے، بے حد پسند آئی اور یہ اس قدر خوبصورت ہے کہ اس کا حسن دیکھ کر خدا یاد آ جاتا ہے اور علامہ اقبال کے نزدیک کشمیر ایک ایسا خطہ ہے جہاں انھیں خدا بے حجاب نظر آیا۔ جس کا اظہار کرنے کے لیے قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کے شعر کا سہارا لیتی ہے۔

ٹیکسی اب جھیل وُلر کے کنارے کنارے جا رہی ہے وُلر جس کے لیے اقبالؒ نے کہا تھا۔

کوہ و دریا و غروب آفتاب

من خدا را دیدم اینجا بے حجاب

لیکن ولر کا منظر بدل رہا ہے جھیل کا رقبہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ دلدل بڑھ گئی ہے۔ دھان اُگانے کے لیے جھیل پائی جا رہی ہے۔ اب خواجہ خضر بھلا کیا سوچیں گے ولر کنارے۔ [۱۸۹]

قرۃ العین حیدر مزید کشمیر کے خوبصورت نظارے اور خوبصورت درختوں کے حسن و رعنائی کا منظر بیان کرتے ہوئے چتر نار وادی کشمیر کے خوبصورت ترین علاقے کے بارے میں آگاہ کرتی ہے۔ یہ علاقہ بڑا پُر امن اور پرسکون ہے۔ شاید علامہ اقبال نے اس کے متعلق ہی کہا تھا: چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے'' قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں یوں بیان کرتی ہے:

چتر ناری وادی کشمیر کے خوبصورت ترین علاقوں میں سے ہے۔ سیاحوں کی یلغار سے محفوظ، پرسکون اور پرامن، فارسٹ لاج کے کنارے پائین کے گھنے جنگل میں کوئی مستقل بول رہی ہے۔

چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے

کہ می آید از خلوت شاخسارے

(اقبال)

بہت دور سفید گلاب اور لیورنڈ کی جھاڑیوں کے اس پار جھیل وُلر نظر آ رہی ہے اور سلسلہ کوہ، سبز اور نیلگوں۔ باغ کے نیچے چشمہ بہہ رہا ہے۔ باد بہار موج موج مرغِ بہار فوج، صلصل و ساز زوج زوج۔ [۱۹۰]

علامہ اقبال نے کشمیری عوام کی خستہ حالت دیکھی تو ان کا دل افسردہ ہونے لگا اور ان کی بے سروسامانی پر خون کے آنسو بہائے۔ ''ساقی نامہ'' میں یہ مشہور شعر اسی حقیقت کا اظہار کرتا ہے:

بریشم قبا خواجہ از محنت او

نصیب تنش جامہ تار تارے [۱۹۱]

علامہ اقبال کا ''ساقی نامہ'' شائع ہونے کے بعد ۱۹۲۴ء میں سری نگر کے مزدوروں نے ریشم کے کارخانہ میں تنخواہ بڑھانے کے لیے ہڑتال کی۔ اس ہڑتال کو ''ریشم خانہ کی بغاوت'' کے نام

سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اقبال کی دوررس نگاہ نے صورت حال کو قبل از وقت جانچ لیا تھا جو اس کے تخلیقی ذہن کا وجدان تھا۔ جس کا درجہ ''جز و است پیغمبری'' کے متماثل تھا۔ قرۃ العین حیدر نے کشمیر کے مزدور کی حالت اس ہڑتال کے بعد بہتر انداز میں بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال کے تخلیقی ذہن کو داد دی ہے۔

نشاط باغ میں بیٹھ کر جون ۱۹۲۱ء میں علامہ اقبال نے ساقی نامے میں لکھا تھا۔

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامہ تار تارے

آج ۱۹۷۹ء میں سری نگر کے نئے کروڑ پتی تاجروں کا مال ساری دنیا میں جاتا ہے۔ ان کی وجہ سے ایک نیا دولت مند طبقہ وجود میں آ چکا ہے۔ لیکن کشمیری کاریگروں کی حالت نسبتاً پہلے سے بہتر ہے...... گوجر مزدور سب سے زیادہ خستہ حال ہیں۔ چیتھڑوں میں ملبوس سانولے سیاہ داڑھیاں۔ کشمیریوں سے نسلاً مختلف۔[192]

علامہ اقبال نے جس دور میں ''ساقی نامہ'' تحریر کیا تھا کشمیری مسلمانوں میں پیر پرستی انتہا پر تھی۔ اقبال انھیں اوہام پرست دیکھنے کے خواہاں نہیں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ مزاروں، درگاہوں اور خانقاہوں سے نکل کر جہاد زندگانی میں حصہ لیں۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری[193]

اقبال نے اہل کشمیر کے دکھ و درد کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور کشمیریوں کی پسماندگی اور بدبختی کا سبب ایک مصلح کی حیثیت سے تعلیم کے فقدان میں نظر آیا۔ وہ اہل کشمیر کو حصول تعلیم کی طرف راغب دیکھنے کے خواہاں تھے مگر کشمیری خانقاہوں اور مدرسوں میں جو تعلیم دی جا رہی تھی۔ وہ اسرار خودی اور رموز بے خودی کے منافی تھی اور ان کی تعلیم کشمیریوں کے لیے زہر قاتل کا سامان پیدا کر رہی تھی۔ اقبال نے ایسے تخریبی عناصر کے خلاف آواز اٹھائی۔

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ
کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ مے خانہ
یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے
کہ خود حرم ہے چراغ حرم کا پروانہ[194]

قرۃ العین حیدر بھی جب کشمیر پہنچیں تو انھوں نے کشمیری عوام کو پیر پرستی میں ملوث پایا۔ اس

سلسلہ میں مسلمان تو درکنار ہندو بھی شامل تھے، البتہ علامہ اقبال کی فکر مندی کی بنا پر کشمیری عوام حصول تعلیم کے لیے کوشاں نظر آئی اور آزادی کشمیر کے لیے سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں وضاحت کرنا چاہتی ہیں کہ کشمیری عوام نے تو ہم پرستی نہیں چھوڑی البتہ تعلیم اور سیاست میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

حضرت بل میں مغرب کی اذان ہوئی۔نزدیک کی ایک کوٹھی کے لان پر موجود نوجوان کشمیری ہندو ڈاکٹر نے کھڑے ہو کر حضرت بل کی طرف نمسکار کیا......جموں کے باشندے کالج کے تعلیم یافتہ نوجوان ہندو ڈرائیور نے ٹیکسی روکی۔درگاہ کا مجاور لپکا ہوا آیا۔ڈرائیور نے اسے دو روپے دیئے اور ٹیکسی آگے بڑھائی......بنگال میں بھی سارے برصغیر کی طرح بہت سے اولیاؒ کے مزار موجود ہیں۔جن پر ہندو اور مسلمان اسی طرح اظہار عقیدت کرتے ہیں۔[۱۹۵]

قرۃ العین حیدر نے کشمیری لڑکیوں کے حصول علم کے سلسلہ میں بے پردہ گھومنے کا منظر ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے:

حضرت بل کے نزدیک کشمیر یونیورسٹی کیمپس پر سینکڑوں مسلمان بے پردہ لڑکیاں اطمینان کے ساتھ پڑھائی میں مصروف ہیں...... باہر بازار میں اسکول اور کالج یونیفارم میں ملبوس بے پردہ لڑکیوں کی ٹولیاں۔[۱۹۶]

قرۃ العین حیدر کشمیریوں کی تعلیم و تربیت کا احوال بتاتی ہیں کہ کشمیری اب حصول تعلیم کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔وہ دور گیا جب وہ خانقاہوں میں پڑے رہتے تھے۔جن کے متعلق علامہ اقبال نے یوں کہا تھا۔

تیرے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری[۱۹۷]

علامہ اقبال کے ان افکار کی روشنی میں قرۃ العین حیدر کشمیریوں کے حصول تعلیم اور بیداری کشمیر کے متعلق تذکرہ کرتی ہیں۔

ایک نوے سالہ بزرگ حاجی کوثر علی شان افغانستان سے تشریف لائے تھے واپس نہیں گئے۔سوائے عیدین کے سال کے بارہ مہینے روزے رکھتے ہیں۔بے حد سویٹ بزرگ ہیں اور سچے فقیر اور انتہائی روشن خیال۔مکان کے سامنے ایک چشمہ جاری ہے۔وہیں پر انھوں نے ایک سکول قائم کیا ہے۔جس میں آٹھویں جماعت تک انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔اسکول کی سہ منزلہ چوبی عمارت زیر تعمیر ہے لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔سفید شلوار، اودی قمیض اور اودے

اسکارف کا یونیفارم پہنے بچیاں کلاس کے بعد حاجی صاحب کے اسکول سے نکل رہی ہیں۔انھیں سیاست سے بھی دلچسپی ہے۔انھوں نے آج کل کے اہم سیاسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام حرف حق ہے۔[۱۹۸]

سری نگر کے چند تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ایک ''ریڈنگ روم پارٹی'' تشکیل دی۔اس کے سربراہ خواجہ محمد مقبول پنڈت محکمہ مال کے سپریٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔اس کے رفقا کار میاں نظام الدین،خواجہ غلام احمد عشائی اور میر ہدایت اللہ مقرر ہوئے۔اس مسلم ایسوسی ایشن نے مسلمانوں کی بیداری کے لیے کوشش کی جس سے غیور کشمیری بیدار ہوئے۔

اسی دور میں ایک ڈوگرہ سپاہی لبھو رام نے قرآن مجید نذر آتش کر دیا۔اس نازیبا حرکت پر مسلمان سیخ پا ہوئے۔جون ۱۹۳۱ء کو حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی خانقاہ معلیٰ کی تاریخی مسجد میں مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔جس میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل نوجوان شیخ عبداللہ نے کشمیری مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ اس قدر دردناک کھینچا کہ سامعین کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں وضاحت کرتی ہیں:

۲۵/جون ۱۹۳۱ء کے روز حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی خانقاہ معلیٰ کے صحن میں زبردست جلسہ منعقد ہوا۔تحریک زور پکڑ گئی پولیس فائرنگ سے سترہ اشخاص شہید ہوئے......۲/ستمبر ۱۹۳۱ء کو شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد ۲۵ ہزار کے مجمع پر پولیس نے گولیاں چلائیں۔خون کے دریا بہہ گئے۔ پولیس نے سنگینوں کی نوک سے عورتوں کو بھی زخمی کیا۔[۱۹۹]

اسی دور میں ایک اور نوجوان کشمیری عوام کو علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں درس حیات دیتا تھا جسے ڈیڑھ برس سلاخوں کے پیچھے بسر کرنا پڑے۔بقول قرۃ العین حیدر:

اسی زمانہ میں خانقاہ معلیٰ کے جلسے میں ایک نوجوان ''سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ'' والا شعر پڑھا جس کی پاداش میں اسے ڈیڑھ سال کی سخت سزا ہوئی۔[۲۰۰]

کشمیر کے اس غم اندوہ واقعہ سے علامہ اقبال پریشان ہوئے تو غنی کاشمیری علامہ اقبال سے جاوید نامہ میں فرماتے ہیں۔آپ کو قطعاً مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ کشمیریوں کے دل سے حرارت ختم نہیں ہوئی۔برف کے انبار تلے کئی شرارے موجود ہیں جو بجھے نہیں بلکہ آپ نے جھیل ولر کی وہ بات نہیں سنی کہ ایک روز ولر کی ایک موج دوسری موج کو بتا رہی تھی کہ آئیں اور ساحل کے ساتھ ٹکرا جائیں۔

ہیچ میدانی کہ روزے در ولر
موجہ می گفت با موج دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم
خیز تا یک دم بساحل سرزنیم[۲۰۱]

قرۃ العین حیدر شیخ عبداللہ کی کاوشوں کو سراہتی ہے کہ انھی کے دم سے کشمیری مسلمان اور ہندو متحد ہوئے اور وہ بقول علامہ اقبال غنی کاشمیری کی حوصلہ افزائی سے خوش ہوئی کہ کشمیری لوگ بھی حق خود ارادیت کے لیے جاگ اٹھے ہیں۔ جس کا اظہار وہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں یوں کرتی ہے:

شیخ عبداللہ کے ایما پر کشمیری مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ جدوجہد کا آغاز ہوا...... جون ۱۹۳۹ء میں صادق صاحب کی زیرصدارت مسلم کانفرنس کشمیر کے مسلمانوں، ہندوؤں سکھوں کی مشترکہ ''نیشنل کانفرنس'' میں تبدیل کردی گئی۔ سیاسی جدوجہد کے دوران مہاراجہ کی پولیس فائرنگ سے کئی عورتیں بھی شہید ہوئیں۔

جاوید نامہ میں غنی کاشمیری فرماتے ہیں:

ہیچ میدانی کی کہ روزے در ولر
موجہ می گفت با موج دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم
خیز تا یک دم بساحل سر زنیم[۲۰۲]

علامہ اقبال نے کشمیر کی منظر نگاری کی فسوں کاری کے لیے ایک نظم ''کشمیر'' تحریر کی جس میں انھوں نے کشمیر کے حسن کی گلکاریاں بکھیری ہیں۔

رخت بہ کاشمر کشا، کوہ وتل ودمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بیں، لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج، مرغ بہار فوج فوج
صلصل و ساز زوج زوج، برسر ناروں نگر[۲۰۳]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی اس نظم ''کشمیر'' کے پہلے مصرع ''رخت با کاشمیر کشا'' کے عنوان کو اپنی تصنیف گلگشت میں ایک باب کا نام دیتے ہوئے کشمیر کے افراد پر علامہ اقبال کے افکار کے اثرات بیان کیے ہیں کہ کشمیری عوام نہ صرف مذہبی طور پر مسلمان ہے بلکہ علامہ اقبال

کے مذہبی افکار سے بھی آشنا ہیں۔ وہ ایک وقت میں خدا کی عبادت کرتے ہیں تو دوسرے لمحے کلامِ اقبال گنگناتے ہیں۔

یہ ایک عاشق رسول صوفی منش قوم ہے ڈرائنگ روم کے دریچے میں ایک روز فجر کے وقت ایک ملازم با آواز بلند اس طرح نماز پڑھ رہا تھا گویا خدا اور اس کا رسول ﷺ اس کے سامنے موجود ہیں۔اور وہ والہانہ ان سے مخاطب۔ دوسری شام وہی ملازم باغ میں ''عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں'' گنگناتا سنائی دیا۔[۲۰۴]

علامہ اقبال نے اہل کشمیر کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا، جس پر کشمیریوں نے عمل کرتے ہوئے ۱۹۴۷ء کو کشمیر کے کچھ حصے کو ہندو بنیے کی غلامی سے آزاد کروایا جسے آج آزاد کشمیر کہتے ہیں ان شاء اللہ بقیہ حصہ بھی اقبال کے درج ذیل پیغام کی روشنی میں آزاد کروالیں گے۔

خواجہ از خون رگِ مزدور ساز لعل ناب

از جفائے دہِ خدایان کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب[۲۰۵]

قرۃ العین حیدر کشمیر کے متعلق بتاتی ہے کہ کشمیر ابھی مکمل طور پر آزاد نہیں ہوا۔ انگریز کشمیر کی تقسیم پر مذاق اڑاتے ہیں جبکہ قرۃ العین حیدر کشمیر کے حصول کو زندگی اور موت کا مسئلہ تصور کرتی ہیں، جبکہ ہندو آزاد کشمیر کے آزاد ہونے پر اسے مقبوضہ کشمیر قرار دیتے ہیں۔

''کشمیر؟'' ایک انگریز تماشائی نے پوچھا۔ ''کشمیر یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ''روشن نے کہا۔ یہ لوگ جو گا رہے ہیں کون سے کشمیر سے آئے ہیں۔؟ مقبوضہ یا آزاد؟'' تماشائی نے سوال کیا۔

''دونوں طرف کا کشمیر ایک دوسرے کے لیے آزاد اور مقبوضہ ہے۔'' گلشن نے کہا۔''[۲۰۶]

قرۃ العین حیدر اقوام متحدہ کے اراکین کو بھی کشمیر کے مسائل کے متعلق آگاہ کرنا چاہتی ہیں مگر ان کے کانوں تک جوں نہیں رینگتی۔ البتہ انھیں انڈین فلمیں دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ وہ اس بات کا بھی اظہار کرتی ہیں کہ برطانوی لوگوں کو ہمارے مسائل سے کیا سروکار ہے۔ ہم لاکھ انھیں اپنے درد و غم سے آگاہ کریں انھیں مطلق پرواہ نہیں ہے۔

ہم کتنا ہی ان کو اپنے ریفیوجی پرابلم، اپنے کشمیر کے کیس اور ترقی کی اسکیموں کے متعلق بتائیں لیکن پڑھے لکھے طبقے کے ایک مخصوص حصے کے علاوہ ایک عام برطانوی مرد یا عورت کو یہ جاننے کی مطلق خواہش یا پروا نہیں ہے۔ بیلےِ یا نمی اور دلیپ کمار کی فلم آن دیکھنے کے لیے لندن کا عام شہری گھنٹوں

لیٹر اسکوائر میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے کیو لگائے صبر و اشتیاق سے کھڑا رہتا ہے۔[۲۰۷]

علامہ اقبال کے عطا کردہ افکار کی روشنی میں آج بھی کشمیری حصول کشمیر کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور ہندو سامراج کے ظلم و ستم سے نبرد آزما ہو رہے ہیں۔ جس سے آہیں، آنسو اور چیخ و پکاران کا مقدر بن چکا ہے۔ بین الاقوامی دباؤ اور اخلاق سے قطع نظر بھارت کشمیریوں کے حق آزادی کو وحشیانہ اور ظالمانہ تنگ نظری سے کچل رہا ہے۔ ہزار ہا کشمیری آزادی کی راہ میں شہید ہو چکے ہیں۔ کشمیری افکارِ اقبال کو آنکھوں کا سرمہ تصور کرتے ہوئے حصولِ کشمیر کے لیے کوشاں ہے۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر نے کشمیریوں کے حصول کشمیر کی کاوشوں اور آرزوؤں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔ یہ لوگ جنگ اور انجام اور ڈان پڑھتے ہیں کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔[۲۰۸]

قادیانیت

علامہ اقبال ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور حبِ رسولؐ کا واضح اظہار بڑی عقیدت کے ساتھ رموز بے خودی میں رکن دوم میں ''رسالت'' کے عنوان سے کیا ہے مگر جب مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک عروج پر پہنچی تو اقبال اس تحریک کی کارکردگی سے نالاں ہوئے۔ بقول علامہ اقبال:

ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا۔ جب ایک نئی نبوت بانی اسلام سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا، بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک کارکن کو اپنے کانوں سے آنحضرتؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔[۲۰۹]

اقبال نے قادیانیت کے متعلق مئی ۱۹۳۵ء میں ایک مفصل مضمون ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' تحریر کیا جس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔ بعد ازاں جون ۱۹۳۵ء میں اسٹیمن اخبار کو ایک مراسلہ بیان کی صورت میں تحریر کیا۔ جس پر پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت کی۔ اقبال نے پنڈت کو اس صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے جنوری ۱۹۳۶ء میں ایک طویل مضمون ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ جس میں واضح کیا گیا کہ برصغیر میں ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد اسلام کی زوال پذیری کے لیے یورپی اقوام پیش پیش ہیں۔

میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے زوال اور انحطاط

کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی اس قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن اس میں نہ وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لیے ہندوستان میں پیدا کیے تھے۔ روس نے بابی مذہب کو روا رکھا اور بابیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنا پہلا تبلیغی مرکز عشق آباد میں قائم کریں۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز ووکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے لیے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بنا پر کیا ہے یا وسعت نظری کی وجہ سے؟[۲۱۰]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے اسی مضمون کی روشنی میں قادیانیوں کی سرگرمیوں کا احاطہ کیا ہے کہ قادیانیوں کو انگریزوں کی پشت پناہی حاصل ہے اور انگریزوں نے ان کا تبلیغی مرکز ووکنگ کی مسجد قرار دیا ہے اور یہ مسجد بھی ایسی تھی جس کے متعلق وہ علامہ اقبال کے اشعار کا حوالہ بھی دیتی ہیں۔

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں[۲۱۱]

قرۃ العین حیدر قادیانیوں کی مسجد ووکنگ کے امام کے متعلق بھی علامہ اقبال کے حوالے سے بڑے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بتاتی ہیں۔ جس میں خواجہ کمال کے لڑکے نے امامت کروائی تھی۔ اسی خواجہ کمال الدین نے علامہ اقبال کے اعزاز میں دسمبر ۱۹۱۱ء کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دہلی میں یہ کلمات کہے تھے۔ ''کہاں کا ہے تو ڈاکٹر اقبال! خدائے تعالیٰ تجھے دین و دنیا میں با اقبال رکھے'' آج وہی لوگ انگریزوں کی بھیڑ چال میں قادیانیت کو فروغ دے رہے ہیں۔

عیدین کے مواقع پر سارا مسلمان کالٹین ووکنگ کی مسجد میں جمع ہوتا تھا۔ ایک عید الفطر پر میں اور امینہ ٹرین سے ووکنگ جا رہے تھے۔ ڈبے میں چند کالٹین فوجی افسر سوار تھے۔ وہ بھی ووکنگ جا رہے تھے۔ دور سے مسجد کے گنبد نظر آئے۔ امینہ نے پہلے اس مسجد کے بارے میں ای ایم فاسٹر کا مضمون جو وہ ساتھ لائی تھی پڑھا پھر اچانک نہایت جذبے سے کہنا شروع کر دیا۔ ''دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں''۔ کالٹین افسروں نے انگشت بدنداں ہو کر اسے دیکھا اسٹیشن آ چکا تھا۔ ہم لوگ جلدی سے پلیٹ فارم پر کود گئے۔ ابا جان ۱۹۲۴ء کی بقر عید کے روز ووکنگ کی مسجد میں آئے تھے اور اماں کو خط میں لکھا تھا مسجد میں ہندوستانی، انگریز، مسلمان، ترک، عرب، مصری سب تھے۔ خواجہ کمال الدین کے لڑکے نے نماز پڑھائی اور انگریزی میں وعظ کیا۔[۲۱۲]

علامہ اقبال کے متعلق مختلف آرا ہیں کہ انھوں نے قادیانیت کی مخالفت کیوں کی؟ بعض

ناقدین اسے سیاسی صورت حال کے پیش نظر قرار دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔جن میں میاں امیر الدین جو یونینسٹ پارٹی کے سربراہ سر فضل حسین کے دوست تھے۔ان کے نزدیک اقبال نے ایک قادیانی سر ظفر اللہ خاں کو وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کی رکنیت حاصل ہونے پر احمدیت کے مخالف ہوئے کیونکہ اقبال خود اس منصب کے زبردست خواہاں تھے جو کہ تعصب کی بنا پر وہ ایسی رائے رکھتے تھے۔[۲۱۳]

اقبال کو صرف قادیانیت کے فروغ سے فکر مندی تھی۔جس وجہ سے سر ظفر اللہ خان کی مخالفت کرتے تھے۔جس کے متعلق قرۃ العین حیدر نے بھی اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قادیانی اپنے مذہب کے فروغ کے سلسلہ میں قادیانیوں کو ہی اہمیت دیتے تھے۔اور وہ قادیانیوں ہی میں شادیاں کرتے ہیں۔جس بنا پر قرۃ العین حیدر نے بھی گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ظفر اللہ خاں کی کردار کشی کی ہے۔

چوہدری ظفر اللہ خاں بدر ممانی کو طلاق دے کر دوسری شادی کر چکے تھے۔ایک روز آپا نفیسہ کے ہاں انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کی دوسری بیوی جو بہت ہی کمسن تھی۔ملک سوریہ کی جماعت احمدیہ سے تعلق رکھتی تھی اور کیمبرج میں پڑھ رہی تھی جب اسے خواب میں بشارت ہوئی کہ وہ چوہدری صاحب سے شادی کرے۔[۲۱۴]

علامہ اقبال پر بعض افراد نے الزام عاید کیا کہ وہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء میں مرزا غلام احمد کی زیر بیعت رہے جس کی تردید میں اقبال نے گاہے بگاہے بیان دیئے۔البتہ علامہ کے بھائی شیخ عطا محمد نے احمدیت قبول کی مگر ان کے بیٹے شیخ مختار احمد کے بقول احمدیت ترک کر کے جماعت سے رشتہ ختم کر لیا۔اقبال کی وفات کے بعد ان کے بھائی کو سنی قبرستان میں دفن کیا۔شیخ عطا محمد کے بیٹے شیخ اعجاز احمد اور ان کے احباب نے احمدیت کے مطابق نماز جنازہ پڑھی۔شیخ عطا محمد کے متعلق جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں۔

شیخ عطا محمد ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے اور انھیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنایا گیا۔ان کے جنازے میں راقم بھی شریک تھا۔نماز جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خاں نے پڑھائی۔[۲۱۵]

علامہ اقبال شیخ اعجاز احمد کے احمدی ہونے کے متعلق سر راس مسعود کو ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء کے ایک مراسلہ میں بتاتے ہیں۔

شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے۔نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقاید کی رو سے قادیانی ہے۔[۲۱۶]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کے احمدی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے خالو میر افضل علی کے متعلق بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ احمدی تھے۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر نے اپنے احمدی خاندان کے متعلق بھی بتایا ہے کہ میر افضل علی کے ہاں چوہدری ظفر اللہ خاں اور شیخ اعجاز احمد اسی سلسلہ میں آتے جاتے رہتے تھے۔ جس کے متعلق میر افضل علی نے نذر سجاد کو ایک خط میں ان الفاظ میں بتایا:

کل ظفر اللہ خاں آ رہے ہیں۔ اعجاز احمد بھی ہمراہ ہوں گے۔ ڈاکٹر لطیف کو دہلی سے میرے معائنے کے لیے لا رہے ہیں۔ ان کا کمرہ اور بڑا غسل خانہ ظفر اللہ کے لیے اور ان کے بعد آپ کے لیے لیس ہو رہا ہے۔ بس اس کے بعد دسمبر میں مع تھوڑے سے سامان اور مع دونوں بچوں کے تشریف لے آئیں۔[۲۱۷]

قرۃ العین حیدر نے اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد کے احوال کی مانند اپنے خالو میر افضل علی کی صورت حال بیان کی ہے اور علامہ اقبال کے خاندان جیسے حالات اپنے خاندان کے حالات بتائے ہیں کہ میر افضل علی بھی ساری عمر قادیانی رہے مگر بعد از موت انھیں بھی ان کے آبائی مسلک کے مطابق دفن کیا گیا جیسے شیخ عطا محمد (برادر اقبال) کو دفن کیا گیا تھا۔

گھر میں مستقل لمبی لمبی نمازیں پڑھی جا رہی تھیں۔ میر افضل علی ایک ہر دل عزیز انسان تھے لاہور کی سنی مساجد میں نماز جمعہ کے بعد ان کے لیے دعا کی گئی تھی۔ قادیان میں دعائیں کی جا رہی تھیں...... افضل خالو کو خون کی الٹیاں آنی شروع ہو گئیں...... افواہ پھیلی کہ سر ظفر اللہ خاں دہلی سے آ گئے ہیں اور جنازے کو جنت البقیع قادیان لے جانا چاہتے ہیں۔ حسنین ماموں نے فوراً اعلان کیا۔ ہم سب کی گواہی میں اللہ جنت نصیب کرے بھائی جان مرحوم نے وصیت کی تھی کہ ان کی تجہیز و تکفین ان کے باپ دادا کے طریقے پر کروائی جائے۔ زوال سے پہلے پہلے لاہور شہر کے ایک شیعہ مجتہد نے آ کر ان پر نماز جنازہ پڑھائی...... میر افضل علی اپنے بڑے ماموں میر فیض العسکری کے پہلو میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔[۲۱۸]

قرۃ العین حیدر اور افغانستان

امیر کابل حبیب اللہ خان نے ۱۹۱۸ء میں ملک میں عسکری قوت میں اضافہ کرتے ہوئے تعلیمی اصلاحات نافذ کیں۔ چنانچہ حبیبیہ کالج کابل میں ہندی اساتذہ موجود تھے جو علی گڑھ یا لاہور کے کالجوں سے پڑھے ہوئے تھے۔ حربیہ سراجیہ مدرسہ میں ترکی فوجی افسران نوجوانوں کو

فنونِ حرب سکھاتے اور قرآن مجید کی تعلیمات سے روشناس کرتے اور افغانستان کو ممالک اسلامیہ کے اتحاد کے طور پر روشناس کرواتے تھے۔

حکومت برطانیہ کے لیے ''سنٹرل ایشین کونشچین'' کا یہ نازک ترین دور تھا جبھوں پار روسی ریچھ غراتا تھا۔ سرحدی پٹھان اونٹوں کے ذریعے امیر کابل حبیب اللہ خان کی امداد کے لیے خانہ ساز بندوقیں اسمگل کرنے میں مصروف تھے۔[۲۱۹]

امیر حبیب اللہ خان افغانستان کو ملت اسلامیہ کی آزادی کے طور پر ابھی تیار کر رہے تھے کہ ۲۰ر فروری ۱۹۱۹ء کو انھیں قتل کیا گیا اور اس کا بیٹا امیر امان اللہ خان تخت نشین ہوا تو اس نے افغانستان کی مکمل حصولِ آزادی کے لیے نادر خان کی زیر کمان تیسری اینگلو جنگ لڑی۔ انگریزوں نے ۸ر اگست ۱۹۱۹ء میں معاہدہ راولپنڈی کی رو سے افغانستان کو ایک آزاد ملک تسلیم کیا اور ہندوستان اور افغانستان کی مشترکہ سرحد ڈیورنڈ لائن کے نام سے قائم کی۔ علامہ اقبال امیر امان اللہ کی اس کارکردگی سے متاثر ہوئے اور اپنی تصنیف پیام مشرق کے دیباچہ کے بعد پیش کش میں امیر امان اللہ خاں کے نام عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں فرمانروائے دولت مستقلہ افغانستان خلد اللہ ملکہ وجلالہ۔[۲۲۰]

امیر امان اللہ کے دور حکومت میں ہندوستان میں آزادی تحریک روز بروز بڑھتی گئی۔ بغاوت اور احتجاج روزمرہ کا معمول بن گیا۔ امیر امان اللہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالم اسلام میں ہر کہیں برطانوی سامراج کے مخالف رہا اور اقبال کے بیان کو اپنے اسلامی انقلابی خوابوں کو عملی تعبیر کی امیدوں کا محور بنایا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر یوں اظہار کرتی ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ امان اللہ خان غازی نے اپنے بل سے یورپ کے نقشے کو ایشیا والوں کو معقول سمجھایا اور خداداد مملکت افغانستان کے نام کو مستقل جاوید حریت بخشی۔ یہ روحانیت اور نام زندگی مسلم ہے۔[۲۲۱]

برطانوی سازشوں نے روز بروز اضافہ کرتے ہوئے امیر امان اللہ خان کو افغانستان میں افغان قبائل کے ساتھ متحد نہ ہونے دیا اور بچہ سقہ نے اس کے خلاف برطانوی شہہ پا کر بغاوت کی جس بنا پر وہ برطانوی طیاروں کے تعاون سے کابل پر قابض ہو گئے۔ قرۃ العین حیدر امیر امان اللہ خاں کی جرأت مندانہ قدم کی داد دیتی ہیں کہ انھوں نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا مگر وہی امیر امان اللہ جس نے ڈیورنڈ لائن کا معاہدہ کیا تھا۔ اسے اپنوں کی بغاوت کے سبب ملک بدر ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں اسے داد دیتی ہیں۔

امیر امان اللہ خان دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان...... ہزمیجسٹی امان اللہ خان شاہ

افغانستان نے اپنے رعب داب سے برطانیہ کے غرور کا بُھرتہ بنایا...... ہز میجسٹی جلالۃ المللۃ والدین امیر المومنین امیر امان اللہ خلد اللہ ملکہٗ کا برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ، پشاور چھاؤنی سے اڑنے والے پتلے پتلے مچھروں کی طرح بھنبھناتے برطانوی بمبار طیارے ہرات و کابل و غزنی کا سبزہ نورس۔ فورتھ اینگلو افغان وار۔ شہ۔ مات۔[۲۲۲]

علامہ اقبال کو اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان محمد نادر شاہ نے وزارت معارف کابل میں ایک یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں مدعو کیا۔ اقبال نے نادر شاہ سے توقعات کا اظہار کیا کہ وہ قوم کی بھلائی کے لیے کام کریں۔

مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مرد کامل مل گیا ہے جس کا وہ عرصہ سے انتظار کر رہا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی شخصیت کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیا میں ایک نئی قوم بنا کر دنیا میں متعارف کروائیں۔[۲۲۳]

علامہ اقبال کو افغانوں کی بے اتفاقی اور ناچاکی پر گہرا دکھ ہے کہ افغانستان زندگی اور سیاست کے میدان میں سب سے زیادہ پیچھے ہے لہٰذا اقبال نے افغانوں کو اسلامی اتحاد پیدا کرنے کی تلقین کی۔

بتان رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی[۲۲۴]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی زبانی افغانوں کو متحد ہونے کا درس دیتی ہیں۔

''نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی''[۲۲۵]

علامہ اقبال افغانوں کو خودی کا درس دیتے ہیں کہ چاہے انگریزوں کی غلامی کا طوق پہن کر انگریزی خلعت پہن لو خواہ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر خوددار اور غیرت مند بن جاؤ۔ لہٰذا وہ انھیں احساس دلاتے ہیں کہ اپنی خودی پہچانو۔ چنانچہ اقبال نے اس سلسلہ میں ''محراب گل افغان کے افکار'' کی نظم میں افغانوں میں ہمت، حوصلہ، شجاعت، عزم و استقلال کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے افغانوں کو خودی بیدار کرنے کا درس دیا ہے۔

اے میرے فقر غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک
رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان اُو غافل افغان[۲۲۶]

قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم ۱۹۰۸ء میں امیر حبیب اللہ (والدِ میر امان اللہ) کے بھائی امیر یعقوب اللہ خان کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے تھے۔ ان افغانوں نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جس بنا پر یلدرم افغانوں کے معتقد تھے اسی لیے قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار میں ان کی عظمت کو داد دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر نے کار جہاں دراز ہے میں علامہ اقبال کے ایک مصرع ''افغان باقی، کہسار باقی'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک باب کا عنوان تجویز کیا ہے اور افغانوں کو علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں حریت عمل پر اکساتے ہوئے خودی کا درس علامہ اقبال کی زبانی دیا ہے۔

چنانچہ اے میرے غیور فیصلہ تیرا ہے کیا۔ خلعت انگریز یا پیراہن چاک چاک؟ تو بھی اے فرزند کوہستان اپنی خودی پہچان۔ بلے بلے۔ خوب می شناسم آغا۔ امیر حبیب اللہ خاں برادر زادہ امیر یعقوب خاں اسیر کوہ منصوری آ؟ٹ۔ افغان باقی، کہسار باقی، الحکم للہ! الملک للہ۔[۲۲۷]

اقبال افغانوں کے متعلق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہوتے۔ اگرچہ انھیں سکندر و نادر جیسے حکمرانوں نے بار بار لوٹا مگر اس غیور و جسور قوم کو ہرگز زوال نہیں۔ جس وجہ سے وہ افغانستان کے مستقبل سے پرامید ہیں۔

کڑکا سکندر بجلی کی مانند
تجھ کو خبر ہے اے مرگ ناگاہ
نادر نے لوٹی دلی کی دولت
اک ضرب شمشیر افسانہ کوتاہ
افغان باقی، کہسار باقی
الحکم للہ، الملک للہ[۲۲۸]

قرۃ العین حیدر افغانوں کی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے آگاہ کرتی ہیں کہ وہ جس حال میں بھی ہوں زندگی کو رضائے الٰہی کے مطابق بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ چاہے انھیں انگریز کا وظیفہ خوار ہونا پڑے، خواہ بڑھاپا ان پر ظلم ستم ڈھائے۔ وہ دستر خوان پر جمہوری انداز ضرور اپناتے ہیں۔ یہی افغانوں کی ایک خصوصیت انھیں زندہ رکھے ہوئے ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے نظریات کی روشنی میں آگاہ کرتی ہیں۔

سردار عمر خان عرض کرتے ہیں، خاصہ تیار ہے۔ انگریزوں کا پنشن خوار، امیر اللہ کا نام لے کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مسند سے اٹھتا ہے۔ دوسرے کمرے میں دستر خواں بچھا ہے۔ بھاپ اٹھتی ہوئی قابیں

رکھی جاتی ہیں افغان ہمیشہ سے جمہوری رہا ہے۔ دسترخوان پر بوڑھا بادشاہ، بھائی بھتیجے، رشتہ دار اور خدام ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔ بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ جس حال میں رکھے اس کا شکر ہے۔ افغان باقی، کہسار باقی، الحکم اللہ الملک اللہ۔[۲۲۹]

علامہ اقبال نے سفر افغانستان کے متعلق ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اخباری بیان دیا:

تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان کا بہترین دوست ہوگا۔ کابل میں نئی یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کی سکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیانی علاقے میں بسنے والے ہوشیار افغان قبیلوں کی سدھار میں بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی...... ہندوستانی ہونے کے ناطے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی زیادہ سے زیادہ امداد کریں۔[۲۳۰]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں وضاحت کرتی ہیں کہ تعلیم یافتہ افغانستان اور ہندوستان آج بہترین دوست ہیں اور ادب دوستی کا بہترین مظاہرہ بھی کر رہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اپنے والد محترم کے ایک دوست کو ضرب کلیم دیتے ہوئے اقبال کے افکار کی روشنی میں فرض پورا کرتے ہوئے ان کی زیادہ سے زیادہ امداد کی۔ علامہ اقبال کی پیش گوئی کے متعلق قرۃ العین حیدر اشارہ کرتی ہیں کہ افغانی کلام اقبال پر عمل اور مطالعہ کرتے ہیں۔ جس کے متعلق علامہ اقبال نے ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو خواب دیکھا تھا۔

مجھے اس وقت یاد آیا۔ ایک افغان شہزادے سردار عمر خان جب نمبر ۲۰ کرزن روڈ دہرہ دون کے پہلو کے روشن برآمدے میں آکر بیٹھا کرتے تھے اور ابا جان کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ ایک بار میں نے ضرب کلیم میں سے "رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان۔ تو بھی اے فرزند کوہستان اپنی خودی پہچان" ان کو دی تھی اور اٹک اٹک کر اس نظم کو پڑھ رہے تھے۔[۲۳۱]

اقبال اور سر راس مسعود کی ملاقات والیِ افغانستان نادر شاہ سے "قصر دلکشا" میں ہوئی تو اقبال نے نادر شاہ کو قرآن مجید کا تحفہ پیش کیا۔ نادر شاہ نے نماز عصر کی امامت کے لیے اقبال سے کہا مگر انھوں نے نادر شاہ سے ان الفاظ میں جواب دیا۔

نادر میں نے اپنی عمر کسی شاہ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزار دی ہے آج جبکہ خدائے فقیر کو اس مراد کو پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے؟ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھ کو کرنی ہوگی۔[۲۳۲]

قرۃ العین حیدر افغانوں کی مہمان نوازی، تعظیم، سادگی اور جوش ایمان سے متاثر ہیں۔ افغان مسلمانوں کی عزت و احترام کرتے ہیں اور مسلمان کو بھائی بھائی کا درجہ دیتے ہیں۔ چاہے وہ

بادشاہ ہو چاہے وہ خادم ہو۔ وہ سادات خاندان کی تعظیم مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی مانند افغانوں کی سادگی اور مذہبی جوش وخروش کی قائل نظر آتی ہیں اور علامہ اقبال کے افکار کا حوالہ دیتی ہے کہ اقبال افغانوں کی سادگی اور جوشِ ایمان پر عاشق تھے۔

روز دس بجے امیر کا دربار لگتا تھا۔ جس میں ان کے ساتھ افغان حسب مراتب بیٹھتے تھے۔ یلدرم کو اس میں حاضر ہونا بھی ضروری تھا۔ ان کے پہنچنے پر امیر یعقوب خاں تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ نوجوان افسر بے حد نادم ہوتا تھا اور امیر دہراتے تھے'' آل رسول ﷺ کا ادب واجب ہے۔'' سادات سے یہ بے پناہ عقیدت سوائے افغانوں اور پٹھانوں کے کسی مسلمان قوم میں نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ غالباً اس قوم کی سادگی اور دینداری ہے۔ (اقبال افغانوں کے اسی جوش ایمان اور سادگی پر عاشق تھے)۔[۲۳۳]

اقبال اسلامی مشرق کی بیداری کے سلسلہ میں افغانوں کی فکری وعملی تربیت کو اوّلین تصور کرتے ہیں۔ وہ امان اللہ خاں کے دورِ حکومت (۱۹۲۱۔۱۹۱۹ء) میں افغانوں میں ایک قومی اور صحیح انسانی سیرت کی تشکیل وتعمیر کی کاوش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور توقعات رکھتے ہیں۔ ان کی کاوشوں کے زیر اثر اقوام مشرق میں ایک نیا انقلاب رونما ہوگا۔ وہ اس انقلاب میں علوم جدیدہ کی روشنی میں عہد مصطفیٰ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور کے مسلمانوں کے فکر وعمل اور اقدار حیات کو از سر نو زندہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ اقبال نے افغانستان، مصر، ترکی، ایران اور ہندوستان، ہر جگہ اور ہر کہیں کے مسلمانوں کے زوال وانحطاط اور محکومی وپسماندگی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے امان اللہ خان کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ دین حق کے لیے سرمایہ قوت کا کردار ادا کریں۔

تازہ کن آئین صدیقؓ و عمرؓ
چوں صبا بر لالہ صحرا گزر
جاں تو بر محنت پیہم صبور
کوش در تہذیب افغان غیور
تا ز صدیقاں ایں امت شوی
بہر دیں سرمایہ قوت شوی[۲۳۴]
تا ز صدیقاں ایں امت شوی
بہر دیں سرمایہ قوت شوی[۲۳۴]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی وضاحت کرتی ہیں کہ ہندی مسلمان مشرق وسطیٰ

کے مسلمانوں پر اپنی جان نثار کرتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق ایران، افغانستان، ترکی اور سعودی عرب سے ہو لیکن مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں نے ان پر کبھی توجہ نہیں دی۔ قرۃ العین حیدر افغانوں کی ترقی پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔

سات دن ہو چکے اخباروں میں چھپا ہے کہ حبیب اللہ خان کچھ اصلاحات نافذ کرنے میں مشغول ہے۔ ''اصلاحات'' کی ہوا سارے مشرق وسطیٰ میں چل پڑی ہے۔ پچھلے سال برخوردار حبیب اللہ خان علی گڑھ کالج آیا تھا۔ انتہائی پر جوش استقبال اس کا کیا گیا۔ ہندی مسلمان مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں پر فدا ہو جاتا ہے۔ مستقل افغانوں، ترکوں، عربوں اور ایرانیوں کا غم کھاتا ہے۔ ان کی ترقی سے خوش اور ان کی ناکامیوں سے پژمردہ ہوتا ہے۔ ان کے لیے روتا، مسجدوں میں دعائیں مانگتا اور چندے جمع کرتا ہے۔ عجیب بات ہے ہم مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں نے کبھی ان بے چاروں کے متعلق سوچا نہیں۔ [۲۳۵]

ہسپانیہ

ہسپانیہ کو تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کی یہاں تقریباً آٹھ صدیاں حکومت رہی اور یہ اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا لیکن مسلمانوں کے زوال کے بعد اس ملک میں بے رونقی پھیل گئی اور یہ ملک زوال کا شکار ہوا۔ قرۃ العین حیدر ہسپانیہ کے متعلق ان الفاظ کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے:

مسلمانوں نے آٹھ سو سالوں تک ہسپانیہ کو یورپ کا دانش کدہ اور زرخیز ترین ملک بنائے رکھا۔ ان کے خاتمے کے بعد اندلس ایک بار پھر صحرا میں تبدیل ہوا۔ نہریں اور کھیت خشک، مدارس ویران۔ نئے مفلوک الحال عیسائی ہسپانوی قسمت آزمائی کے لیے سمندروں پر نکلے۔ بہت جلد بحیثیت ایک بددماغ بے رحم امپیریل بحری طاقت اپنے عرب ورثے کا غرور اور بانکپن اور موسیقی اور مورش طرز تعمیر ساتھ لیے وہ دنیا پر چھا گئے۔ [۲۳۶]

قرۃ العین حیدر ہسپانیہ کے زوال کا مورد الزام مسلم ریاستوں کے حکمرانوں کو ٹھہراتی ہیں جنھوں نے آپس میں خانہ جنگی شروع کی مگر انھوں نے جہاں نو پیدا کرنے کی بجائے آپس میں ایک دوسرے کو کمزور کر دیا۔ ان کی اس تباہی و بربادی اور کمزوری کو مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس حالی اور علامہ اقبال نے ''شکوہ'' میں تحریر کیا ہے۔ جس کا تذکرہ قرۃ العین حیدر بڑے گہرے رنج والم کے ساتھ کرتی ہیں۔

اب ذرا قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھو۔ اگر ہسپانیہ کی مختلف مسلمان ریاستوں کے حکمران بُری طرح آپس میں لڑ کر کمزور نہ پڑتے اور آخر میں عیسائیوں سے مغلوب نہ ہوتے تو کیا خود نئی دنیاؤں کی تلاش میں نہ نکل سکتے تھے۔ مگر خداوند تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ مولانا حالی مسدس اور علامہ اقبال ''شکوہ'' لکھیں۔[۲۳۷]

علامہ اقبال فروری ۱۹۳۳ء کو قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، قصر الحمرا اور حدیقۃ الزہرہ جو عبدالرحمٰن الداخل نے اپنی بیوی کے نام پر ایک محل تعمیر کروایا تھا۔ جس کے اب صرف کھنڈرات رہ گئے تھے۔ علامہ اقبال نے ان سب کی سیر کی مگر مسجد قرطبہ کی عمارت اِن کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی اور اُن کے جذبات کو ایسی رفعت عنایت کی جو انھیں اس سے قبل نصیب نہ ہوئی تھی۔ اقبال نے شیخ محمد اکرام کو ۲۷/ مارچ ۱۹۳۳ء کو اس کے متعلق ایک مراسلہ روانہ کیا۔

میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم ''مسجد قرطبہ'' پر بھی لکھی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔[۲۳۸]

علامہ اقبال نے تاریخ اسلام کے یہی افکار اور روحانی اضطراب اپنی قوم کو عطا کیے۔ قرۃ العین حیدر نے انھی افکار کو اپنا مقدر بنالیا اور اسی کی تڑپ میں اپنی زندگی بسر کر لی۔ ایسے ہی احساسات ان کی والدہ کے تھے جن کے متعلق قرۃ العین حیدر یوں بیان کرتی ہیں۔

دور سے جبل الطارق نظر آیا۔ اماں بہت مضطرب ہو کر کھڑکی سے لگی اس چٹان کو دیکھا کیں اور اقبال کے اشعار دہراتی رہیں۔ اس پوری نسل کو اقبال اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تجدید کے جذبے اور ماضی کے ورثے اور اس کی المناک گمشدگی کا بڑا شدید احساس تھا۔ حالانکہ ان لوگوں نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی۔[۲۳۹]

مسجد قرطبہ اسلامی دور کی قدیم روحانی یادگار ہے جو تعمیر جمالیات کی بہترین نشانی ہے۔ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد عیسائی راہب اس پر قابض ہو گئے اور مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر قرآنی آیات جو سنہری حروف میں تحریر تھیں۔ ان پر پلاسٹر کروا دیا۔ بعد ازاں عیسائیوں سے محکمہ آثار قدیمہ والوں نے مسجد واپس لے کر اس کی دیواروں کی صفائی کروائی تو تمام سابقہ نقوش ظاہر ہو گئے۔ جنھیں دیکھ کر علامہ اقبال کو قرآن اور اسلام کے مفہوم کی لذت محسوس ہوئی جو بیسیوں تفاسیر میں بیان کرنا مشکل ہے۔[۲۴۰]

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر[۲۴۱]

قرۃ العین حیدر ''مسجد قرطبہ'' کے ساتھ ساتھ ''قصر الحمرا'' کا جائزہ بھی لیتی ہیں۔ ''قصر الحمرا'' جس نے علامہ اقبال کو متاثر نہ کیا لیکن قرۃ العین حیدر کو ''مسجد قرطبہ'' کی مانند متاثر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس قصر کی دیواروں سے قرآنی آیات کندہ دیکھ کر مایوسی کا اظہار کرتی ہیں کہ کسی مسلم ملک یا مذہبی جماعت میں یہ جرأت نہیں کہ وہ حکومت ہسپانیہ سے اس قصر میں فائیو اسٹار ہوٹل بند کروائے بلکہ وہ نئے نئے امراکلمہ گو سے گلہ کرتی ہیں جو شراب پینے کی غرض سے وہاں جاتے ہیں۔

خلفائے اندلس کا آیات قرآنی سے منقش قصر الحمرا اب ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ اس کے کمرے میں دیوار پر کندہ قرآنی آیات کے عین نیچے بار ہے۔ نہ صرف یہ کہ آج تک کسی مسلم حکومت نے یا کسی ملک کی مذہبی اسلامی جماعت نے اسپینش گورنمنٹ سے اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا کہ کم از کم وہ شراب خانہ اس جگہ سے منتقل کر دیا جائے بلکہ نئے ارب پتی کلمہ گو جوق در جوق وہاں جاتے ہیں۔[۲۴۲]

علامہ اقبال نے ہسپانیہ کی سرزمین سے متاثر ہو کر (طارق بن زیاد کے اعزاز میں) ایک نظم ''طارق کی دعا'' تحریر کی۔

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ذوقِ خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی[۲۴۳]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی اس نظم ''طارق کی دعا'' سے متاثر ہوئی اور اپنے ایک افسانے کا عنوان ''یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے'' تجویز کیا۔ اور اسی نظم کے ایک شعر کے ایک مصرع ''قبا چاہیے، اس کو خون عرب سے'' کو مدنظر رکھتے ہوئے افسانہ تحریر کیا۔[۲۴۴]

علامہ اقبال نے ہسپانیہ کی سرزمین کے متعلق کئی ایک نظمیں تحریر کیں جن میں ''ہسپانیہ''، ''عبد الرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس'' اور ''مسجد قرطبہ'' ہیں۔ جن کے متعلق شیخ محمد اکرام کو ۲۷ر مارچ ۱۹۳۳ء کو تحریر کردہ ایک خط میں ان الفاظ کے ساتھ مطلع کرتے ہیں:

ہسپانیہ پر نظم یوں تو تمام تر پرسوز ہے لیکن طارق سے متعلق اشعار بالخصوص دلگداز ہیں۔ میں اسے محفوظ رکھوں گا اور کوشش کروں گا کہ یہ اشعار اردو میں منتقل ہو سکیں۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم ''مسجد قرطبہ'' پر لکھی جو کسی وقت شائع ہوگی۔[۲۴۵]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کو اردو زبان کی حسین ترین نظم قرار دیتے ہوئے اسے ''ری ایکشنری'' نظم تصور کرتی ہیں کہ اقبال نے یہ نظم ہسپانیہ کی عظمتِ رفتہ سے

متاثر ہو کر تحریر کی ہے۔

تقی میاں پبلک سروس کمیشن کو بھول کے، جوش میں آ کر ''مسجد قرطبہ'' شروع کر چکے تھے۔ دفعتاً انھوں نے ٹھٹھک کر کہا ''مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ری ایکشنری نظم ہے''۔ ''یہ اردو کی حسین ترین نظم ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ پلیٹ فارم پر پہنچ کر پائپ دوبارہ سلگاتے ہوئے تقی میاں نے فرمایا۔ اب یہ غور کرنا لازم ہے آیا کہ اقبالؒ کس حد تک پروگریسیو تھے اور کس حد تک ری ایکشنری۔[۲۴۶]

بقول قرۃ العین حیدر ''قرطبہ ہند'' فی الوقت مشرق کی بہترین اور برصغیر کی متمول ترین درسگاہوں میں سے ایک ہے جہاں سرسبز وشاداب سڑکوں پر دونوں جانب پھول ہیں اور ایک حسین ترین مسجد ہے۔ قرۃ العین حیدر ''مسجد قرطبہ'' کا عکس اس مسجد میں دیکھتی ہیں اور علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کی تمام خصوصیات کے حوالے سے بنظر غائر جائزہ لیتی ہیں کہ آج بھی کئی مساجد غیر آباد ہیں اور نمازیوں کو نماز پڑھتے ہوئے اکٹھے ہی قتل کیا جاتا ہے جس کا تذکرہ وہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں طنزاً کرتی ہے۔

قرطبہ ہند میں مسجد کے پھاٹک پر ایک پوسٹر چسپاں ہے۔ ایک پیاری بھولی ننھی بچی ردا میں لپیٹی، ہاتھ میں مشین گن سنبھالے کھڑی ہے۔ اس جگہ پر سورج ڈوبنے کا سماں بے حد سہانا معلوم ہوتا ہے (لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب) مسجد کو جانے والا ایونیو گھنے سایہ دار درخت سرسبز میدان کرکٹ پویلین، محرابوں والی پرانی عمارت جس کے کمروں میں ان بزرگوں کی دھندلی تصاویر آویزاں ہیں۔ جنھوں نے عالم اسلام کی تجدید و اتحاد کے خواب دیکھے، حسین مسجد (تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل، وہ بھی جلیل وجمیل) صحن میں اس مردِ خدا کا مزار، مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ۔ عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام (اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب، عہد کہن کو دیا اس نے پیغام راحیل) وہ ساری دھندلی تصاویر کن لوگوں کی ہیں۔ اجی تھے مر مرا گئے کب کے۔ مسجد کے پھاٹک کے پوسٹر پر وہ ننھی بچی مشین گن سنبھالے۔ فلسطینی بچی ہے؟ جی نہیں غور سے پڑھے۔ نیچے عبارت عربی میں نہیں ایک باریش ہندی نوجوان پوسٹر پر فخریہ نظر ڈالتا نماز کے لیے، مسجد کے اندر چلا جاتا ہے۔ ایک ہوں مسلم حرم کی...... واجب القتل ہیں۔[۲۴۷]

پروفیسر فتح محمد ملک قرۃ العین حیدر کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ انھیں ہسپانیہ بھلائے نہیں بھولتا اور اقبال کی مانند عظمت رفتہ کو اپنے ذہن کی زینت بنائے رکھتی ہیں اور عربوں پر اپنا

غصہ و بھڑاس نکالتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو ایک ہسپانیہ بھلائے نہیں بھولتا اور دوسرے پیٹر وڈالر پتی عرب پر غصہ اتارے نہیں اترتا۔ ہسپانیہ کا ذکر آتے ہی یہ خاتون عزیز، اقبال کی طرح عظمت رفتہ کے سہارے حیات آیندہ کے خواب دیکھنے بیٹھ جاتی ہیں۔[۲۴۸]

قرۃ العین خود ہسپانیہ کی محبت کا اعتراف کرتی ہیں کہ مجھے ''ہسپانیہ بھلائے نہیں بھولتا''[۲۴۹] لیکن درحقیقت انھیں علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' بھلائے نہیں بھولتی، جس کو انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی تہذیبی رمز، علامت اور اشارہ کی حیثیت سے دیکھا۔ وہ اس نظم کی رو سے معجزہ فن کی قائل نظر آتی ہیں۔ فن خواہ کسی بھی روپ میں ہو۔ مثلاً وہ روسیوں کے فن ادب کی داد بھی ''مسجد قرطبہ'' کی روشنی میں دیتی ہیں۔

روس اب تک با اقتدار وسیع امپریل طاقت بن چکا تھا......جس نے ایک عظیم الشان ادب تخلیق کیا کہ معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود۔[۲۵۰]

اسی طرح قرۃ العین حیدر زوال پذیر دنیا کو فانی تصور کرتی ہیں اور انھیں انسانی جسموں کے نقش و نگار اور حسن کے شاہکار سب منزل فنا اور عالم بے نشانی و گمنامی کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ لہٰذا وہ تصور وقت کو ظاہر کرنے کے لیے نظم ''مسجد قرطبہ'' کے اشعار کا حوالہ دیتی ہیں۔

چمپا کو اس پر بڑا ترس آیا۔ کیسا پیارا لڑکا تھا۔ اس میں ہری شنکر اور کمال کی کس قدر مشابہت تھی......اسی کو دیکھو جنے کہاں سے بہتا بہتا آنکلا۔ آیا تھا کسی دیس سے ہنس بیچارہ......سلسلہ روز وشب، نقش گر حادثات......نقش گر......وہ اپنے ذہن کو خالی کر کے بہت سی بے ربط باتیں سوچتی رہی تا کہ اس جذباتی لینڈ سیلائیڈ کو نظر انداز کر سکے۔[۲۵۱]

قرۃ العین حیدر اپنے ناولٹ سیتاھرن کے اختتام پر ''مسجد قرطبہ'' کے بند کے حوالہ سے تصور زمان ومکاں کی حقیقت کو بڑی چابکدستی سے واضح کرتی ہیں کہ زندگی زمان ومکاں کے مسلسل تغیر وحرکت کا دوسرا نام ہے۔ وقت ہر ایک کے اعمال کا جائزہ لیتا ہے۔ وقت کے فیصلے انسانی زندگی کو سنجیدہ بنانے اور عبرت دلانے کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ سیتاھرن میں نیم صوفیانہ، نیم فلسفیانہ بے نیازی کا تاثر پیدا کرنے کے لیے علامہ اقبال کے اشعار کا حوالہ دیتی ہیں۔

ابھی دن باقی ہے پھر رات ہوگی۔ پھر صبح ہوگی۔ ایک اور دن۔ ایک اور رات۔ سلسلہ روز شب نقش گر حادثات دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی نہیں لگا سکا ہے۔ تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ۔ سلسلۂ روز وشب صیرفی کائنات دن اور رات کا

حساب۔ زندگی کوئی تمہاری ڈوکومنٹری فلم ہے کہ لے کے ساری زندگی لونگ شاٹ کلوز میں سمیٹ دو۔ سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ۔[۲۵۲]

قرۃ العین حیدر کو "مسجد قرطبہ" سے والہانہ لگاؤ ہے جس کے لیے وہ بے تاب نظر آتی ہیں اور مسلم تہذیب کو اجاگر کرنے کی خواہاں ہیں۔ لہٰذا "مسجد قرطبہ" کی زیارت کے لیے ایک مسلمان لڑکا (عرفان) اور ہندو لڑکی (سیتا ہرن) اسپین جاتے ہیں، وہاں عرفان علامہ اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کے اشعار ایک پاکستانی طالب علم سے سن کر محظوظ ہوتا ہے جبکہ سیتا ہرن کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

خزاں کے موسم میں وہ دونوں اسپین گئے۔ وہاں مسجد قرطبہ کی سیڑھیوں پر چاندنی رات میں انھیں ایک پاکستانی طالب علم ملا، جس نے بے حد پیاری آواز میں گٹار پر اقبال کی نظم سنائی۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات

سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات

اب مجھے اس کا مطلب سمجھاؤ' سیتا نے عرفان سے کہا۔ بہت دیر تک اشعار کی تشریح کرنے کے بعد عرفان نے جھنجلا کر اس سے کہا۔ "تم اپنا کالی داس، تلسی داس کرتی رہو، اقبال تمھارے بس کی بات نہیں۔[۲۵۳]

قرۃ العین حیدر اپنی تصنیف ستمبر کا چاند میں کمبوڈیا کے انگ کور واٹ کے متعلق بتاتی ہیں جو کبھی روم کی مانند عظیم الشان تھا۔ اسی طرح چمپا، ملایا اور جاوا جیسے مما لک پہلی سے پندرھویں صدی تک قدیم ہند کی نوآبادیات پر مشتمل تھے۔ مشرق کے انام اور مغرب کے تھائی لوگوں کے حملوں نے انھیں پانچویں صدی عیسوی میں کمزور کر دیا۔ انگ کور کا مندر اب دنیا کے عجائبات میں شامل ہے مگر اندلس اور چمپا جیسے مما لک کی طرح آج دنیا میں ان کا کوئی نام لیوا نہیں۔ چنانچہ وہ پستی اور زوال کی جانب گامزن ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔ جن کے متعلق قرۃ العین حیدر گہرے دکھ کا اظہار علامہ اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کے حوالہ سے کرتی ہیں۔

انگ کور کا مندر، قرطبہ کی مسجد، اوّل و آخر فنا انگ کوروٹ آج بھی ایک خواب کی طرح موجود ہے...... مُردوں کا خاموش شہر...... چمپا مہاراج دھیراج سری جے اندرومن کا ملک سولہویں صدی میں قبلائی خاں کے حملہ آوروں نے ان ساری جگہوں کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔ اوّل و آخر فنا...... ظاہر و باطن فنا۔[۲۵۴]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی ایک نظم "مسجد قرطبہ" کے اشعار اور مصرعوں پر مشتمل اپنی تصنیف کارِ جہاں دراز ہے کے کئی ابواب کے نام بھی تجویز کئے ہیں جن میں "تار حریر دو

رنگ‘‘، ’’سلسلہ روز وشب‘‘ اور ’’تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا‘‘ شامل ہیں۔جس سے قرۃ العین حیدر کا علامہ اقبال کی نظم ’’مسجد قرطبہ‘‘ سے والہانہ لگاؤ ظاہر ہوتا ہے جسے وہ کبھی بھی فراموش نہیں کرسکیں۔قرۃ العین حیدر ہسپانیہ سے اس قدر مانوس نظر آتی ہیں وہ اسے کھو جانے پر اظہار افسوس کرتی ہیں کہ کاش کوئی معجزہ ہوتا کہ مسلمان اسپین نہ گنواتے۔

سوال یہ ہے کہ مدنیۃ الفاطمہ اور مدینۃ الزہرہ جیسے شہروں والا اسپین مسلمانوں نے کیوں کھویا۔کوئی معجزہ ہو جاتا۔[۲۵۵]

ہسپانیہ کے کھو جانے پر قرۃ العین حیدر یہ تصور کرتی ہیں کہ کاش سلطان محمود غزنوی کو علم ہو جاتا کہ مسجد قرطبہ عیسائیوں نے مسلمانوں سے چھین لی ہے تو وہ ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد سمرقند واپس جا کر آرام سے نہ بیٹھتا بلکہ مسجد قرطبہ کو عیسائیوں کے تسلط سے آزاد کرواتا۔

محمود یہ نہ جانتا تھا کہ خیالات کے صنم خانے ہمیشہ آباد رہیں گے دنیا کا نقشہ بدل چکا تھا۔قرطبہ کی مسجد میں عیسیٰ ابن مریم کے مجسمے سجا دیئے گئے تھے۔قسطنطنیہ کے کلیسائے صوفیہ کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔تموچن کا پوتا، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والا چغتائی ترک، دلی کو تہس نہس کر کے سمرقند واپس جا چکا تھا۔[۲۵۶]

فلسطین

علامہ اقبال ۶؍دسمبر ۱۹۳۱ء کو اتحاد عالم اسلام کے سلسلہ میں فلسطین کے شہر بیت المقدس پہنچے۔اسٹیشن پر منتظم موتمر اسلامی، مفتی اعظم سید امین الحسینی اور مولانا شوکت علی نے انھیں خوش آمدید کہا۔بعدازاں مسجد اقصیٰ میں نماز مغرب ادا کی اور محمد علی جوہر کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔[۲۵۷] قرۃ العین حیدر اپنے کزن سید عثمان حیدر اور محمودہ خاتون کے متعلق بتاتی ہیں کہ وہ بھی ۱۹۳۳ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر گئے اور زار و زار روئے۔

۱۹۳۳ء میں جب سید عثمان حیدر و محمودہ خاتون کا گزر یروشلم سے ہوا۔مسجد اقصیٰ کے نزدیک پہنچے۔زار و زار رونا شروع کیا۔ایک غریب الوطن کا مزار نظر آیا۔[۲۵۸]

موتمر اسلامی کا باقاعدہ اجلاس ۷؍دسمبر ۱۹۳۳ء کو ہوا۔جس کے صدر مفتی اعظم سید امین الحسینی اور نائب صدور میں علامہ اقبال بھی تھے۔اس اجلاس میں سات کمیٹیاں بنائی گئیں۔جن میں مسجد اقصیٰ کمیٹی، حجاز ریلوے کمیٹی، اماکن المقدسہ کمیٹی، تبلیغ دین کمیٹی، مالی کمیٹی، نشر و اشاعت کمیٹی اور قانون اساسی کمیٹی تھیں۔مسجد اقصیٰ کمیٹی نے بیت المقدس میں یونیورسٹی قائم کرنے کی

سفارش کی تو اقبال نے صیہونی خطرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے بیت المقدس کو طہران، قاہرہ، دمشق، مدینہ المنورہ وغیرہ سے کم اہمیت دی۔ حجاز ریلوے کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ پیش کی کہ حجاز ریلوے صرف وقف اسلامی ہے اور اسے غیر اسلامی حکومتوں کے قبضہ سے آزاد کروانا چاہیے۔ قرۃ العین حیدر اس حجاز ریلوے کے متعلق بتاتی ہیں کہ وہ کس طرح غیر اسلامی حکومت کے زیر اثر آیا۔

ترکی میں ریل ۱۸۵۶ء میں جاری ہو چکی تھی۔ ۱۸۶۶ء سے اناطولیہ میں برطانوی اور فرنچ سرمایہ سے ریلیں چل رہی تھیں۔ ۱۲/اگست ۱۸۸۸ء کے روز جب اورینٹل ریلویز کی ٹرین (جو بعد میں اورینٹ ایکسپریس کہلائی) پیرس سے روانہ ہو کر وی آنا اور دولت عثمانیہ کے یوروپین صوبوں سے گزرتی قسطنطنیہ میں شاخ زریں کے ریلوے اسٹیشن پہنچی۔ ترکی میں قومی جشن منایا گیا۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۹۰۲ء میں ایک جرمن کمپنی کو بغداد کا ٹھیکہ دے دیا۔ جس کی برطانیہ نے انتہائی مخالفت کی۔ برطانیہ اور جرمنی دونوں زوال پذیر دولت عثمانیہ میں اپنا اقتصادی اور سیاسی اقتدار بڑھانے کے درپے تھے۔ سلطنت ترکیہ کی زبردست تجارت اور عثمانی خاورمیانہ میں تازہ دریافت شدہ تیل کا استحصال دونوں بڑی طاقتوں کا مقصد تھا۔ فرانس کے موسیو لیپ نے خدیو سعید پاشا کو چونا لگایا تھا۔ نہر سویز کی اقتصادیات کے ذریعے برطانیہ مصر کا خون چوس کر اس پر اپنا تسلط جمارہا تھا۔ جرمنوں کی بنائی ہوئی بغداد ریلوے نہ صرف نہر سویز کی تجارتی حریف بن سکتی تھی بلکہ قیصر جرمنی اس کے ذریعے اپنی افواج ہندوستان پہنچا سکتا تھا...... اسی زمانے سے جرمن یہودیوں نے عثمانی فلسطین میں چھوٹی چھوٹی زرعی نو آبادیاں قائم کرنی شروع کیں۔ لہٰذا روس، برطانیہ اور فرانس نے بغداد ریلوے اسکیم کی شد و مد سے مخالفت کی کیونکہ اس کی وجہ سے ان کے اپنے مفادات پر زبردست ضرب پڑتی تھی لیکن بغداد ریلوے میں ترکی کا قومی مفاد بھی مضمر تھا۔[۲۵۹]

علامہ اقبال نے فلسطینیوں کی انھی کاوشوں کو سراہا اور ان کے متعلق منظوم ''ذوق و شوق''، ''شام و فلسطین''، اور ''فلسطینی عرب سے'' کے علاوہ مس فارقوہرسن اور جناح کے نام خطوط تحریر کیے۔ جن میں وہ انھیں لذت نمود کی خلش اور خودی کی پرورش کے لیے ابھارتے ہیں اور پیام خودی کے ذریعے مذہبی جذبات اسلامی احساسات اور ایمان و یقین کی روحانی کیفیات سوز وساز سے یاد دلاتے ہیں کہ زمانہ اس سے اب بھی محروم نہیں۔ وہ عربوں کو انھیں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جنگ حریت کے لیے مدعو کرتے ہیں کہ اغیار پر بھروسہ رکھنے کی بجائے خدا اور خودی پر بھروسہ رکھنا ان کے لیے سودمند ہے۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تیری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے[۲۶۰]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کے مندرجہ بالا افکار کی روشنی میں فلسطینی عرب سے یہی توقعات وابستہ رکھتی ہیں کہ وہ اپنی خودی کو بیدار کریں۔ ماضی کے دردناک حادثات و واقعات سے سبق حاصل کریں۔ وہ عربوں کی بدقسمتی کا رونا روتی ہے کہ کیسے کیسے مسلم ممالک براعظم افریقہ، یورپ اور ایشیا کے نقشوں سے معدوم ہوگئے اور ان پر یورپی عیسائی اور یہود قابض ہوگئے۔ وہ مسلمانوں کو آگاہ کرتی ہیں کہ اہل یورپ سے اچھی توقعات رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان کی خود جان یہود کے پنجہ میں گرفت ہے۔ وہ بھلا کیسے ان کو فلسطین آزاد کروا کر دے سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ اقبال کی طرح انھیں خدا اور خودی پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتی ہیں لیکن وہ جانتی ہیں کہ ترک و عرب ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ اس بات کا واضح اظہار علامہ اقبال کی زبان میں بڑے گہرے دکھ کے ساتھ کرتی ہیں کہ میں ان کی تمام تاریخ سے واقف ہوں۔

محمد فاتح اور سلیمان اعظم کی سلطنت یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے نقشوں سے معدوم ہوئی۔ قاہرہ، جدہ، بغداد، دمشق، یروشلم پر یونین جیک اپ، ہلال احمر ڈاؤن، فلسطین پر صیہوانیوں کی یلغار، اے فلسطین جواں، تیری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں۔ فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے۔ اب جا۔ کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستان۔[۲۶۱]

اقبال فلسطین سے گہری دلچسپی رکھتے تھے انھیں موتمر اسلامی کے سلسلہ میں دیگر اسلامی ممالک سے مل کر خوشی ہوئی جو مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے کوشاں تھے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے نمائندے کو انٹرویو دیا۔

سفر فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے وہاں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش، مصر، یمن، شام، عراق، فرانس اور جاوا کے نمایندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ان نوجوانوں میں اس خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی۔ جو میں نے اطالیہ کے فاشٹ نوجوانوں کے سوا کسی میں نہیں دیکھی۔[۲۶۲]

قرۃ العین حیدر فلسطینی مصیبت زدہ اور ظلم وستم کا نشانہ بننے والوں کے ساتھ گہری محبت اور دلچسپی رکھتی ہے لیکن وہ عربوں کی بے حسی اور لاپرواہی پر طنز کرتی ہیں یا بالفاظ دیگر اسے اقبال کی مانند عربوں میں وہ خلوص اور محبت اب نظر نہیں آتی جو کسی زمانے میں ان کے ہاں موجود تھی۔

رب المشرقین و رب المغربین، یعنی خداوند تعالیٰ نے جن اہل اسلام کو چھپر پھاڑ کر بذریعہ تیل

دولت عطا کی۔ وہ نیا پٹرو ڈالر پتی مسلمان فی الحال مونٹی کارلو اور لاس ویگاس جا رہا ہے اور جب تک اس دولت کو اڑا نہ لے گا انشااللہ جاتا رہے گا......ان عربوں کی بیویاں ناک پر لکڑی کی چونچ لگائے نقاب اوڑھے بیٹھی ہیں یہ لندن اور پیرس میں بے دریغ خریداری کر کے آ رہی ہیں اور اب امریکہ میں بے دریغ خریداری کریں گی۔ (کوئی مضائقہ نہیں اگر مصیبت زدہ فلسطینی عورتیں اپنے شکستہ خیموں میں بمباری کا نشانہ بنتی رہیں)۔[۲۶۳]

قرۃ العین حیدر کو ایسے پیٹرو ڈالر پتی عرب پر انتہائی افسوس ہوتا ہے جو اپنی دولت کے سبب فرنگی مقامات کی سیر کے لیے جاتے ہیں مگر جہانِ نو پیدا نہیں کرتے اور نہ ہی اتحاد و بیداری کا درس سیکھتے۔

صد حیف کہ جب جہان نو پیدا کرنے کی گھڑی آئی تو شیوخ حرم اپنے کنبے لے کے فرنگی مقامروں کی سمت پرواز کر گئے۔[۲۶۴]

علامہ اقبال نے ان کی اسی بے راہروی اور عیاشی کی طرف اشارہ ہی تو کیا تھا۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ[۲۶۵]

ایران

قرۃ العین حیدر نے سفر ایران ۱۹۷۰ء میں ملکہ فرح شاہ پہلوی زوجہ رضا شاہ پہلوی کی دعوت پر کیا۔ انھوں نے اس سفر کے متعلق اپنے تاثرات اپنی تصنیف کوہ دماوند میں ۵/جنوری ۱۹۷۰ء کو تحریر کیے، جب ایران میں تخت طاؤس ڈانواں ڈول تھا اور رضا شاہ پہلوی کی حکومت کا خاتمہ ہو رہا تھا۔[۲۶۶] اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر نے ایک تصنیف کوہ دماوند جس کا نام علامہ اقبال کے اس شعر سے متاثر ہو کر تحریر کی۔

مشکل ہے کہ اک بندہ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند[۲۶۷]

کوہ دماوند میں انھوں نے زوال ایران پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے کہ شاہ ناصر الدین قاچار اور اس کے بیٹے مظفر الدین شاہ قاچار نے مغربی تہذیب اپناتے ہوئے ایران کو رو بہ زوال کیا۔

شاہ ناصر الدین قاچار کے زمانے میں ایران کی حالت دگرگوں ہو چکی تھی۔ شاہ ناصر الدین قاچار (۱۸۴۷ء تا ۱۸۹۶ء) کے حرم میں ایک ہزار سات سو عورتیں تھیں۔ ان کے جانشین اور فرزند مظفر

الدین شاہ قاچار نے صرف چونسٹھ پر اکتفا کیا......۱۹۰۰ء میں موصوف (مظفرالدین شاہ) بغرض سیاحت یورپ گئے اور وہاں عیش وعشرت میں اس قدر روپیہ اڑایا کہ حکومتِ ایران کا دیوالیہ نکل گیا اور ملک کا انتظام چلانے کے لیے حکومت کو روس سے بھاری قرض لینا پڑا۔[۲۶۸]

شاہ قاچار نے نہ صرف روس سے قرض لیا بلکہ اُسے ایران کے بہت سے حصے سے ہاتھ دھونا پڑا۔جس کا قرۃ العین حیدر کو بہت رنج والم کا سامنا کرنا پڑا۔وہ اپنے دکھ کا مداوا روسی جبریت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال کے درج ذیل شعر میں تلاش کرتی ہیں:

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر[۲۶۹]

مملکت ازبک اور خاندان شیبان یعنی سائبیریا اور ماورالنہر کی تاتاری حکومتوں کا تختہ زارشاہی روس نے انیسویں صدی میں اُلٹا اور مزید جنگیں لڑکر بیس، اربیا، مولدیویا، رومانیہ، مشرقی آرمینیہ وغیرہ خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی سے اور جارجیا اور آذربائیجان ایران کے شاہان قاچار سے چھین لیے۔اب انہیں ڈھونڈ......[۲۷۰]

ان حالات میں رضا شاہ پہلوی نے ایران کے شاہ قاچار خاندان کی حکومت کو معزول کر کے شہنشاہیت کا عہدہ سنبھالا اور اتاترک کی مانند اپنے ملک کو جدید بنانے میں کوشاں ہوئے۔ بقول قرۃ العین حیدر:

اس اثنا میں پرشین کوزیگ بریگیڈ کے کرنل رضا خان احمد، شاہ قاچار کو معزول کر کے پہلے وزیر جنگ اور اب خود شہنشاہ بن چکے تھے اور اتاترک کی طرح اپنے ملک کو جدید بنانے میں کوشاں تھے۔[۲۷۱]

علامہ اقبال کو رضا شاہ کے برسر اقتدار آنے اور اس کی نئی اصلاحات سے بے حد توقعات تھیں کہ وہ ایران کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی ملک بنا کر طہران کو عالم اسلام کا مرکز بنائیں گے اور وہ ملتِ اسلامیہ کو مغربی سیاست کے پنجۂ آہنی سے چھٹکارہ دلا کر مغربی مادیت، وطنیت اور الحاد سے بھی نجات دلوائے گا۔

طہران ہوگر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے[۲۷۲]

اگرچہ رضا شاہ نے استحکام ملک کے لیے بہت سی کاوشیں کیں لیکن مغربی سیاست سے آزادی حاصل کر کے فرنگی تہذیب وتمدن کی کورانہ تقلید شروع کی جوان کے ہاں مغربی اقوام کے مشابہ اور مماثلت کے لیے شعوری اور غیر شعوری طور پر تمام کارناموں میں نظر آنے لگی اور اسلامی طرز زندگی

سے منہ موڑنے لگے۔ مشرق کے شعور میں ہمیشہ روحانی زندگی کو فوقیت رہی ہے جس کے لیے اقبال روح اسلامی کی بجائے ''روح شرق'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں مگر انھیں رضا شاہ اور مصطفیٰ کمال میں مغرب زدگی اور نسل پرستی نظر آئی، جس سے اقبال کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی [۲۷۳]

قرۃ العین حیدر نے رضا شاہ کبیر کے کارناموں کا جائزہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں بیان کیا ہے کہ طہران میں انھوں نے ایک کیمیکل لیبارٹری قائم کی ہے اور لڑکیوں کو انگریزی وضع کے لباس پہنائے حالانکہ اس کے دور میں فلسطین میں انگریزوں اور یہودیوں کی جنگ جاری تھی۔ رضا شاہ نے اس طرف توجہ نہیں دی البتہ مغربیت کو اپنانے کی کاوش کی اور مذہب اسلام سے بھی منہ موڑ لیا ہے۔ جس کا اظہار قرۃ العین حیدر بڑے گہرے دکھ کے ساتھ کرتی ہیں۔

فلسطین میں انگریزوں، یہودیوں اور انگریزوں کے درمیان خونریز لڑائی جاری تھی۔ طہران کے قریب شاہ کبیر نے ایک نئی کیمیکل لیبارٹری قائم کروائی...... وزارت تعلیم اسکول کی لڑکیوں کے لیے ایک نئی وضع کی مغربی ہیٹ کا اجرا کیا تھا...... یہ ایران کی اوپری طبقے کی خواتین تھیں۔ بے پردہ، تعلیم یافتہ اور مغرب کی طرف دیکھنے والی اور اتاترک کی طرح رضا شاہ کبیر نے یہ دنیا سماج پچھلے چند سال میں تخلیق کر ڈالا تھا۔ ملاؤں کے اثر اور خوف سے آزاد، لیکن نجی طور پر مذہب فراموش نہیں کیا گیا تھا۔ [۲۷۴]

جاوید نامہ میں آنسوئے افلاک پر زندہ رود نادر شاہ سے بیان کرتا ہے کہ ایران مدتوں بعد خواب گراں سے بیدار ہوا تھا مگر تہذیب مغرب کے جال میں دوبارہ پھنس گیا۔

بعد مدت چشمِ خود بر خود کشاد
لیکن اندر حلقہ دامے افتاد
کشتہ ناز بتان شوخ و شنگ
خالقِ تہذیب و تقلید فرنگ [۲۷۵]

اسی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال اظہار کرتے ہیں کہ اہلِ ایران صراط مستقیم سے بھٹک چکے ہیں اور فرنگی دین کی پیروی کر کے ملک کو تباہی و بربادی کی جانب لے گئے ہیں۔ لہٰذا اب وہ وقت دور نہیں کہ ایران میں تباہی و بربادی نہ آئے۔

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایران میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ [۲۷۶]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی اسی پیش گوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایران کے حالات واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ ایران کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک بھی اپنی عظمتِ رفتہ کا رونا روتے ہیں چنانچہ قاہرہ، بغداد اور طہران کے یورپی کلبوں میں آرکسٹرا بجتا ہے اور یورپی اقوام عالم اسلام کی موجودہ صورت حال دیکھ کر مسکراتے ہیں۔قرۃ العین حیدر دیگر مسلمانان ممالک کے ساتھ ایران کی تباہی وبربادی کا تذکرہ اقبال کے افکار کی روشنی میں کرتی ہیں۔

کرنل نیو مارچ ایڈورڈین مونچھوں کے نیچے مسکراتا ہے۔مرد بیمار پر عالم نزع طاری ہے مگر ٹیں نہیں جاتی۔بغداد کی گلیوں میں درویشوں، بھکاریوں اور فاقہ کشوں حمالوں کی ریل پیل ہے۔ کربلا میں امام حسینؑ اور جناب عباسؑ اور بغداد میں غوث الاعظمؒ کے روضوں میں ہندی اور ایرانی زائرین کا جم غفیر۔مسلمان محض دعاؤں اور عظمتِ رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے۔نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔کربلائے معلیٰ، نجفِ اشرف اور مشہد ہر جگہ بے حسب معمول گریہ وزاری کا شعور بلند ہو رہا ہے اور بغداد طہران اور قاہرہ کے یوروپین کلبوں میں آرکسٹرا بجتا ہے۔تو کہنے لگے مستقبل کے علامہ اقبال کہ:

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایران میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ[۲۷۷]

قرۃ العین حیدر شہنشاہ ایران کے متعلق بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے اسلامی کام کرنے کی بجائے آرائش وزیبائش کی طرف توجہ دی اور ملک کو خوبصورت بنانے اور فضول خرچی کرنے اور یورپی تہذیب وتمدن کو رائج کیا۔وہ رضا شاہ پہلوی کو ’’مردمسلماں‘‘ کے روپ میں دیکھنے کی متمنی ہیں۔جس کے متعلق علامہ اقبال یوں کہتے تھے:

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان[۲۷۸]

لیکن رضا شاہ پہلوی نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر شاہ قاچار کی مانند بے انتہا خرچ کیا۔جسے قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ناپسند کرتی ہیں۔

تمنا اس کی آخر جناب باری سے پوری ہوئی، بعد اس واقعہ روح افزا کے تاجدار فیروز بخت نے قصد کیا کہ جب رعایا اُوس کی خوشحال ہوجاوئے۔تب تاج شاہی زیب فرق کرئے۔القصہ مہر آباد......آراستہ مثلِ عروس نو کے تھا۔ہر چہار جانب تصاویر دودمان شاہی، قالین، ہائے نظر فریب وگلہائے صدر رنگ، زنان ایرانی مثل حوران فرنگ۔جوانانِ خوبرو مثل صاحب لوگ، باہر راستے

گل پوش، عسا کر قواعد پریڈ میں مشغول۔ وردیوں پر طلائی ڈاریوں اور تمغہ جات کی فراوانی، چوراہے کا سپاہی اچھا خاصا جرنیل معلوم ہوتا تھا۔ سڑکوں پر دورویہ صنوبر و شمشاد کی قطاریں۔ جس سے جگر لالہ میں پیدا ہو وہ ٹھنڈک۔[۲۷۹]

قرۃ العین حیدر شہنشاہ ایران کی کارکردگی سے علامہ اقبال کی مانند مایوس ہوئیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو شہنشاہ اور اولاد کو موروثی شہنشاہیت عطا کرنے کے منصوبے بنا رکھے تھے۔ لیکن رضا شاہ کی یہ بادشاہت اس کے بیٹے کو منتقل ہونے کی بجائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ جس کے متعلق اقبال پہلے ہی پیش گوئی کر چکے تھے ''اور ایران میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ'' جو ۵/جنوری ۱۹۷۹ء کے روز پوری ہوئی، جب ایران میں رضا شاہ پہلوی کا تخت طاؤس ہمیشہ کے لیے ڈانواں ڈول ہو گیا۔

اعلیٰ حضرت ولی عہد ہمایوں کی تصاویر ہر طرف جلوہ افروز تھیں اور انھوں نے تھوڑا تھوڑا پبلک لائف میں آنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ان کو تاج گزاری کے موقع پر والدین کے تخت کے پاس بیٹھے دیکھا تھا اور وہ اس کم سنی میں شاہانہ انداز اختیار کر چکے تھے۔ لیکن مرحوم شاہ فاروق کیا ۶۴ء میں پڑوڈالرز کی بات کہہ گئے تھے کہ بادشاہ صرف پانچ بچیں گے۔ تاش کے چار اور پانچویں شاہ برطانیہ۔ مجھے یاد آتا ہے۔[۲۸۰]

قرۃ العین حیدر اور ٹیپو سلطان

فتح علی خان ٹیپو سلطان والیِ میسور سلطنت خداداد نواب حیدر علی کے فرزند تھے۔ ٹیپو کا قول تھا اگر مجھے اپنے جیسا کوئی اور جری شخص مل جائے تو نصرت خداوندی سے ہفت اقلیم فتح کر کے حضرت عمر فاروقؓ کی فتوحات کا دور تازہ کر دوں۔ ٹیپو سلطان ۱۷۵۲ء میں پیدا ہوا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد ۱۷۸۲ء میں تخت نشین ہوا۔ اور ۶/مئی ۱۷۹۹ء انگریزوں سے بہادرانہ طور پر لڑتے ہوئے اور اپنوں کی غداری کے سبب جام شہادت نوش فرمایا۔ اور تاریخ شہادت ''شمشیر گم شد'' سے نکالی گئی ہے۔[۲۸۱]

علامہ اقبال ۱۱/جنوری ۱۹۲۹ء کو ٹیپو سلطان کے قلعہ سرنگا پٹم پہنچے۔ اقبال کے استقبال کے لیے گنبد سلطانی (ٹیپو کا مزار) میں شاہی محل کے عہدے دار سرکاری افسر اور عمائدین شہر موجود تھے۔ یہ گنبد سلطانی خود ٹیپو سلطان نے تعمیر کروایا تھا اور اپنے والد حیدر علی والیِ میسور اور اپنی والدہ فاطمہ کو دفن کیا تھا اور یہاں تیسری قبر ٹیپو سلطان کی گنبد سلطانی میں تھی۔

اقبال احباب سے ملاقات کے بعد روضہ سلطانی میں داخل ہوتے ہوئے قرآن مجید کی

آیت (وہ جو اللہ کے راستے میں مارے گئے، انھیں مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں مگر لوگوں کو شعور نہیں) کی تلاوت فرمائی اور فاتحہ پڑھی۔ روضہ کے اندر اقبال پر رقت طاری ہوگئی اور تمام افراد کو باہر نکال دیا۔ دو اڑھائی گھنٹے تک تنہائی میں مراقبہ کیا۔ فاتحہ اور مراقبہ کے بعد اقبال کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو کر سُوج چکی تھیں۔ میسور کے مشہور تاجر سیٹھ محمد عباس نے دریافت کیا کہ سلطان شہید نے کوئی آپ کو پیغام دیا۔ ہاں ٹیپو نے مجھے یہ پیغام دیا۔

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپر دن زندگیست[۲۸۲]

علامہ اقبال کو ٹیپو سلطان کی جرأت مندانہ زندگی بے حد پسند تھی۔ ٹیپو کو وقت شہادت سے قبل کسی مشیر نے مشورہ دیا کہ انگریزوں سے صلح کر لی جائے تو ٹیپو نے فوراً جواب دیا کہ گیڈر کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ اقبال نے سلطان ٹیپو کے آخری قول کو نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

زندگی را چیست رسم و دین وکیش؟
یک دم شیری بہ از صد سال میش[۲۸۳]

قرۃ العین حیدر نے اقبال کی طرح ٹیپو سلطان کی اسی بہادرانہ زندگی کے واقعہ کی عکاسی کرتے ہوئے انگریزوں کی زبانی بیان کیا ہے کہ انگریز نے ٹیپو سلطان کی بہادرانہ خصوصیات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ رات کو سوتے ہوئے بھی ٹیپو سے خوفزدہ تھے۔ جس طرح لوگ شیر سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ گویا ٹیپو سلطان نے اپنی بہادری کے سبب انگریزوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

میجر بیٹن نے اس کی فرانسیسی رائیٹنگ ٹیبل کی دراز توڑی۔ خواب نامہ ہاتھ لگا۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین کو بھیج دیا۔ یہ حیرت انگیز ڈائری ارسال خدمت ہے۔ ٹیپو سلطان رات کو سوتے میں بھی ہم سے لڑتا تھا۔[۲۸۴]

اسی بنا پر قرۃ العین حیدر نے مزید انگریزوں کی بزدلی اور سلطان شہید کی بہادری کو ایک اور جگہ بیان کرتے ہوئے اس کی عظمت کو سراہا ہے۔

کہتے ہیں برطانیہ صرف دو حریفوں سے لرزا۔ اس طرف پر شا یعنی جرمنی۔ ادھر حیدر علی اور ٹیپو۔ ان باپ بیٹے کے تدبر اور دلاوری سے مرعوب، معترف اور خائف، ٹیپو ان کا ''باغی'' نہیں تھا۔ بے پناہ ذہین طاقتور اور جری ہمسر دشمن تھا۔ چنانچہ ویلزلے کمسن شہزادوں کے ساتھ بڑی ہمدرانہ شفقت سے پیش آیا۔ اٹھاون برس بعد دلی اور لکھنؤ کے پشتینی، پنشن یافتہ، فرضی حکمرانوں کے لیے

ان کا رویہ بدل گیا۔مغل شہزادوں کو بغاوت کے جرم میں قتل کیا۔جو زندہ بچے انھیں ذلیل وخوار۔
نااہلوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔[۲۸۵]

علامہ اقبال سرنگا پٹم قلعہ بھی گئے جو دریائے کاویری کی دوشاخوں کے درمیان واقع ہے۔ قلعہ کے ایک حصہ میں باغ اور قلعہ ہیں اور دوسرے میں شہر آباد تھا۔اقبال نے قلعہ کی مسجد اعلیٰ کی زیارت کی جہاں ٹیپو کی شہادت ہوئی تھی اور اس مسجد کے بوڑھے امام سے بھی ملاقات ہوئی۔جن کے دادا سلطان ٹیپو کے دور میں امام مسجد اعلیٰ تھے۔امام مسجد نے اپنے والد کی روایت کے مطابق بتایا۔

سلطان ٹیپو مسجد کی عقبی دیوار کے دروازے سے مسجد میں نماز کے لیے آیا کرتے تھے۔[۲۸۶]

قرۃ العین حیدر ٹیپو سلطان کی مسجد کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ وہ مسجد آج بھی آباد ہے اور لوگ وہاں نماز ادا کرتے ہیں۔

عالیشان اور منور مسجد ٹیپو سلطان کے سامنے سے گزرتے ہوئے طاہر علی سروش فیل فروش کے ڈرائیور عبدالمجید نے کلب کے باہر کار روکی......عبدالمجید ڈرائیور بھاگتے ہوئے مسجد ٹیپو سلطان سے واپس آئے۔[۲۸۷]

اقبال ٹیپو سلطان کے کردار اور شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔جس کا ذکر خاص طور پر اپنی تصنیف جاوید نامہ میں کیا ہے۔اقبال پیر رومی کی قیادت میں فردوس بریں اور چھ افلاک پر متعدد شخصیات (مہدی سوڈانی،منصور حلاج،ابلیس،نیٹشے،سید علی ہمدانی،غنی کاشمیری،بھرتری ہری،نادر،ابدالی،فرعون،گوتم،زرتشت وغیرہ) کی روحوں سے ملاقات کرنے کے بعد آخر میں ٹیپو سلطان شہید کی روح سے ملاقات کرتے ہیں۔پیر رومی ان کا تعارف اقبال سے یوں کرواتے ہیں:

آں شہیدان محبت را امام
آبروے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاک قبرش از من و تو زندہ تر
از نگاہِ خواجہ بدر و حنینؑ
فقر و سلطاں وراثِ جذب حسینؑ
رفت سلطان زین سرائے ہفت روز
نوبت او در دکن باقی ہنوز[۲۸۸]

قرۃ العین حیدر سلطان شہید کی خصوصیات و اوصاف بیان کرتی ہیں کہ ان کے مزار کو

عقیدت و احترام کی نظر میں ہندو مسلم یکساں نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک سچا عاشق رسولؐ تھا اور حضور اکرمؐ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جنگ کے نقشے بنا کر انگریزوں کو شکست دیتا اور خواب میں حضور اکرمؐ، حضرت علیؓ اور دیگر اولیا اکرام کی زیارت کرتا تھا۔ یہی وہ تمام خصوصیات تھیں جسے پیرِ رومی نے اقبال کو بتائی تھیں۔ قرۃ العین حیدر نے ٹیپو سلطان کی کردار نگاری کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

کس حکمران کو مرنے کے بعد اتنی عقیدت اور محبت ملی ہے؟ ہزار ہا تو کرناٹکی ہندو دیہاتی روزانہ ان کے مزار پر نذریں چڑھاتا اور منتیں مانتا ہے۔ ولی تھا جو خواب دیکھتا تھا، صبح کو قلمبند کرتا تھا مع شب و تاریخ، اوپر لکھتا تھا۔ یا کریم، یا کارساز، یا حافظ۔ اس احتیاط سے لکھتا تھا خواب نامہ کوئی دیکھ نہ لے۔ مقفل رکھتا تھا اور سوتے میں بھی جنگ کے نقشے بناتا تھا اور انگریزوں کو شکست دیتا اور حضورؐ کو اکثر دیکھتا تھا اور حضرت علیؓ کو۔[۲۸۹]

علامہ اقبال کے نزدیک جری لوگ، طارق بن زیاد، ٹیپو سلطان جیسے ہیں جو خدائے باری تعالی کی رضا کے لیے حکومت کرتے ہیں اور خلافت راشدہ کا دور تازہ کرتے ہیں۔ وہ ملک فتح کرنے کی غرض سے کشور کشائی نہیں کرتے بلکہ اسلام کے فروغ اور شہادت کی طلب کی خاطر کشور کشائی کرتے ہیں۔ جس کے متعلق علامہ اقبال یوں تحریر کرتے ہیں:

یہ غازی یہ ترے پراسرار بندے
جنھیں تونے بخشا ہے ذوق خدائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی[۲۹۰]

قرۃ العین حیدر ٹیپو سلطان کی خصوصیات علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں پرکھتی ہیں کہ وہ ملک گیر جہاںباں اور سلطنتوں کو وسعت دے کر حکومت کرنے کا ذوق رکھتا تھا وہ اپنے گرے ہاونڈز کو بھی انھی ناموں سے پکارتے تھے۔ لیکن آج وہ سوائے دکھ اور پریشانی کے افکار کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔

ٹیپو سلطان بار؟ جنوں کے زمانے کی......اور ہاں وہ ملک گیر جہاںباں و کشور کشا جنھیں ذوق خدائی بخشا گیا تھا وہ اپنے گرے ہاونڈز کو بھی اکثر اسی نام سے پکارتے تھے۔ ایک اور آنسو گرا۔[۲۹۱]

علامہ اقبال ٹیپو سلطان کو ہندوستان میں اسلام کا قلعہ تصور کرتے ہیں مگر برصغیر میں ۱۷۹۹ء کو ٹیپو کی (ان کی وفات) شکست کے نتیجہ میں اسلام کے انحطاط کو عروج ملا۔ اسی وجہ اقبال اس

سال کو دنیائے اسلام کی تاریخ میں یوم سیاہ گردانتے ہیں۔

دنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء بے حد اہم ہے۔اسی سال ٹیپو کو شکست ہوئی۔اس کی شکست کے ساتھ مسلمانوں کو ہندوستان میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کی جو امید تھی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اسی سال جنگ نوانیو وقوع پذیر ہوئی جس میں ترکی کا بیڑا تباہ ہو گیا۔جو لوگ سرنگا پٹم گئے ہیں ان کو ٹیپو کے مقبرے پر یہ تاریخ وفات کندہ نظر آئی ہوگی۔''ہندوستان اور روم کی عظمت ختم ہوگی۔''[۲۹۲]

قرۃ العین حیدر بھی ٹیپو سلطان کی وفات کے سبب ہندوستان کی تاریخ کو بدترین یوم قرار دیتی ہے۔اس بدبختی کی اصل وجہ مسلمانوں کی غداری ہے۔جس کے متعلق اقبال نے میسور کے میر صادق اور بنگال کے میر جعفر کی روحوں کو فلک زحل پر عذاب میں مبتلا دکھایا تھا۔جس کی عکاسی اس سے بہتر انداز میں نہیں کی جاسکتی۔اقبال نے ان غداروں کے متعلق یوں فرمایا تھا:

جعفر از بنگال و صادق از دکن

ننگِ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن[۲۹۳]

اپنے ہی غداروں کے سبب ۶رمئی ۱۷۹۹ء کو تاریخ ہندوستان کا بدترین دن قرۃ العین حیدر بھی اقبال کی مانند گردانتے ہوئے گہرے رنج وغم کے ساتھ ذکر کرتی ہیں۔ٹیپو سلطان کی شہادت ہوئی اسی روز سے انگریز ہندوستان میں اپنا تسلط آزادانہ تصور کرنے لگے اور ہر سال فتح سرنگا پٹم کی سالگرہ منانے لگے۔حالانکہ مسلمان غداروں ہی کے سبب انگریزوں کو فتح ہوئی تھی۔

۶رفروری ۱۷۹۲ء......فتح سرنگا پٹم کی پہلی سالگرہ بڑے جشن منائے گئے۔کلکتہ تھیٹر میں، بال، ضیافت، ایسا چراغاں کہ نیٹو خلقت دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑی......ہندوستان جنت نشاں کے مسلماں حکمران ٹیپو کے خلاف انگریزوں سے مل گئے۔اس ملک کی تاریخ کا تاریک ترین دن کون سا تھا؟ ۶رمئی ۱۷۹۹ء۔[۲۹۴]

علامہ اقبال سلطان شہید پر مزید لکھنے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے تحریر نہ کر سکے۔جس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں......میں نے اس کا ایک حصہ کچھ عرصہ ہوا مرتب کیا تھا لیکن پھر ضروری مشاغل کی بنا پر اس کو نامکمل چھوڑ دیا۔[۲۹۵]

قرۃ العین حیدر سلطان ٹیپو سے اقبال کی مانند ان کی شخصیت اور بہادری سے متاثر ہوئی۔ جس کام کو اقبال کسی وجہ سے ادھورہ چھوڑ گئے ہیں اس کام کو پایہ تکمیل تک قرۃ العین حیدر نے

پہنچایا۔ وہ سلطان شہید کی بہادرانہ صفات بیان کرتے ہوئے اس کی نسل کی اعلیٰ خوبیاں بیان کرتی ہیں کہ شیر کی نسل ہی شیر کہلاتی ہے۔ وہ گیدڑ نہیں کہلاتی۔ سلطان ٹیپو کا بیٹا غلام محمد اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی ذہانت کے بل بوتے اور خداداد صلاحیت کے سبب اس ہندوستان میں شان شوکت کی زندگی بسر کرتا رہا جبکہ میر جعفر، میر قاسم اور میر صادق کی نسل ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ قرۃ العین حیدر ٹیپو سلطان اور اس کی اولاد کی صفات ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

ٹیپو اور غلام محمد دو علامتیں ہیں...... ہندوستان کی ملٹری سوسائٹی کی شکست اور برٹش کمرشل ازم کی جیت...... غلام محمد روح عصر کو پہچان گیا اور فاتحین کی تجارتی ایمپائر میں شامل ہوا۔ وہ ہندوستان کے اولین YUPPIES میں سے تھا۔ گویا آج کا ارب پتی...... ایک فرنگی پلانٹر سے آل ٹیپو نے یہ کوٹھی خریدی...... محض ہمت خداداد جس کی بدولت شہزادہ غلام محمد ابن ٹیپو سلطان نے بیوپار میں ہن برسایا...... دیکھو کہ بنگال کی لال سرکار بھی لال پوتھی ان سے چھین نہ سکی۔ پرنس غلام محمد ٹرسٹ کی ملکیت۔[۲۹۶]

قرۃ العین حیدر کا طنز و مزاح

اردو ادب میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے سلسلہ میں اودھ پنچ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اودھ پنچ سے ہی اردو کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری اور نثر کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے مگر اس سے قبل ادبا اور شعرا اپنی طبیعت کی شوخی کبھی ہزل اور ہجو کی صورت میں اظہار کرتے تھے۔

شعرا میں جعفر زٹلی اردو کا پہلا ظریف شاعر ہے جن کے ہاں زیادہ تر لفظی مزاح ملتا ہے۔ ان کے بعد مرزا محمد رفیع سودا طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں پیش پیش تھے۔ جن کی ہجو اس سلسلہ میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ سودا کے ساتھ ساتھ میر تقی میر نے بھی ہجو تحریر کی مگر ان کے کلام میں طنز و ظرافت کی چاشنی موجود ہے۔ مصحفی اور انشا نے بھی اپنی معاصرانہ چشمک کے طفیل مزاح نگاری کو فروغ دیا۔ نظیر اکبر آبادی کی منظوم بھی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں اولین اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کا بہترین نمونہ ''آدمی نامہ''، ''مفلسی'' وغیرہ پیش کرتی ہیں۔ مرزا غالب کی اردو کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں اعلیٰ نمونے خطوط غالب میں پائے جاتے ہیں۔ غالب اردو نثر میں پہلے معیاری مزاح نگار ہیں اور انھوں نے نثر میں معیاری ظرافت کی داغ بیل ڈالی۔ غالب کی فطرت میں شوخی و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر حالی انھیں ''حیوان ناطق'' کے نام سے پکارتے تھے۔[۲۹۷]

۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ اخبار لکھنؤ سے نکالا۔ مولوی سجاد حسین کو جلد ہی ان کی ذاتی کاوش، وسیع الاخلاقی طبیعت داری کے سبب ہم مشرب اور ہم مذاق احباب مل گئے۔ جن کے متعلق ڈاکٹر شاذب رودولوی ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

جن میں اکبر الہ آبادی، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوق قدوائی، تربھون ناتھ ہجر، سید محمد آزاد، منشی احمد علی، جوالا پرشاد برق اور نہ جانے کتنے وہ لوگ جو فرضی ناموں سے لکھتے رہے ہیں۔ جن کی اصلیت سے آج تک کوئی واقف نہیں ہے۔ ان لکھنے والوں میں ہر شخص اپنے خاص رنگ اور طرز کا مالک تھا۔[۲۹۸]

مندرجہ بالا اقتباس میں جیسا کہ بعض مصنفین کے نام درج کیے گئے ہیں کہ اس اخبار میں نجانے کون کون سے لوگ لکھتے تھے۔ قرۃ العین حیدر نے بھی اس سلسلہ میں انکشاف کیا ہے کہ ان کے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم کے دوست اور احباب بھی حصہ لیتے تھے۔ جن میں ایک سبحان اللہ رئیس گورکھپور اور احمق پھپھوندوی بھی تھے۔ جس کے متعلق یلدرم کا ملازم بشیر خان گھر میں تذکرہ کرتا رہتا تھا۔ بشیر خان بھی بے حد ظریف تھا۔ جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں تذکرہ کرتی ہیں:

سبحان اللہ رئیس گورکھپور دروازے میں کھڑے بشیر خان نے داد دی۔ سبحان اللہ گورکھپور جن کا ذکر اودھ پنچ میں آتا تھا۔ اکثر غازی پور میں ہمارے ہاں تشریف لاتے تھے۔ اٹاوے والے احمق پھپھوندوی کی طرح ان کے نام بشیر خان کو ہمیشہ بہت محظوظ کیا۔[۲۹۹]

اودھ پنچ کے مصنفین میں اکبر الہ آبادی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جنھوں نے سرسید کی تحریک علی گڑھ کی تعلیمی پالیسی، تعلیم نسواں اور پردہ ترک کرنے کے خلاف ظریفانہ انداز میں سخت مذمت کی۔ اس سلسلہ میں سرسید کے سب سے زیادہ مخالفین میں سے سید اکبر حسین اکبر یعنی اکبر الہ آبادی ہی تھے۔ جن کی شاعری مغربی تہذیب کے خلاف بھرپور احتجاج ہے اور وہ مشرقی اقدار اور روایات کے پروردہ تھے، باالفاظ دیگر وہ مغربی تہذیب کو مشرقی اقدار کی موت گردانتے ہوئے انگریزی ذہنیت کی مخالفت کرتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کی اس مغربی تہذیب کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام ان الفاظ کے ساتھ رقم طراز ہیں:

نئی نسل کی تمام خامیاں تو انہیں پوری طرح نظر آجاتی تھیں لیکن پرانی نسل کے نقائص پر ان کی توجہ نہ تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ قومی تمدن کے جس دور نے واجد علی شاہ، جان صاحب، میر جعفر اور غلام قادر روہیلہ پیدا کیے ہیں۔ اس کے نظام اخلاق میں اصلاح کی ضرور گنجائش ہے۔[۳۰۰]

اکبر الہ آبادی وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے مغرب اور مغربیت کی سب سے زیادہ مخالفت کی اور اودھ پنچ میں عامیانہ ظرافت اور پھکڑ پن کی بجائے لطیف طنز و مزاح کی بہترین مثال قائم کی۔ خواتین کی بے پردگی اور تعلیم نسواں کی مخالفت اچھوتے انداز میں پیش کر کے بذلہ سنجی اور لفظی مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کیا ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمین میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا[۳۰۱]

قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم تعلیم نسواں کے حق میں تھے اور بالخصوص ان کی والدہ نذر الزہرہ جنھوں نے چند خواتین کے ساتھ مل کر زنانہ کانفرنس حقوق نسواں کے لیے قائم کی تھی اور اس کے والدین نے تحریک تعلیم نسواں کے لیے ایک رسالہ خاتون کے پہلے شمارہ جولائی ۱۹۰۴ء میں مضامین تحریر کیے مگر قرۃ العین حیدر بھی اپنے والدین کی مانند جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ حقوقِ نسواں کی حامی ہیں اور اکبر الہ آبادی کی اس سوچ پر طنز کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ جس میں وہ عورتوں کے پردہ کے قائل ہیں مگر مغربی اثرات کے زیر اثر خواتین پردہ ترک کر چکی ہیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر اکبر الہ آبادی کی کسمپرسی کی کیفیت یوں بیان کی ہے۔

اکبر غریب ۱۹۲۱ء میں غیرت قومی سے زمین میں ہمیشہ کے لیے گڑ چکے تھے۔[۳۰۲]

قرۃ العین حیدر اکبر الہ آبادی جیسے ظریف اور نکتہ رس شاعر، سلجھے ہوئے اور پختہ کار انسان کو بھی ہدف طنز بنانے میں گریز نہیں کرتی۔ وہ اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ اکبر جیسے ظریف شاعر سر سید جیسے عظیم انسان کا جہاں مذاق اڑاتے تھے۔ مکافات عمل کی رو سے اس کی نسل خود تضحیک کا نشانہ بنی اور لوگ اس کی پوتی پر بھی طنز و مزاح کی یلغار کرتے ہیں۔ جس کا انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اکبر الہ آبادی کی پوتی مصحفی خالہ امپیریل فارسٹ کالج کے علاقہ میں فروکش تھیں۔ ان کے شوہر کا قاعدہ تھا کہ کسی کے گھر پہلی بار جاتے تھے تو اندر اپنی بیگم صاحبہ کا تفصیلی تعارف کہلوا بھیجتے تھے۔ جب آشیانہ ''کال'' کرنے آئے فقیرا برساتی میں کھڑا کان کھجا رہا تھا۔ فرمایا جا کر بیگم صاحبہ سے عرض کرو۔ اکبر الہ آبادی کی پوتی عشرت حسین کی بیٹی، نواب صاحب پریاواں کی نواسی تشریف لائی ہیں۔'' فقیرا نے اندر آ کر اماں سے مختصراً کہا ''نواب صاحب کی پریاں آئی ہیں۔[۳۰۳]

قرۃ العین حیدر نہ صرف طنز و مزاح کی حد تک اکبرالہ آبادی کے کلام کی دلدادہ تھیں بلکہ وہ اکبر کی بحیثیت شاعر بھی معتقد تھیں۔ وہ اکبر کے مزاحیہ کلام کو پڑھنے اور سننے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اعتراف کرتی ہیں:

اکبر لسان العصر نہیں لسان الغیب تھے...... کراچی واپس آکر میں سلہٹ کے پس منظر کے ساتھ ''چائے کے باغ'' لکھنا شروع کیا۔ پھر اسے ادھورا چھوڑ کر لنکا کی سیٹنگ میں ''سیتا ہرن'' شروع کیا۔ ایک روز دفتر میں اس کا ایک باب لکھتے لکھتے اکبر کے چند اشعار کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ابن انشا کو فون کیا۔ ''وہ کیا ہے'' میں نے دریافت کیا۔ ''کہ بیٹا کر لے گرتو بی۔ اے پاس۔؟'' انشا نے فوراً پوری نظم فر فر سنا دی۔ اسے قلم بند کر کے فون بند کیا۔[۳۰۴]

اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں علامہ اقبال کی شاعری خاص اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے تہذیب و تمدن پر گہری طنز کے ساتھ واعظ اور ملا کے بے عمل اور ریا کارانہ کردار پر بڑی تند و تیز تنقید کی ہے۔ وہ تہذیب مغرب کے کھوکھلے پن کو نمایاں انداز میں عریاں کرتے ہیں۔ ان کی طنزیہ شاعری ظرافت و سنجیدگی کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے اکبرالہ آبادی کی تقلید کی اور ہنگامی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے ظریفانہ اشعار کہے۔ اقبال اکبرالہ آبادی کے مغربی تہذیب کی مخالفت کی بنا پر بے حد مداح بھی تھے۔ بانگ درا میں ''ظریفانہ کلام'' اکبر کے تتبع ہیں۔ علاوہ ازیں اقبال کے خطوط بنام اکبرالہ آبادی علمی و ادبی ملاقاتوں کا واضح ثبوت ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں ظریفانہ پن اردو ادب کے ان مایہ ناز شعرا کے وسیلے سے نمایاں نظر آتا ہے مگر وہ اس سلسلہ میں علامہ اقبال سے زیادہ متاثر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں ظریفانہ جملے اور اشعار میں علامہ اقبال کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر طبعاً بڑی ظریف ہیں اور معمولی معمولی واقعات سے مزاح پیدا کرنے کی جستجو میں رہتی ہیں جو اُن کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ اپنے بچپن کی شرارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنسی مزاح سے لطف اٹھانا خوب جانتی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے بچپن کا ایک واقعہ ان الفاظ کے ساتھ رقم کرتی ہیں:

ایک روز اماں اور چچی جان دن بھر کے لیے کانپور گئیں۔ اچھو کہ میری دوست فلسفی اور رہبر تھیں۔ جاپانی تصویریں پانی میں بھگو کر دوسرے کاغذ پر اتارنے میں مصروف تھیں۔ چپکے سے بولیں ''آج بڑے ابا کچہری جائیں ہم لوگ چپکے سے پیچھے لگیج کیرئیر پر بیٹھ جائیں گے۔ بڑا مزہ آئے گا''۔ ''بہت اچھا آپا اچھو''۔ میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ جب ابا جان موٹر میں سوار ہوئے، ہم دونوں اچک کر لگیج کیرئیر پر بیٹھ گئے۔ اس کی سلاخیں تھام لیں۔ موٹر پھاٹک

سے نکلی سڑک پر پہنچ کر اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ہم دونوں نے مزید مضبوطی سے سلاخیں پکڑ لیں۔ ایک راہ گیر نے گھبرا کر بشیر خاں کو روکنے کا اشارہ کیا۔بشیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔موٹر روکی۔ہم لوگوں کو اتار کر ابا جان کے سامنے پیش کیا۔''گجب ہوتا گر جاتیں، سر پھوٹ جاتے مر جاتیں۔بشیر دہشت زدہ اور ابا جان بے حد متفکر نظر آئے۔ملائمت سے کہا۔''آپ لوگوں کو اس قسم کی خطرناک شرارتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''[۳۰۵]

قرۃ العین حیدر کے ہاں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آتی ہے۔وہ معمولی معمولی واقعات کو ایک مزاح نگار کی نظر سے دیکھ کر مزاح پیدا کرنے کا فن رکھتی ہیں۔ایک دفعہ علامہ اقبال لکھنؤ میں سجاد حیدر یلدرم سے ملنے آئے۔قرۃ العین حیدر اس سلسلہ میں علامہ اقبال اور سجاد حیدر یلدرم کی ملاقات کا ایک واقعہ ''حکیم الامت اور جھوائی ٹولے کا نسخہ'' کے عنوان سے کارِ جہاں دراز ہے (جلد اوّل) میں اس انداز میں پیش کرتی ہیں کہ آدمی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا اور ان کے ہر جملہ سے ہنسی پھوٹ پھوٹ کر نمایاں ہوتی ہے جو ان کی ظرافت نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ ظاہر کرتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کو لکھنؤ آئے دو تین روز ہوئے تھے کہ علی محمد خاں راجہ محمود آباد نے ان کی زبردست دعوت کی۔وہاں خوب ڈٹ کر شاعرِ مشرق نے لکھنؤ کا مرغن نوابی ماحضر تناول فرمایا۔رات کے گیارہ بجے ہلٹن لین واپس آئے۔کپڑے تبدیل کیے۔برآمدے میں جا کر اپنے پلنگ پر سو رہے۔رات کے ڈھائی بجے جو اُن کے نالہ ہائے نیم شبی کا وقت تھا، افلاک سے جواب آنے کی بجائے پیٹ میں اُٹھا زور کا درد، شدت کی مروڑ، سوئیٹ نے گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔سارا گھر سو رہا تھا۔میز بانوں کو زحمت نہ دینے کے خیال سے چپکے لیٹے رہے۔نزدیک کے پلنگ پر نوجوان عثمان حیدر بے خبر سو رہے تھے۔اقبال نے آہستہ سے اٹھ کر غسل خانے کا رخ کیا۔وہاں سے تیسری بار لوٹ کر برآمدے کی لائٹ جلائی۔عثمان حیدر کے سرہانے میز پر حکیم عبدالوالی کی دوا کا قدح رکھا تھا۔آپ اس کی چوگنی خوراک پی گئے۔پھر لیٹ گئے۔پھر غسل خانے گئے، واپس آکر مزید دو خوراکیں نوش جان کیں۔کھڑ بڑ سے عثمان کی آنکھ کھل گئی دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے بستر کے کنارے بیٹھے ہیں۔آنکھوں میں آنسو جاری اور اپنے ناخنوں کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔مصطفیٰ باقر مرحوم کے ناخن نیلے پڑنے کا قصہ انھیں بتایا جا چکا تھا۔

عثمان حیدر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ادب سے دریافت کیا۔''ڈاکٹر صاحب خیریت'' بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا''مجھے بھی کالرا ہوگیا۔جا کر سجاد کو جگا دو''۔

......عثمان حیدر نے تیر کی طرح جا کر دوسرے برآمدے میں ماموں جان کو جگایا۔اس وقت ڈاکٹر

اقبال نیم جان سے اپنے پلنگ پر لیٹ چکے تھے۔ ماموں نے فوراً آکر منفرد روز گار کی یہ حالت دیکھی۔ حواس باختہ سرپٹ پیدل پھاٹک کی طرف بھاگے۔ لکھنؤ کا انگریز سول سرجن کرنل برڈ ووڈ نزدیک ہی ایبٹ روڈ پر رہتا تھا۔ اس کو جا کر جگایا۔ کرنل بھاگم بھاگ ہلٹن لین پہنچا۔ انجکشن لگایا۔ مریض کی تسلی تشفی کی۔

آدھ گھنٹے بعد علامہ پر غنودگی ہوئی۔ کرنل برڈ ووڈ نے نسخہ لکھا۔ مشتاق بیرہ حضرت گنج سے دوا بنوا کر لایا۔ دو گھنٹے بعد علامہ کو پھر اسہال شروع ہو گیا۔ اس وقت تک ڈرائیور آچکا تھا۔ وہ حکیم عبدالوالی کو لینے جھوائی ٹولہ گیا۔

حکیم صاحب بوکھلائے ہوئے ہلٹن لین پہنچے۔ کرنل برڈ ووڈ کی شیشی دیکھی۔ پھر نسخہ لکھنے بیٹھے۔ علامہ نے تکیہ سے سر اٹھا کر نسخہ ملاحظہ فرمایا۔ بولے۔ ''حکیم صاحب یہ دوائی تو میں پہلے ہی آدھی بوتل پی چکا ہوں۔'' حکیم صاحب ہکا بکا اقبال کو دیکھنے لگے۔ عثمان حیدر والی بوتل اٹھائی۔ اس میں پوری چھ خوراکیں کم تھیں۔ شاعر مشرقؒ نے بھولپن سے فرمایا۔ ''حکیم صاحب بات یہ ہوئی کہ میں نے سوچا یہ لڑکا کم عمر ہے۔ اس کی خوراک سے چار گنا زیادہ مجھے کھانی چاہیے جبھی فائدہ ہوگا۔'' حکیم عبدالوالی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ واقعی فلسفی ہیں۔ خدا نے بڑی خیریت کی۔ اگر دو ایک خوراکیں اور پی ہوتیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔'' شام تک علامہ کی حالت سنبھل گئی۔ لیکن ان کی علالت کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہلٹن لین میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔[۳۰۶]

مغربی تہذیب و تمدن جو گزشتہ چار سو سال کے دوران یورپ میں ابھری۔ اس کا آغاز سولہویں صدی کے اس دور سے شروع ہوتا ہے۔ جب مشرقی یورپ پر ترک قابض ہوئے۔ لاطینی اور یونانی علوم کے ماہرین کو وہاں سے نکلنا پڑا اور وہ مغربی یورپ میں پھیل گئے۔ اس سے قبل یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان علما کے اثر سے اور ہسپانیہ پر عباسیوں کے قبضہ کے بعد ایک نئی قوت سے بیداری پیدا ہوئی۔ یہ وہی دور تھا جب یورپ میں سائنسی ترقی کی ابتدا ہوئی اور نئی نئی ایجادات رونما ہوئیں۔ جس کے باعث یورپ کی پسماندگی اور جہالت کے بادل منتشر ہو گئے اور نئی منڈیاں تلاش کرنے کی غرض سے یہی بادل حریصانہ نظریں لیے ایشیا اور افریقہ کے زرخیز علاقوں کا رخ کیا اور ان پر برس پڑے۔

یورپی ممالک میں انگلستان، پرتگال، فرانس اور ہالینڈ نے پیش قدمی کے نئے نئے ممالک میں پہلے معاشی اور پھر سیاسی معاملات میں دخل اندازی شروع کی۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصے

میں ان اقوام نے ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر وہاں اپنی تہذیب کو جنم دیا۔ یورپی تہذیب نے یونانی علوم کی آزاد خیالی اور عقلی تفکر سے سائنسی ایجادات کو فروغ دیا۔ انھی سائنسی ایجادات اور مشینی ترقی نے اس تہذیب کو اس قدر قوت بخشی کہ محکوم ممالک کا اس نے حتی المقدور گلا گھونٹنے کی کاوش کی اور وہاں کی سادہ لوح عوام کی نظروں کو اپنی چکا چوند ترقی سے خیرہ کر دیا اور وہ صدیوں تک اس کے حلقہ اثر سے چھٹکارہ حاصل نہ کر سکے۔ بالخصوص مسلم ممالک ان کا ہدف بنے۔ یورپ نے ترکی، ایران، حجاز، فلسطین، مصر، مراکش، تیونس، سوڈان، لیبیا، شام اور عراق کو اپنا غلام بنا لیا اور ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد یہاں کے مسلمانوں کو ان کی شاندار تہذیب سے بدظن کرنے کی حتمی کاوش کی گئی۔

اسلامی ممالک کی یورپ کے ہاتھوں تذلیل، غارت گری اور اسلامی تہذیب کی تباہی و بربادی سے علامہ اقبال کو گہرا دکھ ہوا۔ انھیں سب سے زیادہ الم یہ تھا کہ سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دل و دماغ یورپی تہذیب کے گرویدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اس تہذیب کی خامیوں کو آشکار کرنے کی حتمی کاوش کی اور انگریزوں کے ناپاک عزائم پر طنز ان اشعار میں کیا:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
میاں نجّار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے[۳۰۷]

قرۃ العین حیدر کے ہاں بھی اسلامی تہذیب کے نیست و نابود کرنے کا اصل محرک انگریز ہی ہے۔ وہ بھی انگریزوں سے اس بنا پر نفرت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جس بنا پر مغربی تہذیب اپنانے والے مشرقی افراد پر اقبال کی طرح طنز کرتی ہیں۔

وہ سکندر باغ کی سڑک پر آ گئے۔ ایک مغرق ہاتھی جھومتا ہوا گزرا۔ اس پر شاہ زمن غازی الدین حیدر سوار تھے۔ چمپا نے ان کی شکل کو غور سے دیکھا اور وہ بڑے مسخرے نظر آئے۔ ''ان سے ہاؤ ڈو یوڈو ہی کر لو کم از کم''۔ یہ تو بڑے انگریز مشہور ہیں۔ دیکھو کیا ولائتی بادشاہوں والا جوڑا پہن رکھا ہے۔'' کمال نے کہا۔[۳۰۸]

قرۃ العین حیدر انگریزوں کا طنزاً مذاق بھی اڑاتی ہیں۔ یہ طنز و مزاح ان کے ہاں تاریخی علوم کی بنا پر ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں کس انداز میں وارد ہوئے۔ اور انھوں نے مشرقی روایات کے خلاف مغربی روایات کو جنم دیا اور تعلیمی لحاظ سے برصغیر کے افراد کو ذہنی سطح پر مفلوج

کر دیا۔ جس بنا پر وہ انگریزوں کا تمسخر اڑاتی ہیں۔

یہاں سے ہمارا ایک انگریز پروفیسر کتابیں چھوڑ کر ہمالیہ نکل بھاگا تھا، وہ اب بھی وہیں زندہ ہے یا اسے کسی شیر نے کھالیا یا چڑیوں نے اس کی داڑھی میں گھونسلے بنا لیے ہوں اور وہ کسی کھوہ میں بیٹھا نارومنی کی موسیقی سنتا ہوگا۔[۳۰۹]

علامہ اقبال کے نزدیک اہل کلیسا نے ہمیں جو نظام تعلیم دیا ہے۔ وہ دین کے خلاف ایک گہری سازش ہے جو دین اسلام کے پیروکار اسے اپنانے پر رضا مند نظر آتے ہیں۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو نہ کر سکی اپنی خودی سے انصاف[۳۱۰]

اقبال ایسے نظام تعلیم سے متفکر ہیں جو عقل پرستی، تن آسانی اور تعیش و آرام کا درس دیتی ہے۔ اس سے مسلمان نوجوانوں کے مذہبی عقائد متزلزل ہو جائیں گے۔ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید ان سے ان کا نصب العین چھین لے گی۔ جس بنا پر اقبال بے حد متفکر نظر آتے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر
وضع مشرق جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ[۳۱۱]

اقبال کے نزدیک یہ بے راہروی اور بے دینی و الحاد کی تعلیمات انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے اور ان شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دے کر انھیں توحید کے نظریہ سے بھٹکایا جا رہا ہے۔ جس کا اظہارِ افسوس اقبال نے ان اشعار میں کیا:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ
شکایت ہے مجھے یا رب خداوند ان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا[۳۱۲]

علامہ اقبال ایک ایسے نظام تعلیم کے متمنی تھے جس سے بچے کی فطری صلاحیتوں کی نشو ونما ہو اور وہ اپنے اندر خود شناسی کا جوہر پیدا کرے۔ وہ ایسے نظام تعلیم کے ہرگز خواہاں نہیں جس پر رٹنے رٹانے پر زور دیا جاتا ہو بلکہ وہ طالب علم کو صاحبِ کتاب کی صورت میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں[۳۱۳]

قرۃ العین حیدر بھی آج کے دور کے نظام تعلیم سے بے حد مایوس دکھائی دیتی ہیں اور اس کی افادیت اس کے نزدیک قطعاً کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس بے معنی نظام تعلیم کا موردالزام ماہرین تعلیم کو ٹھہراتی ہے جو حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ماہرین تعلیم کی پالیسیوں کو طنز و مزاح کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

تم نے جو کچھ پڑھا ہے، بھول جاؤ، ہمارے ماہرین تعلیم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تعلیم بیکار ہے۔[۳۱۴]

قرۃ العین حیدر بھی نظام کلیسا کے تحت نظام تعلیم کے نقائص بیان کرتے ہوئے روشنی ڈالتی ہے کہ یہ نظام تعلیم دین و مذہب سے دور لے جاتا ہے۔ جس سے انھیں اخلاقی درس ملنے کی بجائے معاشرتی برائیاں پھیلانے میں تربیت ملتی ہے۔ وہ حصول تعلیم کے سلسلہ میں غربا کے حقوق کے لیے جدید ماہرین تعلیم کے افکار و نظریات اور سوچ پر طنز کرتی ہے۔

تعلیم...... یہ سب غریبوں کی افیم ہے۔ غریبوں کو افیم مت دو، اسے کھا کر ان کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ ان کی عقل چرخ ہو جاتی ہے۔[۳۱۵]

قرۃ العین حیدر ماہرین تعلیم جو انگریزوں کے پروردہ ہیں اور ان کے مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے افکار و نظریات کو علامہ اقبال کی مانند بے نقاب کرتی ہیں کہ وہ شاہین بچوں کو کتب دینے کی بجائے ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھمانا چاہتے ہیں۔ جن شاہین بچوں کے متعلق علامہ اقبال نے ''کتابِ خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں'' کہا تھا۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے انھی نظریات کے پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے پر بڑے گہرے دکھ اور الم کا اظہار کرتے ہوئے ماہرین تعلیم پر طنز کرتی ہیں۔

وہ ٹھیک کہتے ہیں، ہمیں کتابوں کے بجائے بندوقوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ قوم کے نونہالوں کو کتابوں کی جگہ بندوقیں دو۔ تا کہ وہ مجاہد بنیں...... مرد مومن، شاہین۔[۳۱۶]

اقبال ایک ایسا نظام تعلیم چاہتے ہیں جس کے سبب مسلم قوم میں ایک مردِ مومن اور درویش کی تمام صفات پیدا ہوں۔اسی وجہ سے وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو شاہین بچے کہہ کر پکارتے رہتے ہیں۔اقبال شاہین کی صفات مسلم نوجوانوں میں دیکھنے کے اس قدر متمنی ہیں کہ وہ انھیں کبوتر جیسے نرم و نازک پرندے میں بھی شاہین کا جگر دیکھنے کے لیے حوصلہ افزائی کے نصب العین کے حصول کے لیے ابھارتے ہیں۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا[۳۱۷]

قرۃ العین حیدر بھی اقبال کے انھی نظریات کو فروغ دیتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر دورِ جدید کے طلبہ شاہین کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔قرۃ العین حیدر کو بڑا تعجب ہوتا ہے کہ نئی نسل اقبال کے شاہین پر غور و خوض کرنے کی بجائے چوہے پر ریسرچ کر رہی ہے۔جسے جان کر قرۃ العین حیدر بڑے رنج و الم کا سامنے کرتے ہوئے طنز و مزاح کا سماں پیدا کرتی ہے۔

اینٹی بایوٹکس کے لفظ پر بایو کیمسٹری میرے ذہن میں آئی۔جس کا نام میرے لیے نا قابل فہم ہے۔شوبھا کی بہن نلنی بایو کیمسٹری میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہی تھی۔''تم کس مضمون پر ریسرچ کر رہی ہو۔''میں نے جمائی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔
''چوہے کے جگر پر''۔
''غضب خدا کا۔''

''نوا پیرا اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں چوہے کا جگر پیدا''[۳۱۸]

قرۃ العین حیدر دنیائے اسلام کو خود ہی اپنے خنجر سے خودکشی کرتے ہوئے دکھاتی ہے جو ہر چند یورپ کی استعماری قوتوں کے پنجۂ استبداد میں تڑپ رہی ہے جسے علامہ اقبال اپنے گرد و پیش دنیا میں ''طلوع اسلام''میں ٹھوس اور واضح بنیادوں پر دیکھا تھا اور حریت کے خواب دیکھے تھے اور وہ اسلامی دنیا کو آزاد ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں[۳۱۹]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں دنیائے اسلام کی تباہی کے ملبے پر بیٹھی گریہ زاری کرتے ہوئے دہشت گردی کا تذکرہ کرتی ہے کہ یہ وہی قوم ہے جس کے لیے اقبال عمل پیہم اور یقین محکم کے ساتھ تقدیریں بدلنے کے خواب دیکھتے تھے مگر آج کی مسلم قوم بے حس ہو چکی ہے۔

قطار اندر قطار پھول ہیں صحرا میں یا پریاں سوری یا مردے قطار اندر قطار۔[۳۲۰]

مزید قرۃ العین حیدر مسلم قوم کی بے حسی کا رونا روتے ہوئے طنز و مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو اپنی ہی قوم کو قتل و غارت کا نشانہ بناتے ہیں۔

تخت سے تختہ۔ نگاہ مرد مومن...... بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ چار دن سے شیو نہیں کیا۔[۳۲۱]

علامہ اقبال نے مسلم قوم میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے خواب دیکھے تھے اور وہ مسلم قوم میں اتحاد و یگانگت کی مثال قائم کرتے ہوئے محمود و ایاز کو بطور نمونے پیش کرتے تھے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز[۳۲۲]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے انھی افکار کی روشنی میں مسلم قوم کی دہشت گردی اور قتل و غارت کے فعل کو طنزاً بیان کرتی ہیں کہ مسلم قوم آپس میں اتحاد پیدا کرنے کی بجائے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں بلکہ وہ ایک ہی صف میں کھڑے کر کے آنکھوں پہ سیاہ پٹی باندھ کر ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں۔ اسی طرح مساجد میں بھی ایک ہی صف میں کھڑے نمازیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اکثر اس طرح کے کئی واقعات دکھائی دیتے ہیں۔ جس بنا پر وہ طنزاً یوں کہتی ہیں۔

سرد پھاوڑے اپنی قبریں کھودتے مرد و زن، خندہ زن، آہ کرنے کا سبب پوچھا تو نشانہ باندھے بندوقچی السلام علیکم یا اہل قبور۔ کھود لیں؟ تو آیئے قطار میں لگ جایئے۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ لائن سے۔ لائن سے۔ یہاں اس میز سے ایک ایک سیاہ پٹی لیتے جایئے اور اپنی آنکھوں پر باندھتے جایئے۔ ''زمین پر فساد پھیلانے والے'' اور ''منافقین'' اور ''مرتد'' اور ''زندیق'' سب ایک طرف۔ عورتیں اور لڑکیاں دوسری طرف۔ ایک باریش ہندی نوجوان پوسٹر پر نظر ڈالتا ہے نماز کے لیے مسجد کے اندر چلا جاتا ہے ایک ہوں مسلم حرم کی۔ واجب القتل ہیں۔[۳۲۳]

علامہ اقبال ملت اسلامیہ کو متحد دیکھنے کے خواہاں تھے اور پین اسلام ازم کے حامی تھے۔ وہ پوری دنیا کے مسلم کو ایک ہی تسبیح میں پروئے جانے کے خواہاں تھے تاکہ مسلم قوم عزت سے زندگی گزار سکیں۔ جس کا اظہار وہ اس شعر میں یوں کرتے ہیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر[۳۲۴]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے انھیں افکار کی روشنی میں مسلم قوم کی سوچ وفکر پر طنز کرتی ہیں کہ مسلم قوم آپس میں ہی جھگڑا وفساد برپا کرتی ہے۔جس کی واضح مثال میدان کربلا ہے بلکہ مسلم قوم اتفاق ومحبت اور اتحاد پیدا کرنے کی بجائے قتل وغارت اور قبرستان میں قبریں متحد ہوکر بھرتے ہیں۔اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں عمل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

محاذ جنگ سے لائے ہوئے فوجیوں کے تابوتوں کا جلوس روضۂ حسینؑ میں طویل ہوتا جارہا ہے۔ قومی پرچموں میں ملفوف ان جنازوں کا مزار امامؑ کے گرد طواف کرایا جاتا ہے۔قبرستان قبروں سے بھر گئے۔ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی۔ننھے بچے اسکول کے کمسن لڑکے بندوقیں دے کر محاذ پر بھیجے جارہے ہیں۔دونوں طرف سے واجب القتل ہیں۔[۳۲۵]

علامہ اقبال نے اپنی نظم ''طلوع اسلام'' میں مسلمانوں کو آنے والے وقت کی خوشخبری دی تھی کہ مسلمانوں کا مستقبل روشن ہے اور وہ دن دور نہیں جب ان کے لیے ہر لمحہ خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔جس کی پیش گوئی اقبال نے ان الفاظ میں کی تھی۔

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد

بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد، قرار آمد[۳۲۶]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی اسی پیش گوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے شیعہ سنی فسادات کا تذکرہ کرتی ہیں کہ شیعہ حضرات کو بے گناہ قتل وغارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان کے قتل وغارت پر حکومت ماسوائے اظہار افسوس اور مفت کفن تقسیم کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتی۔یہ حکومت اس ملک کی ہے جس کے متعلق علامہ اقبال بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد کہتے تھے۔قرۃ العین حیدر شیعہ سنی فسادات کی صورت حال پر طنزاًروشنی ڈالتی ہیں۔

تازیانوں کے نشان سب اس قطار میں آجائیں جلدی جلدی۔افراتفری نہیں۔سستی۔ڈسپلن۔ سبب پوچھا تو تازیانوں کے نشاں پشت پہ دکھلانے لگے۔بولی وہ کون سے عصیاں پہ ملی یہ تعزیر۔رو کے فرمایا گناہ کچھ بھی نہیں۔بے تقصیر سلیقے سے۔پھاڑوے قرینے سے رکھ دیجیے۔دوسرے آرہے ہیں۔کچھ کفن کے لیے ہمراہ نہیں لایا ہوں۔باپ کو چھوڑ کر بے گور وکفن آیا ہوں۔فکر مت۔کفن سرکاری ملتے ہیں۔تشریف لائیے یہ بوترابیوں کی خاک ہے۔اس میں آپ کی کھودی ہوئی قبریں منتظر ہیں منہ پھاڑے۔گولیوں کی باڑھ،گرم خاک،سرخ خاک،سرد خاک، برف پوش گورستان۔ان تودہ ہائے خاک کے گرد لالہ کے پھول کھلیں گے۔ جناب تو وہ کیا ذکر کیا تھا۔

''بہار آمد، نگار آمد، نگار آمد'' ۔[۳۲۷]

عطیہ فیضی جن کی علامہ اقبال کے ساتھ دوستانہ خط و کتابت اور ملاقاتیں رہی، شبلی نعمانی اور سجاد حیدر یلدرم بھی ان کے مداحوں میں سے تھے۔ قرۃ العین حیدر عطیہ فیضی کی شخصیت کو ''باغی سپاہی'' کی مانند مسخرہ پن قرار دیتے ہوئے طنز و مزاح پیدا کرتی ہیں کہ وہ بوڑھی خبطی خواتین کی مانند لباس پہنے علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتی پھرتی ہے مگر لوگوں کو قطعاً اس کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ قرۃ العین حیدر عطیہ فیضی کے حسن و رعنائی اور قابلیت کو طنز و مزاح کے ساتھ بیان کرتی ہیں:

''باغی سپاہی''، فلم ہمیں مسخرہ پن معلوم ہوا۔ اسی طرح بعض لوگ جو اپنے وقت سے آگے زندہ رہ جاتے ہیں۔ آؤٹ آف ڈیٹ معلوم ہوتے ہیں۔ عطیہ فیضی جنھوں نے اپنے زمانے میں دھوم مچا رکھی تھی شبلی اور اقبال جن کے شدید مداح تھے اور نو عمر یلدرم جن کو جدید ہندوستانی عورت کا آئیڈیل نمونہ سمجھتے تھے۔ اب نصف صدی بعد وہ ایک بوڑھی خبطی سی خاتون جپسیوں کا لباس پہنے ہاتھ میں چھتری لیے لوگوں کو ڈانٹتی پھٹکارتی پھرتی تھیں۔ انھیں اور ان کے یہودی نژاد شوہر مصور فیضی رحمین اور بہن نازلی بیگم ہز انس آف جنجیرہ کو حکومت نے ایک کوٹھی بنوا دی تھی۔ وہاں جانے والوں سے ایچ۔ جی۔ ویلز اور برنارڈ شاہ اور اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتی تھیں۔ لوگ ان کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔[۳۲۸]

علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر جنھوں نے پاکستان بننے کے خواب دیکھے مگر پاکستانی قوم کو علامہ اقبال کی عظمت کا احساس نہیں ہوا وہ قوم کو بدنصیبی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے ہمہ وقت متفکر رہتے تھے۔ اس کے مزار کو تعمیر کرنے کے لیے حکومتِ پاکستان نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی تو عوام نے چندہ مانگنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں حکومت افغانستان نے شاہی عطیہ عنایت کیا جس بنا پر قرۃ العین حیدر پاکستانی عوام اور حکومت پر طنز کرتی ہیں۔

اقبال۔ ہائے اقبال یہ ایک بہت بڑا شاعر تھا جس نے قوم کی بدنصیبی کی وجہ سے اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی اور بدنصیب قوم نے اخباروں کے ذریعے اعلان کیا کہ وہ اس کا مزار بے حد گرینڈ بنوائے گی۔ لہٰذا چندہ جمع ہونا شروع ہوا اور فرزند کوہستان شاہ افغانستان کی طرف سے بھی شاہی عطیے کا فرمان جاری ہوا (اچھا اب باقی آیندہ)۔[۳۲۹]

توحید

اسلامی عقائد میں توحید کو سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ جب تک عقل توحید کو پا نہیں

لیتی، دنیائے گمراہی کی طرف بھٹکتی رہتی ہے اور منزل سے کوسوں دور رہتی ہے۔توحید کی معرفت عالم وحکیم توانا و سرگرم عمل ہو جاتے ہیں اور اس کی بصیرت کائنات کے اسرار ورموز سے آشنا ہو جاتی ہے۔موحد کا دل تمام شکوک وخطرات سے پاک ہو جاتا ہے اور وہ غیر اللہ کے طلسم سے آزاد ہو کر دیگر افراد کا منت کش رہنا شرک قرار دیتا ہے جبکہ معبودانِ باطل اُس سے لرزاں اور خائف نظر آتے ہیں۔قرۃ العین حیدر مسئلہ توحید سمجھانے کے لیے غیر مسلم افراد سے مناظرہ کرتی ہیں۔

ایک انگریز مشتری آسمانی بادشاہت کی آمد پر کی خبر سناتا ہال میں آ پہنچتا ہے۔ہم سب بے حد خوش اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں اور زوردار مناظرہ شروع ہوتا ہے۔میں بڑا راسخ العقیدہ مسلمان ہوں۔اوجیت کہتا ہے۔مجھے قائل کرو۔میں پکی آریہ سماجی ہندو ہوں۔فیروز کہتی ہے۔مجھے سمجھاؤ۔دس سالہ نادرہ مرزا جو اپنے سرے کے اسکول سے آئی ہوئی ہے۔مسئلہ توحید پر اس سے نہایت باضابطہ مناظرہ کر رہی ہے۔[۳۳۰]

قرۃ العین حیدر خدا کی واحدنیت پر زور دیتی ہیں کہ اللہ ایک ہے۔جس بنا پر وہ مسئلہ توحید پر روشنی ڈالتے ہوئے وضاحت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کے دلوں کے حال جانتا ہے اور شیطانی وسوسوں اور چالوں سے خوب واقف ہے۔

''خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرماتیں۔اے بیبیو! جو انگریزی دان دہریے خدا کے منکر ہیں۔ان کا احوال مجھ سے سنو۔کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے۔جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں۔اے مومنہ بیبیو! کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔فرماتا ہے۔وہ رب ذوالجلال کہ **قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یو لد ولم یکن لہ کفوا احد**۔یہ وَن کیا ہے؟ ون انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں۔[۳۳۱]

قرۃ العین حیدر کے والد محترم سجاد حیدر یلدرم کو کسی سفید ریش قزلباش بزرگ نے سورۃ اخلاص کی دعائیہ رباعی سنائی۔جس کے تذکرہ سے توحید پر قرۃ العین حیدر کے ایمان کی پختگی اور بھی مضبوط ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ پر اسے بے حد بھروسہ اور توکل ہے۔

ایک بزرگ سفید ریش قزلباش پیر مرد مسٹر سجاد سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان سے سردار محمد یعقوب خاں (سابق امیر کابل حال مقیم مسوری) کے حالات پوچھتے رہے اور رخصت کے وقت ہمارے دوست نوشہ کو سورۃ اخلاص کی یہ دعائیہ رباعی پڑھ کر سنائی۔

اے بہر کارے رفیقت قل ہو اللہ احد
وائے نگہبان تن و جان تو اللہ الصمد
لم یلد یارت ولم یولد بہر جادست گیر
لیکن ناصر تر ابر سرلہ کفوا احد[۳۳۲]

اقبال کے نزدیک توحید کا جو معیار قرآن مجید نے قائم کیا ہے وہ کسی دیگر آسمانی کتاب میں میسر نہیں۔ جس کا تذکرہ اقبال ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

جس کی انفرادیت کے پیش نظر قرآن پاک نے اس کے لیے اللہ کا اسم معرفہ استعمال کیا ہے اور پھر اس کی مزید وضاحت ان آیات میں کی ہے **قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یو لد ولم یکن له کفوا احد**۔[۳۳۳]

اقبال نے مسئلہ توحید کی وضاحت اپنی نظم ''لا الہ الا اللہ'' میں بڑی عقیدت سے کی ہے۔ اقبال کے نزدیک حیات کا مقصودِ حقیقی اور حقیقی منزل عرفان خدا ہے۔ وہ خدا تک رسائی کے متمنی نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر خدا مل گیا تو سب کچھ مل گیا۔ جس بنا پر انھوں نے توحید کی اہمیت اور حقیقت ظاہر کر کے اس پر عمل کرنے کی بڑے جوش و خروش سے تبلیغ کی دعوت دی ہے۔

خرد ہوئی ہے زماں و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں، نہ مکاں لا الہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ[۳۳۴]

قرۃ العین حیدر توحید کی تبلیغ کی اشاعت کے لیے علامہ اقبال کے انھی افکار کی روشنی میں اپنے افکار و نظریات کے ساتھ تبلیغ اسلام کی اشاعت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ خدا واحد کی تبلیغ کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں۔ جس کا تذکرہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے حوالے سے کرتی ہیں۔

بہر حال بمقام سیلہ گڑھ تالاب ایکا نیر کے کنارے جھونپڑی ڈال کر ٹوٹی پھوٹی ہریانوی زبان میں تبلیغ شروع کر دی مجھے ہے حکم اذان...... '' بے شمار دیوبندی مولانا۔ ذہن پرست انقلابی......سر پہ کفن باندھ جیل میں گھس گیا۔ یہاں اور وہاں بھوکوں مرا۔ مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ مارا گیا۔ قید خانہ میں بند ہوا کالے پانی بھیجا گیا، فراموش ہوا۔ آج گمنام ہے۔ نہ زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ۔[۳۳۵]

علامہ اقبال اسلامی توحید کو فقط فلسفیانہ بحث نہیں گردانتے بلکہ ایک متفقہ عملی نظام تصور کرتے

ہیں۔ان کے نزدیک عہد رسالت اور عہد صحابہ عمل و ایمان کے مجموعہ کا نام توحید ہے۔جس بنا پر وہ توحید کے سبب کسی کے روبرو جھکنا ناپسند کرتے تھے اور آپ شرک و بدعت اور قبر پرستی کے خلاف تھے جس بنا پر اقبال مذہبی رہنماؤں اور ملاؤں کے خلاف اظہار خیال کرتے رہتے تھے۔

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا، نہ فقیہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے؟ قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام [۳۳۶]

قرۃ العین حیدر کے ہاں بھی ملاّ توحید کی تعلیم دینے سے قاصر ہے۔جس بنا پر وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف راغب کرتے ہیں اور شعبدہ بازی کی بنا پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بناتے ہیں اور وہ صحیح اسلامی تعلیمات کا پرچار نہیں کرتے۔جس بنا پر قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی مانند ایسے مذہبی رہنماؤں کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔

حاجی سلیم نے غور سے مجھے دیکھا۔''خانم کیا تم ان میں سے نہیں ہو جو ایمان لائے؟ جو اپنی روح کا حج کرے۔اس پر اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔میں نے اپنی روح کا حج کیا پر کچھ دریافت نہ ہوا'' ''خانم'' شاید تمھارے قلب پر کفر کی مہر گہری لگی ہے۔حاجی سلیم نے کہا اور صراحی سے تھوڑا سا پانی کوزے میں انڈیلتے ہوئے ایک بیکتاشی دعا پڑھی ''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمدؐ اس کے رسول اور علیؑ اس کا دوست اور امام مہدی آخر الزماں اور موسیٰؑ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح اللہ......خانم اس پانی میں دیکھو۔'' کیوں کیا آپ کو جام جمشید مل گیا ہے؟ میں نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا [۳۳۷]

رسالت

اقبال کے نزدیک رسالت کے بغیر کار جہاں میں توحید کا کام ناتمام ہے۔رسالت کی مثال ایسے ہے جیسے جسم میں روح اور نبی کے بغیر آئین حیات ترتیب نہیں دیا جا سکتا جیسے جسم بغیر روح کے رہ جاتا ہے۔

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید [۳۳۸]

اقبال حضور اکرم ﷺ کو سلسلہ نبوت کی آخری کڑی کہتے ہیں اور نبی آخری الزماں ہونے کا

اقرار کرتے ہیں۔

لا نبی بعدی ز احسان خدا است
پردۂ ناموس دین مصطفیؐ است [۳۳۹]

اقبال نہ صرف رسول پاک کی نبوت پر اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ وہ آپؐ سے بے انتہا عشق کا اظہار کرتے ہیں بانگ درا کی ایک مستقل نظم ''حضورؐ رسالت مآب میں'' کے علاوہ بھی ان کے کلام میں حضور اکرمؐ سے محبت اور عقیدت کا والہانہ اظہار ملتا ہے اور اسی محبت وعقیدت میں وہ اپنا ایمان مکمل کرتے ہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں [۳۴۰]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں عشق محمدؐی میں گرفتار ہیں۔جس کا اظہار انھوں نے اپنی تصنیف گلگشت کے ایک باب ''کہ یہ عشق سارا محمدیؐ ہے'' کے عنوان میں کیا ہے۔وہ علامہ اقبال کے اشعار میں حضور پاکؐ سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کشمیر کو مدینۃ المنورہ کا درجہ حضور پاکؐ کے موئے مبارک کی وجہ سے مماثل قرار دیتی ہے۔

حضرت بل کو عہد شاہ جہانی میں باغ صادق خاں کہتے تھے آج سے تقریباً پونے تین سو سال قبل ایک بزرگ خواجہ نور الدین موئے مبارک سری نگر لائے اسے جہانگیر کی بنائی ہوئی مسجد میں محفوظ کیا گیا۔شاعر نے تاریخ کہی ہے کشمیر مدینہ شد از موئے نبیؐ۔[۳۴۱]

قرۃ العین حیدر حضور اکرمؐ سے شدت سے عقیدت ومحبت کا اظہار کرتی ہیں اور موئے مبارک کی زیارت کرتے ہوئے حضور پاکؐ کی زیارت کا ایک زینہ سمجھتے ہوئے نبوت پر ایمان کامل تصور کرتی ہیں اور عشق نبیؐ ہی کی بدولت تمام کائنات کو اپنا ہی علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں تصور کرتی ہیں۔

کبھی خواب میں رسولؐ اللہ کی زیارت کی؟''جناب دوبار۔'' کہاں؟''ادھر ہی جناب اپنے کمرے میں''۔''ماشاء اللہ، بہت خوش نصیب آدمی ہو۔جی ہاں جناب''کبھی حضرت بل گئے ہو؟ موئے مبارک کی زیارت کو۔''زیارت موئے مبارک اگر دل سچا ہو تو یہیں نظر آ سکتا ہے۔جناب۔''.....مسجد بل میں نماز کے بعد ایک مینار میں سبز چوغے میں ملبوس ایک مولوی صاحب نمودار ہوئے۔ان کے ہاتھ میں بلور اور چاندی کا ایک سلنڈر سا تھا۔جسے انھوں نے نیچے مجمع کی طرف بڑھایا۔اتنی دور سے موئے مبارک نظر نہیں آ سکتا تھا مگر ہجوم پر ہیبت اور سکتہ طاری

تھی۔ بہت سی عورتیں اور مرد رُو رہے تھے۔ عورتیں ہاتھ پھیلا کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ مجمع پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری تھی۔ عشق نبیؐ کا یہ ایک حیرت انگیز نظارہ تھا۔ ''کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں''۔[۳۴۲]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں حضرت محمدؐ سے لگاؤ کامل ایمان تصور کرتی ہیں۔ جس وجہ سے وہ حضور اکرمؐ سے بے پناہ عشق کرتی ہیں۔ جس کا اظہار وہ کشمیری عوام کے نام حضور اکرمؐ کے نام سے منسلک کر کے عقیدت ومحبت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

کیا نام ہے......؟ غلام محمد''...... کشمیر میں ہر دوسرے آدمی کا نام غلام محمد، غلام نبی، غلام رسول ہے۔ یہ ان کے بے پناہ عشق رسول کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ مسلمان بچے کا نام غلام محمد کے علاوہ اور کیا ہونا چاہیے۔[۳۴۳]

مردِ مومن

قرۃ العین حیدر کا تصور ''مردمومن'' علامہ اقبال کے تصور ''مردمومن'' کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ''مردمومن'' یا ''مرد کامل'' کی متلاشی نظر آتی ہیں۔ کمال فاروقی جو پاکستان کی دفاعی افواج کے میڈیکل چیف جنرل کا اکلوتا لڑکا تھا۔ وہ جدید تعلیم کا پروردہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ''مردمومن'' بھی دکھائی دیتا ہے۔ جن کے متعلق قرۃ العین حیدر یوں تذکرہ کرتی ہیں:

کمال فاروقی عرف بوبی بے حد کٹر مسلمان وہ پاکستان کی دفاعی افواج کے میڈیکل چیف جنرل فاروقی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ (جنرل فاروقی ایک سویٹ بزرگ تھے) اس کا مسئلہ ایک اور تھا روحانی اور ذہنی طور پر انگریز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ عرصہ سے بڑا زبردست مردمومن بن چکا تھا۔[۳۴۴]

قرۃ العین حیدر فوجی سربراہوں کو اقبال کے مرد کامل کی صورت میں اعلیٰ اخلاق کا نمونہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ جن کی بنیاد پر اقدار حیات استوار ہے اور ملک وقوم کی عظمت وعزت ان کے ہاتھ میں ہے۔ قرۃ العین حیدر ان سربراہان افواج سے بے حد امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ جن کے طفیل کشمیر اور سقوط حیدر آباد کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ایسے مرد مومن اور مرد کامل کا جائزہ بڑی مایوسانہ انداز میں لیتی ہیں۔ جن کے متعلق اقبال یوں کہتے تھے:

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن[۳۴۵]

لیکن دور جدید کے آفیسروں سے قرۃ العین حیدر مایوس نظر آتی ہیں۔ جنھیں اقبال مرد مومن کے روپ میں دیکھنے کے متمنی تھے۔

بریگیڈیئر موسیٰ جو اکثر حسنین ماموں کے ہاں آیا کرتے تھے۔ ہزارے کے شیعہ اور شکلاً بالکل چینی معلوم ہوتے تھے اور فوج میں بہت سے انگریز افسر موجود تھے جو عنقریب انگلستان کوچ کرنے والے تھے اور حسنین ماموں کے ہاں ڈنرز پر آتے تھے اور پھولدار غلاف والی ونڈ وسیٹ پر ٹک کر یا آتش دان پر کہنی ٹکا کر برطانوی دولت مشترکہ کے خوش آیند مستقبل پر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ تن تیرا نہ من اور اخبار مسئلہ کشمیر اور سقوط حیدر آباد سے پر تھے۔ میں نے شیخ و برہمن۔[۳۴۶]

تصورِ وقت

قرۃ العین حیدر کا تصور زماں نہایت جدید فکری رویئوں کا حامل رہا ہے وہ زماں و مکاں کا مشاہدہ کرتے ہوئے وقت اور انسان کے حوالے سے زندگی کے پہلوؤں کو اجاگر کرنا اپنا مقصد حیات تصور کرتی ہیں۔ ''وقت'' ان کے ذہن میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیشہ سے محبوب موضوع رہا ہے قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں میں تصور وقت ابتدا ہی سے نمایاں رہا ہے۔

اجی میں خود مستقبل سے نکل کر آیا ہوں۔ میں وقت ہوں۔ جو زندگی کا کاغذ کترتا رہتا ہوں۔[۳۴۷]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک وقت ایک کارواں کی مانند ہے جو ہر حال میں گزر رہا ہے۔ ماضی کے بیتنے کا افسوس اور مستقبل کی فکر اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہوتے، یہ گزرتا رہتا ہے۔ اس میں نئے نئے دن اور راتیں آتی ہیں۔ جس میں وقت کے ساتھ ساتھ مشکلات و پریشانیاں بھی آتی رہتی ہیں۔ حیات وموت کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ حتیٰ کہ روز محشر آسمان کے تلے ہم سب موجود ہوں گے۔ قرۃ العین حیدر نے وقت کے متعلق تفصیلاً وضاحت یوں کی ہے:

ایک کارواں ہے جو آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ماضی کا افسوس اور فردا کی فکر اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ نئے دن آتے ہیں نئی راتیں آتی ہیں۔ جھکڑ چلتا ہے، آندھیاں اٹھتی ہیں۔ انسان جیتے ہیں اور مرتے ہیں، دل ٹوٹتے ہیں اور جڑتے ہیں، کسی کو موت آتی ہے، کسی کو نہیں آتی۔ یہ چکر یونہی چلتا رہے گا۔ سب انچت ہیں۔ سب دکھی ہیں۔ کارواں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اگلے لمحے ہم سب ایک دوسرے آسمان کے نیچے ہوں گے۔[۳۴۸]

قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا کا مرکزی کردار ''وقت'' ظاہر کیا ہے۔ وقت کا تصور انھوں نے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ چلتے پھرتے انسانی کردار کٹھ پتلیوں کی صورت میں نظر آتے ہیں اور وہ اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک وقت کا شعور ایک تسلسل کے احساس کے ساتھ جاری وساری ہے جو کبھی بہتے ہوئے دھارے کی شکل میں اور کبھی پس منظر میں ایک سائے کی مانند موجود رہتا ہے۔ جس بنا پر اس نے وقت کو ایک ڈراؤنا بھوت قرار دیا ہے۔

آگ کا دریا کا مرکزی کردار وقت ہے۔ لوگ بدل جاتے ہیں وقت نہیں بدلتا۔ وہ رواں تھا اور رواں ہی رہتا ہے یہ تسلسل ماجد کلیم کے الفاظ میں۔ ''کرب کے لمحوں سے مرتب ہے۔ دریا وقت کی علامت ہے جو تباہ کن ہے اور قائم بھی رہتا ہے۔ یہ دریا آگ کا دریا اس لیے ہے کہ وقت سے مضر نہیں اور وقت کا ہر لمحہ کرب کا لمحہ ہے۔[۳۴۹]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک وقت کا شعور ایک تسلسل کے احساس کے ساتھ جاری وساری ہے جو کبھی بہتے ہوئے دھارے کی شکل میں اور کبھی پس منظر کے روپ ایک سائے کی مانند موجود رہتا ہے۔ جس بنا پر اس نے وقت کو ایک ڈراؤنا بھوت قرار دیا ہے۔ جو ہر ایک شے کو ختم کرنے کے لیے تلا ہوتا ہے وہ اسی بنا پر اس سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ جو لمحہ بہ لمحہ جاری وساری ہے۔

وقت کالے بھتنوں کی طرح آگے آگے بھاگتا جا رہا ہے۔ اس کے منحوس لرزہ خیز سائے ہر سمے چاروں کھونٹ منڈلاتے ہیں۔ وقت جو گزر رہا ہے، مجھے ختم کر دے گا۔[۳۵۰]

قرۃ العین حیدر وقت سے خوفزدہ ہیں۔ وقت پر کوئی بھی قابو نہیں پا سکتا مگر جو ہوش وحواس قائم رکھتا ہے وقت کو پہچان لیتا ہے۔ وقت اس کے تابع ہو جاتا ہے مگر پھر بھی وقت بڑی ظالم چیز ہے جو ہر چیز کو فنا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس سے خوفزدہ نظر آتی ہے۔

گوتم میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وقت بہت خوفناک چیز ہے کیا تم کبھی وقت کے خوف سے لرزے ہو۔[۳۵۱]

قرۃ العین حیدر کے ہاں ''وقت'' اور ''فنا'' کا یہ کردار ان کی تصانیف میں واضح ملتا ہے جو انھوں نے علامہ اقبال کے تصور زماں سے اخذ کیا ہے۔ اقبال فنا کے تصور کو وقت کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ جس کا اظہار ان کی نظم ''مسجد قرطبہ'' میں واضح طور پر ملتا ہے۔

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا[۳۵۲]

قرۃ العین حیدر وقت کی جبریت کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں

بیان کرتی ہیں کہ وقت نے ''چمپا'' ملک اور ''انگ کور کا مندر'' اور ''مسجد قرطبہ'' کو ویران کر دیا ہے۔ چمپا جو ہندو دھرم کا ملک تھا۔ قبلائی خان کے حملہ آوروں نے اسے نیست و نابود کر دیا۔

چمپا۔ مہاراج دھیراج سری جے اندرومن کا ملک سولھویں صدی میں قبلائی خان کے حملہ آوروں نے ان ساری جگہوں کا خاتمہ بالخیر کر دیا...... انگ کور کا مندر۔ قرطبہ کی مسجد۔ اوّل و آخر فنا۔ اوّل و آخر فنا...... ظاہر و باطن فنا![۳۵۳]

قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا کی ابتدا میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ایک نظم تحریر کی ہے۔ جس میں وقت کے متعلق رقم کیا گیا ہے۔ اس بنا پر بعض ناقدین ان پر ٹی ایس ایلیٹ کے افکار کے اثرات گردانتے ہیں مگر ابوالفیض سحر نے ان پر ٹی ایس ایلیٹ کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے افکار و نظریات کے اثرات کو بھی ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے:

میرے خیال میں ان کے ہاں اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ کی فکر کی گہرائی، بصیرت کی وسعت اور احساسات و جذبات کا عمق ملتا ہے اور اسی تیز دھار و توانا تاثیر کے ساتھ۔[۳۵۴]

تصور زماں و مکاں کے سلسلہ میں علامہ اقبال نے خطبات اور دیگر تصانیف میں تحریر کیا جو مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے زماں و مکاں کا سائنسی اور فلسفیانہ مسئلہ کی توسیع و تشریح اور اس کے اطلاقات پر زور دیا۔ جس میں مذہب اور الٰہیات کے مختلف اصولوں پر بنظر غائر روشنی ڈالی گئی۔ اقبال نے زماں و مکاں کے سلسلہ میں قدیم یونانی مفکرین، مغربی مفکرین، اسلامی مفکرین کے خیالات کا جائزہ لیا اور اسے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اختلافات لیل و نہار کو خدائے بزرگ و برتر کی نشانیاں بتایا۔ اقبال مغربی مفکرین میں آئن سٹائن کے بہت مداح تھے۔ جن کا تذکرہ انھوں نے پیام مشرق کی ایک نظم ''حکیم آئن سٹائن'' میں بھر پور انداز میں مزاج تحسین کے ساتھ پیش کیا ہے لہٰذا وہ آئن سٹائن کے پیش کردہ تصور زماں و مکاں سے بہت حد تک متفق ہیں۔ جس بنا پر ان کے نظریہ اضافت کی اس تعبیر سے اتفاق رکھتے ہیں جو وہائٹ ہیڈ نے پیش کی۔ اسی وجہ سے اقبال قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس میں زماں کے بارے میں ہمارے مشاہدات کو اضافی قرار دیتے ہوئے شعور کے نامعلوم مدارج کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حقیقی زماں ایک قسم کا تخلیقی فعلیت ہے۔ جس کے متعلق تواتر کا تصور کیا جا سکتا اور اسے ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

زماں متسلسل ہی حقیقی زمانہ ہے اب اگر زمانے کے تصور کو ماضی، حال اور مستقبل کا تصور مستلزم ہے تو ہم اس قیاس ایک خط مستقیم ہی پر کریں گے۔ جس کا ایک حصہ طے ہو چکا ہے یعنی ہم اسے پیچھے

چھوڑ آئے ہیں اور ایک ہمارے سامنے ہے لہٰذا اس کا طے کرنا باقی ہے لیکن جس کا مطلب یہ ہوگا کہ زمانہ کوئی زندہ اور تخلیقی حرکت نہیں بلکہ ایک سکون مطلق جس میں ہر طرح کے ڈھلے ڈھلائے حوادث پہلے سے جمع ہیں اور اب یکے بعد دیگرے ویسے ہی ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ جیسے خارج میں بیٹھے ہم کسی فلم کا تماشا کر رہے ہیں۔[۳۵۵]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے انھی افکار کو تصور زماں کے متعلق پیش کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ وقت کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کی شکل میں ہو وقت مسلسل موجود ہے اور مسلسل جاری وساری ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اقبال کی مانند آئن سٹائن سے بھی متفق ہیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے دوسروں کے لیے، دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی...... اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے لیکن ماضی حال ہے حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی وقت کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے...... میں وقت کے ہاتھوں عاجز آ چکی ہوں تم میں سے کوئی میری مدد نہیں کرتا۔ تمھاری مدد شاید آئن سٹائن بھی نہیں کر سکتا۔ میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وقت برابر موجود ہے وقت مسلسل حال ہے...... انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے اور جوانی اور بڑھاپے میں کچھ اور تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے صرف تسلسل باقی رہتا ہے پہاڑوں پر گلیشیئر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے ہوائیں، اندھیرا، وقت جو سیال تھا۔ وقت جو برف میں منجمد تھا...... ہم وقت سے اور اندھیرے سے خوفزدہ ہیں کیونکہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے گا اور اندھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہوگا۔[۳۵۶]

علامہ اقبال جنھوں نے آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کو پسند کیا۔ قرۃ العین حیدر نے بھی اس سے استفادہ کیا۔ اقبال نے اس تصور زماں کو اپنی نظم ''مسجد قرطبہ'' میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ زندگی زماں کے مسلسل تغیر وحرکت کا دوسرا نام ہے۔ ان کے نزدیک انسان اپنے جسم اور روح کے ساتھ مل کر ایک ہی وحدت میں گم ہو جاتا ہے۔ مادہ اور روح ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ مادہ روح کا نام ہے جب اسے زماں ومکاں میں بیان کیا جائے۔

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانہ کی رو جس میں دن ہے نہ رات[۳۵۷]

قرۃ العین حیدر نے ''زماں و مکاں'' کے تصور کو واضح کرنے کے لیے اپنی تصنیف کار جہاں دراز ھے جلد دوم میں علامہ اقبال کے تصور زماں و مکاں سے ہو بہو استفادہ کیا ہے اور اس کے ابواب کے نام ''سلسلہ روز و شب''، ''تار حریر دو رنگ'' اور ''تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا'' رکھے ہیں۔ یہ تصنیف ماضی کی تلاش، حال کا جائزہ اور مستقبل کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر عبد المغنی ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

یہ وقت کا اضافی تصور ہے اور تاریخ کی مجموعیت کو نہایت معنی خیز اور فکر انگیز انداز سے پیش کرتا ہے کار جہاں دراز ھے کا پورا منصوبہ تخلیق اور نقشہ ترتیب اسی تصور پر مبنی ہے۔ اس کے تحت ماضی کی تلاش، حال کا جائزہ اور مستقبل کا اندازہ بن جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت افروز ترکیب خیال ہے۔ تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا، ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات[۳۵۸]

اقبال نے اسرار خودی میں ''الوقت سیف قاطع'' کے عنوان سے ایک نظم تحریر کی ہے۔ جس میں وقت ایک شمشیر براں کی مانند ہے۔ یہ جس کے ہاتھ میں ہو اس کے پاس حضرت موسیٰ جیسی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی شمشیر کی بدولت اور ضرب سے پتھروں میں چشمے ابل پڑتے ہیں اور سمندر سے راستے نکل آتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے پاس بھی یہی سیف روزگار تھی۔ جس سے ان کی فتوحات عمل میں آئیں تھیں۔ جو وقت کی گردش کو سمجھ جاتا ہے وہ سب کچھ پا لیتا ہے۔

صاحبش بالاتر از امید و بیم
دست او بیضا تراز دست کلیم
پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود
قوت بو از ہمیں شمشیر بود
گردش گردونِ گرداں دیدنی است
انقلاب روز و شب فہمیدنی است[۳۵۹]

قرۃ العین حیدر نے بھی اقبال کے اسی افکار کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جو زمانے کی گردش کو پہچان لیتا ہے۔ وہ اس پر قابو پا لیتا ہے جس سے وقت اس کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے۔

گوتم نے مزید کہا۔ وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں، کوئی منطق، کوئی طاقت، وقت پر قابو نہیں رہ سکتا۔ جو آنکھیں رکھتا ہے وہ وقت کے ارتقا کو پہچان لیتا ہے۔[۳۶۰]

اقبال تصور زماں میں دن رات کے تصور کو ناپنے کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک جو اس کی

تعداد کا شمار رکھتا ہے وہ گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ زمانہ کی اصل حقیقت سے نا آشنا ہے۔

اے اسیر دوش و فردا در نگر
در دل خود عالمِ دیگر نگر
درگل خود تخم ظلمت کاشتی
وقت را مثل خطے بنداشتی
باز با پیمانۂ لیل و نہار
فکر تو پیمود طولِ روزگار[۳۶۱]

علامہ اقبال نے دن رات کے تصور سے نکلنے کے لیے اپنی نظم ''مسجد قرطبہ'' میں بھی یہی تذکرہ کیا ہے کہ وقت خود انسان کو پرکھتا رہتا ہے۔ وقت کسی کو معاف نہیں کرتا انسان اس کے شمار میں کیوں الجھتا رہتا ہے۔

سلسلہ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلہ روز و شب، صیرفی کائنات[۳۶۲]

قرۃ العین حیدر نے اپنی تصنیف ستیاھرن میں سیتا کا کردار جو جنسی بے راہروی کا شکار ہو کر مختلف مردوں کے ہاتھوں خود لذت سوزی کا شکار بنتی ہے۔ آخر کار وقت کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر اکیلی رہ جاتی ہے، تنہائی اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اسی عالم میں دیکھتی ہیں کہ کافی روز سردی کے سبب سورج بھی طلوع نہیں ہوا اور نجانے اس بار سال میں کتنی بہاریں آئیں گی۔ وقت خود اس کا محاسبہ کرتا ہے۔ اسی سنگین صورت حال کو قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار میں بعینہٖ فلسفیانہ رخ دیا ہے۔

ابھی دن باقی ہے پھر رات ہوگی۔ پھر صبح ہوگی۔ ایک اور دن۔ ایک اور رات سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی نہیں لگا سکا ہے۔ تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ......سلسلہ روز و شب صیرفی کائنات دن اور رات کا حساب......سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ۔ ہوا کے جھونکے نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔[۳۶۳]

قرۃ العین حیدر نے ماضی اور حال کے تناظر میں ایک افسانہ ''دو سیاح'' تحریر کیا ہے۔ جس میں ماضی اور حال کی طنابیں ملا کر وقت کو ایک اضافی چیز قرار دیا ہے اور ان سیاحوں کے متعلق راز

اس وقت فاش کرتی ہیں۔ جب وہ آگرہ کے ایک ہوٹل کی وزٹر بک میں اپنے دستخط کرتے ہیں۔ ماضی اور حال کے اس دور کو ڈاکٹر عبدالمغنی علامہ اقبال کے تصور زماں کے عکس میں دیکھتے ہیں۔

یہ ''دوسیاح'' اتنے پراسرار کیوں نظر آرہے تھے اس عجیب انداز میں قرۃ العین حیدر نے ماضی کا ایک ورق الٹ کر ہماری نگاہوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اگرچہ یہ حال کے تناظر میں ہے اس طرح دوروحوں کی شب گردی ماضی وحال کی طنابیں کھینچ کر ملا دیتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وقت کا حساب ایک اضافی چیز ہے ورنہ وہی اقبال کا تصور زماں یاد آتا ہے۔ جس کا حوالہ قرۃ العین حیدر اکثر دیتی ہیں۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات[۳۶۴]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک زندگی افق در افق رواں ہے، اور انسانوں کے قافلے منزل در منزل مسلسل سرکرتے گزار رہے ہیں۔ وہ اسی کھیل کو دائمی اور مستقل قرار دیتی ہیں۔

لاکھوں برس سے سورج اسی طرح طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور طلوع۔[۳۶۵]

اقبال زندگی اور زمانہ کو لازم وملزوم قرار دیتے ہیں یعنی جبکہ زماں صحیح طور پر ذہن نشین نہیں ہوتا زندگی کو سمجھنا ناممکن ہے۔ حضور اکرمؐ کی حدیث مبارکہ کی رو سے ''زمانہ کو برا مت کہو'' زمانہ خود خدا ہے جو قائم ودائم ہے۔

زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لا تِسبوُ الدّھر فرمان نبیؐ است[۳۶۶]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک وقت قائم ودائم اور مستقل ہے اور وہ خدائے بزرگ و برتر کے نزدیک ایک ہی وقت تصور کرتی ہے اور اس میں کوئی تفریق ماضی، حال اور مستقبل کی نہیں ہے۔ علامہ اقبال کے انھی افکار کی روشنی میں قرۃ العین حیدر زماں کے بارے میں بیان کرتی ہیں:

سارا وقت ایک ہے۔ قرآنی وقت۔ آن واحد۔ خدا کے نزدیک سب ''آج'' ہے۔ جزا و سزا جاری ہے روز قیامت بھی ہے آنے والا نہیں موجود ہے۔[۳۶۷]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے تصور زماں کو حیات اور حقیقت کے ادراک میں مسلسل حرکت کے طور پر پیش کیا ہے جو ابھی تک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ اسلام کی خاطر ہندی مسلمانوں نے تحریک خلافت کے سبب ہجرت اختیار کی جسے قرۃ العین حیدر اقبال کے تصور زماں کی

روشنی میں وضاحت کرتی ہیں:

ہزار ہا غریب ہندی مسلماں خدا رسول کا عاشق فرنگی سے مقابلہ کرنے کوچہ بازار کھیت کھلیان سے نکلا۔ گلے میں حمائل شریف۔ ہاتھ میں ستو کی پوٹلی۔ کہ جہاں میں نان جویں پر ہے مدارِ قوت حیدریؒ مارا گیا۔ قید خانہ میں بند ہوا۔ کالے پانی بھیجا گیا۔ فراموش ہوا۔ آج گمنام ہے۔ نہ زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ۔[۳۶۸]

علامہ اقبال انسان کو مکمل آزاد اور خود مختار دیکھنے کے خواہاں ہیں اور ایسے انسان کو مردِ آزاد یا قلندر کہتے ہیں جو زمانے کے مقید نہیں بلکہ اس کو اپنی مرضی کے تابع کرتے ہیں اور اپنے مستقبل کو جس طرح خواہاں ہوں، تشکیل دیتے ہیں۔ اسی یقین محکم کے سرچشمے سے انسان کے تمام اعلیٰ وارفع تخیلات وجذبات جنم لیتے ہیں ورنہ انسان مجبور و بےبس مخلوق بن جاتا ہے۔ اسی کی بدولت شعور کا وہ مرکزی نقطہ مستحکم ہوتا ہے جسے ہم خودی کا نام دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک حقیقی اور آزاد انسان وہ ہے جو زمانے کی بندشوں سے آزاد ہو ورنہ وہ غلام ہے جو ان بندشوں میں الجھا ہوا ہے اور تغیر و تصرف کی قدرت نہ رکھتا ہے آزاد انسان زمانے کو محکوم و غلام بناتا ہے اور محکوم و غلام زمانے کی غلامی قبول کرتے قبول کرتے ہیں۔ اسی لیے اقبال ایسے شخص کو پسند کرتے ہیں جو

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر[۳۶۹]

قرۃ العین حیدر کے ہاں ''وقت'' کے تیز بہاؤ میں بہہ جانے والے افراد موجود ہیں جن میں آخر شب کے ہمسفر کے کردار بالخصوص موجود ہیں۔ مثلاً ریحان، جہاں آرا، یاسمین اور شہزاد، فرقان اور ناصرہ نجم السحر، چارلس بارلو اور سوامی آتم آنند، پادری، نبر جی اور رادھیکا سانیال، زہرہ اور دیپالی وغیرہ ہیں۔ یہ تمام افراد کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے اپنے ضمیر کا سودا کر لیتے ہیں اور وقت کی ایک بڑی طاقت ان کے اتحاد کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ وقت کی گردش ہر چیز کو فنا کی جانب دھکیل کر لے جاتی ہے۔

ناصرہ نجم السحر جو انقلابی ذہن کی مالک ہیں وہ تھوڑی دیر کے لیے آزاد اور حقیقی انسان کے روپ میں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اس کی شخصیت میں علامہ اقبال کے افکار کے نمایاں اثرات دیکھتے ہیں جسے قرۃ العین حیدر نے اسی مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے۔

ناصرہ وسعت افلاک میں نمودار ہونے والا ایک تنہا سا نیا ستارہ ہے جس کا ایک گریزاں سا جلوہ ہمیں ناول کے آخر میں نظر آتا ہے۔ اس کے مستقبل کی پیش گوئی جو بھی کی جائے اس کے ماضی کا

جائزہ ممکن نہیں۔ وہ بس طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی ننھی، گرچہ بہت شوخ سی کرن ہے۔اس کا کردار صرف یہ بتاتا ہے کہ تمام ہنگاموں کے ختم ہو جانے کے بعد بھی زندگی ختم نہیں ہوتی اور ہر نئی نسل گویا پرانی نسل سے بغاوت کر کے زندگی کے راستے پر قدم آگے بڑھاتی ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

قرۃ العین حیدر کا اصلی نقطہ نظر بھی یہی ہے اس لحاظ سے ان کی جستجوئے ماضی ایک آفاقی جہت رکھتی ہے۔ نجم السحر کے چہرے پر جس صبح کے آثار ہویدا ہیں۔ وہ اپنے اپنے وقت پر ہر جوان کے روئے زیبا پر عیاں ہوتے ہیں۔ گردش ایام یوں ہی ہوتی ہے۔ پتے اور کام کی بات یہ ہے۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر [۳۷۰]

قرۃ العین حیدر کے ہاں تصور وقت انسانی جبر اور مقدر کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ جس نے وقت کی نزاکت کو سمجھ لیا گویا اس نے وقت کو اپنے قابو میں پالیا۔ اس لحاظ سے وہ علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کی رو سے وقت کے سلسلہ شب و روز کو اپنا تصور وقت مقرر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جو کہ ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ جس کے متعلق وحید اختر یوں رقمطراز ہیں۔

وقت کی یہ رو قرۃ العین کے تمام افسانوں میں اسی طرح کارفرما ہے۔ جس طرح مسجد قرطبہ میں خلاق و فعال وقت کا سلسلہ روز و شب۔[۳۷۱]

فلسفہ حیات و ممات

علامہ اقبال بنیادی لحاظ سے فلسفی تھے اور حق بین و حق اندیش تھے اور وہ مسلمانوں کی بربادی کا سبب خوفِ مرگ تصور کرتے تھے۔ جس بنا پر انھوں نے اس کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا کہ مسلمان موت سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوتا۔ خوفِ مرگ مسلمان کی شان و عظمت کے منافی ہے موت سے فقط وہی افراد خوفزدہ ہیں جو اسے فنائے کامل تصور کرتے ہیں اور آخرت پہ یقین نہیں رکھتے مگر جو لوگ موت کو آیندہ زندگی کا پیش خیمہ تصور کرتے ہیں وہ موت کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ لہٰذا اب مسلمان لوگ کافروں کی مانند موت کے خوف سے لرزاں ہیں اور مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہیں۔ انھیں دنیائے اسلام اس المیہ میں ملوث نظر آئی۔

ہمچو کافر از اجل ترسندۂ
سینہ اش فارغ ز قلب زندۂ

مرگ راچوں کافراں داند ہلاک
آتش اوکم بہا مانند خاک[۳۷۲]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے تصور وقت کے ساتھ ساتھ تصور موت کی بھی معتقد نظر آتی ہیں اور اس کے ہاں بھی موت عرفان حیات کی تکمیل کا دوسرا نام ہے۔ان کی تخلیقات میں بھی اقبال کی مانند حیات و موت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے تصور وقت کے ساتھ تصورِ حیات و ممات پیش کرتی ہیں۔

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات[۳۷۳]

قرۃ العین حیدر موت کو زندگی کا ایک اہم حصہ قرار دیتے ہوئے،موت کے خوف کو زائل کرنے کی کاوش کرتی ہیں اور موت کو برحق قرار دیتی ہیں۔زندگی موت کے بغیر ادھوری ہے۔

انھیں کیا پتہ زندگی کیا چیز ہے۔زندگی محض موت کا ایک حصہ ہے اور اس کے اس دوسرے حصے میں اب میں شامل ہو جاؤں گی۔[۳۷۴]

اقبال کے نزدیک موت اٹل ہے،جس سے فرار ناممکن ہے۔پھر موت سے کاہے کو ڈرنا۔اس سے شاہ و گدا نہیں بچ سکتے۔لہٰذا انھوں نے موت کے ہمہ گیر ہونے اور زندگی کے بے ثبات ہونے کے متعلق انتہائی بلیغ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا[۳۷۵]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک بھی اقبال کی مانند موت ایک اٹل قانون ہے۔ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑئے گا۔موت برحق ہے،لہٰذا موت سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔وہ ہر حالت میں آ کر رہے گی۔اس سے فرار ناممکن ہے۔قرۃ العین حیدر نے موت کی حقیقت پر فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے یوں کہا ہے:

زندگی کے بعد موت ایک اٹل قانون ہے۔مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔[۳۷۶]

مزید ایک اور جگہ پر وہ دنیا کی بے ثباتی کے متعلق اقبال کے فلسفہ موت کی وضاحت کرتے ہوئے ملکہ میری کی موت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتی ہے:

میں ملکہ میری کے جنازے کے سرہانے کھڑی رہی۔دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر گیا۔پیاری ملکہ میری موت سے کس کو رُستگاری ہے۔آج تم کل ہماری باری ہے۔[۳۷۷]

قرۃ العین حیدر موت کے متعلق ایک فلسفی کی حیثیت سے مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کاوش کرتی ہے کہ جس کسی کے مرنے کی باری ہو، موت کا فرشتہ خود بخود جان نکالنے کے لیے پہنچ جاتا ہے۔ دریا میں لکڑی کے گٹھے بہتے جارہے ہیں جن پر نمبر لگے ہیں۔ ان کے مالک انھیں دیکھ کر اپنا اپنا گٹھا نکال لیتے ہیں۔ اسی واقعہ سے متاثر ہوکر قرۃ العین حیدر موت کا تصور پیش کرتی ہے:

چناب کے گدلے پانی میں لکڑی کے گٹھے بہہ رہے ہیں۔ ان پر نمبر پڑے ہیں۔ بہت سے گٹھے پاکستان میں نکل جاتے ہیں اور انسان کی زندگی بھی ان گٹھوں کی طرح ہے جو دریا میں بہہ رہے ہیں۔ collecting station پر موت کا فرشتہ نمبر دے کر گٹھا نکال لیتا ہے۔[۳۷۸]

اقبال زندگی کے قائل ہیں اور انسانی زندگی کو عظیم گردانتے ہیں۔ وہ بے مقصد مرنے کے قائل نہیں۔ وہ موت کے ارزاں ہونے کے خلاف ہیں اور احسن طریقہ سے زندگی گزارنے کے حق میں ہیں۔

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت[۳۷۹]

اقبال اسی سلسلہ میں ادبا و شعرا پر زور دیتے ہیں کہ وہ نوجوان نسل کے روبرو زندگی کی عظمت اور بزرگی کی بجائے موت کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کریں بلکہ زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈالیں۔

ملک کے شعرا پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کی بجائے موت کو بڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے۔ اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض پیام موت ہے۔[۳۸۰]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی مانند بے مقصد موت کے خلاف ہیں۔ وہ جنگ و جدل فساد و خون ریزی کے برخلاف ہیں۔ وہ زندگی کو عظیم تصور کرتی ہیں اور بے موت مرنے پر کڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ موت کی ارزانی پر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ موت کے وقت کی تکلیف ہم سب میں سے کس کی سب سے زیادہ ہوئی...... میں نے اپنے عزیزوں اور پیارے دوستوں کو مرتے دیکھا ہے۔ میدان جنگ میں زخمیوں کے دم توڑنے کا نظارہ کیا ہے۔ ان فسادوں کے زمانے میں مجھے انسان ایک دوسرے کو چھرے گھونپتے نظر آئے ہیں۔ پتہ نہیں ہماری قسمتوں میں کس طرح کی موت ہے؟ کس طرح کی زندگی۔[۳۸۱]

اقبال موت کے بعد شخصیت کے تسلسل کو ختم نہیں ہونے دیتے بلکہ بذریعہ عشق موت زندگی

کی پہلی منزل ہے جس کے آگے زندگی کی حقیقت شروع ہوتی ہے۔اس زندگی کے حصول کے لیے ایک سچا عاشق موت سے کبھی خائف نہیں ہوتا۔موت ہر چیز پہ غالب آسکتی ہے مگر عشق پر اس کا زور کبھی نہیں چلتا۔اس سلسلہ میں اقبال اپنی نظم ''عشق اور موت'' میں وضاحت کرتے ہیں کہ فرشتہ اجل زندگی کی چنگاری کو بجھانا چاہتا ہے مگر عشق کے روبرو یہی فرشتہ بے بس نظر آتا ہے۔

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر
اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا[۳۸۲]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے اسی افکار کی وضاحت کرتی ہیں کہ موجودہ نسل موت پر فریفتہ ہے اور موت سے قطعاً خوفزدہ نہیں ہے۔ایک وقت تھا کہ یہ افراد کبھی میدان جنگ میں لڑا کرتے تھے لیکن آج ایک ایسا دور ہے کہ وہ گھروں میں ہی لڑتے رہتے ہیں یعنی اسلامی مما لک اتحاد عالم اسلامی قائم کرنے کی بجائے آپس میں ایک دوسرے سے بغض اور بیر رکھتے ہیں۔

موت سے ہماری بہت پرانی دوستی ہے ہماری پوری نسل تو گویا صریحاً عاشق ہے موت پر......تم تو باہر کے دشمنوں سے لڑتے تھے تو ابھی چند سال ہوئے ہمارے گھر کے آنگن میں ایک خونریز جنگ ہوئی تھی اور وہ جنگ بہت سارے محاذوں پر اب تک جاری ہے اور روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔[۳۸۳]

قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک افسانہ یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے میں ایک محبّ وطن اور سچے عاشق کے متعلق تحریر کیا ہے جو موت سے قطعاً خائف نہیں۔جس کے نزدیک موت ایک بامقصد فعل ہے۔موت ہر چیز پر غالب تو آسکتی ہے مگر عشق سے گریزاں ہے۔وہ اپنے وطن ''فلسطین'' کی آزادی کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے، جسے قرۃ العین حیدر اقبال کے تصور موت کے افکار میں ''خون عرب'' کا ایک ہیبت ناک منظر ہمیں دکھاتی ہے۔جس کے پس منظر میں زندگی لالہ محبت کی سرخ قبا میں لہراتی ہوئی نظر آتی ہے۔وہ فلسطین کی آزادی کی خواہاں ہے۔

کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع ہوئی اچانک اس کا کلوز اپ سامنے آیا آدھا چہرہ، آدھا دستی بم سے اڑ چکا تھا۔صرف پروفائل باقی تھا۔دماغ بھی اڑ چکا تھا۔ائیر پورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا بھیجا بکھرا پڑا تھا اور انتڑیاں، سیاہ جما ہوا خون۔کٹا ہوا ہاتھ کارتوس کی پیٹی، گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سا ملغوبہ۔تم بہت اچھے اداکار ہو۔کم از کم ٹی وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔واقعی؟ جلد تم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھو گی۔کیمرہ پیچھے ہٹا۔لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مسافر کے ہاتھ سے چھوٹ

کر گر گیا تھا۔ برابر میں ''نصرت الدین'' کا کٹا ہوا ہاتھ لالہ کے پھول اس کے خون میں لت پت......کافی کچھ جان جاننے کے باوجود۔منتظر لالہ کب سے......قبا چاہیے۔قبا چاہیے۔اس کو خون عرب سے۔[۳۸۴]

نظریہ تعلیم

قرۃ العین حیدر نظریہ تعلیم کے متعلق کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتی بلکہ وہ علامہ اقبال کے نظریہ تعلیم کی پیرو ہیں۔ وہ نئی نسل کو دین اسلام کی تعلیم سے آراستہ دیکھنے کی خواہاں ہیں۔لہٰذا وہ علامہ اقبال کی مانند قوم سے مایوس ہیں۔جن کے متعلق علامہ اقبال یوں کہہ گئے تھے:

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا[۳۸۵]

علامہ اقبال کے اسی گلہ و شکایت کا تذکرہ قرۃ العین حیدر موجودہ دور کے خداوندانِ مکتب سے اسی انداز میں کرتی ہیں۔جس انداز میں علامہ اقبال نے کیا تھا اور وہ واقعی ان شاہین بچوں کو خاکبازی کا درس ہی دے رہے ہیں۔اس سلسلہ میں وہ دو افراد کے درمیان ایک مکالمہ علامہ اقبال کے افکارِ تعلیم کی روشنی میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہیں:

(ب) تم نے جو کچھ پڑھا، بھول جاؤ۔ ہمارے ماہرین تعلیم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تعلیم بیکار ہے۔
(الف) وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ ہمیں کتابوں کے بجائے بندوقوں کی زیادہ ضرورت ہے۔قوم کے نونہالوں کو کتابوں کی جگہ بندوقیں دو......تاکہ وہ مجاہد بنیں۔مردمومن، شاہین۔
(ب) تعلیم یہ سب غریب کی افیم ہے۔غریبوں کو افیم مت دو۔اسے کھا کر ان کے دماغ چکرا جاتا ہے۔ان کی عقل چرخ ہو جاتی ہے۔
(الف) مگر یہ اتنا چلاتے کیوں ہیں۔
(ب) چلانے دو۔[۳۸۶]

علامہ اقبال جدید انگریزی نظام تعلیم سے نالاں تھے کیونکہ یہ نظام دین و مذہب کی تعلیم دینے کی بجائے سراسر مادیت پر مبنی تھا لہٰذا وہ اس نظام تعلیم کو دین کے خلاف ایک گہری سازش تصور کرتے تھے جو نوجوان نسل کو اعلیٰ اسلامی اقدار سے محروم کیے جا رہا تھا اور اپنے ساتھ بے دینی اور الحاد بھرپور انداز میں پھیلانے کی کاوش کر رہا تھا۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف[۳۸۷]

قرۃ العین حیدر مغربی تعلیم کے مضر اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ کنور صاحب جو تمام یورپ کی سیر زمانہ جوانی میں کر چکے تھے۔اپنے بچوں کو بھی مکمل آزادی دے رکھی تھی۔اس کی بیٹی مغربی تعلیم کے حصول میں پیش پیش تھی۔اپنے بھائیوں کے ہمراہ انگریزی ناچ کلبوں میں جاتی اور ان گنت احباب کے ساتھ گھومتی۔قرۃ العین حیدر مغربی تعلیم کے ان برے اثرات سے کڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

انھوں نے رخشندہ کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کا غلط استعمال نہیں کرے گی۔اس نے میرس کالج میں پانچ سال کا کورس ختم کر کے بیچلر آف میوزک کی ڈگری لی تھی۔اس نے الموڑے کے کلچر سینٹر میں رقص سیکھا تھا۔وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ دل کشا کلب جا کر انگریزی ناچ میں شامل ہوتی تھی۔اس کے ان گنت دوست تھے اور وہ سوسائٹی میں بے حد ہر دل عزیز تھی۔[۳۸۸]

مغربی تعلیم کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے جو تعیش پرستی، تن پروری اور عقل پرستی کا درس دے کر مذہب سے بیزاری کا ثبوت دے رہی ہے۔اس سے جوانانِ مسلم کے عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں۔مغربی تہذیب کی اندھی تقلید نے مسلمانوں کے نصب العین چھین کر بے دینی اور الحاد کا درس دے کر انھیں بے راہروی اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔جس کا انھیں احساس نہیں کہ وہ توحید کے نظریہ سے کس قدر کوسوں دور جا رہے ہیں۔جس کے متعلق علامہ اقبال نے یوں اظہار کیا تھا۔

گلہ تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ[۳۸۹]

قرۃ العین حیدر اقبال کے انھی افکار کی روشنی میں پاکستان کے نظام تعلیم کا جائزہ لیتی ہیں کہ عرصہ دس سال میں تعلیم کا معیار گر رہا ہے اور تمام پرانی روایات کا گلا گھونٹا جا رہا ہے اور خواتین دینِ اسلام کی تعلیم کے حصول کی بجائے مغربی تعلیم بالخصوص رقص و سرود کی محفلیں سجاتی ہیں لہٰذا مسلم قوم کو بربادی کے گڑھے میں گر کر بھی زیاں کا احساس نہیں جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا[۳۹۰]

قرۃ العین حیدر مسلمانوں کی بے حسی اور کسمپرسی کا رونا علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی

روشنی میں روتی ہیں کہ انھیں اپنی عظمت کے کھو جانے کا قطعاً کوئی احساس نہیں رہا اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہیں۔

دراصل......ذہنی اور جذباتی طور پر ۴۷ء سے پہلے کے لوگ ۵۷ء سے پہلے لوگوں کی طرح ہیں۔ میرے نئے ملک میں تو تعلیم کا معیار گر کر پامال میں جا پہنچا ہے۔ ساری پرانی ویلیو نے گلا گھونٹ کر جان دے دی۔ تم نے میرے یہاں کی خواتین کو نہیں دیکھا۔ تم تو خیر اُن سے واقف ہو۔ ایک عجیب دور سے گزر رہی ہیں۔ اور بے حد خوش اور مطمئن۔ معیار یہ ہے کہ صبح کو فیشن پریڈ بن کر یونیورسٹی جاتی ہیں اور شام کو رقص کے لیے جم خانہ۔ ہماری اس نئی اجتماعی زندگی میں کوئی گہرائی نہیں ہے۔ کوئی گھبراتا۔ کوئی عظمت نہیں اور کسی کو اس کی چنداں پرواہ بھی نہیں......

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا[۳۹۱]

اقبال لڑکیوں کی انگریزی تعلیم اور بے پردگی کے خلاف ہیں اور اس پر تنقید کرتے ہوئے اسے کسی ڈرامے سے کم تصور نہیں کرتے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے سیکھ لی فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدنظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ[۳۹۲]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے پردہ کی تعلیم کی داد دیتی ہیں کہ اقبال کی اس خواہش کی قائل پرانی نسل تو ہوسکتی ہے جس میں اس کے اپنے آباواجداد بھی شامل ہیں لیکن نئی نسل سے توقعات رکھنا محال ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے خاندان کا تذکرہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں کرتی ہیں:

اس وقت میر احمد علی اور شریف النساء بیگم اور سید جلال دین حیدر اور سعیدہ بانو بیگم نے قبروں میں کروٹیں لی ہوں گی۔ اسی وجہ سے پردے کا حکم آیا ہے اور اکبرالہ آبادی اور اقبال نے شاید اس منظر کو پہلے سے دیکھ لیا ہوگا۔ یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟ میری صراحی سے قطرہ قطرہ۔[۳۹۳]

قرۃ العین حیدر خواتین کی انگریزی تعلیم اور بے پردگی پر کڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں کہ لڑکیاں رقص و سرود کی تعلیم حاصل کر کے ملت اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ نکال رہی ہیں جسے وہ سخت ناپسند کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی وضاحت کرتے ہوئے ''یہ ڈرامہ دکھائے

گا کیا سین' ' کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا ثبوت واضح الفاظ میں پیش کر رہی ہیں:

ملت اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ......گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا۔ مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا...... بنات اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم ۔ اسکول کو بند کرو۔[۳۹۴]

تصورِ عورت

اردو ادب میں عورت ہمیشہ بڑا اہم موضوع رہی ہے۔ شاعری، داستان، ناول اور افسانہ ہر جگہ عورت کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کو مختلف ادوار میں مختلف زاویہ ہائے نظر رکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ اسے داستانوی دور میں شہزادی، دیوی، کنیز یا منفی کرداروں کے روپ میں انتہا پسندانہ انداز میں پیش کیا جاتا رہا۔ عورت کے کردار کے دو ہی پہلوؤں کی پیشکش پر داستان استوار رہی یعنی اسے وفا کی دیوی یا پھر مکار و عیار جادوگرنی کے روپ میں پیش کیا گیا۔

قرۃ العین حیدر نے عورت کے کردار کے تمام پہلوؤں کو اپنے فن کے وسیلے سے گرفت میں لانے کی کاوش کی ہے۔ انھوں نے عورت کو ہر رنگ، ہر روپ میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی میں عورت کو اپنے فن کا مرکز و محور بنایا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں عورت میں فطرتاً محبت، ایثار و قربانی کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ عورت کی وفا، ایثار، گم گشتگی اور قربانی کی داستان ہر کہانی میں نظر آتی ہے۔ عورت اسی قربانی اور وفا کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ مرد اسے اپنے لیے شرابِ تعیش کچھ دیر خمار اور نشہ اور کچھ وقت کے لیے معمول کے مطابق زندگی تصور کرتے ہیں۔ انسانی معاشرہ اپنی تمام تر ترقی اور جنسی مساوات کے باوجود عورت کی ذات کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ مردوں کے حصول مقاصد کا وسیلہ بناتا ہے۔ قرۃ العین حیدر عورت کو مقدر محرومی کی بنا پر جسم فروشی کرتے دکھاتی ہے مگر یہ عورت زمانے کی ستم ظریفی کے باوجود بھی اپنے اندر کی عورت کو اپنی خالص صورت میں برقرار رکھنے سے قاصر ہے۔ عندلیب نامی طوائفہ اس پیشے کو بالکل پسند نہیں کرتی اور اپنے والدین کے اس پیشے کو اختیار کرنے سے انکار کرتے ہوئے واویلا مچاتی ہے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

میں نے دسترخواں پر سے اٹھتے ہوئے اعلان کیا کہ آپ سب کان کھول کر سن لیجیے۔ نہ میں آپ کا دین قبول کرتی ہوں، نہ آپ کا خدا، نہ آپ کا پیشہ......اور نہ میں آپ لوگوں کا پیشہ اختیار کروں گی......میں اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ چکرا کر گر پڑی۔ ممانے مجھے زور کر تھپڑ مار لگایا تھا۔ پھر لاتوں گھونسوں کی بارش۔ فلو، مہرو اور شموخالہ مما کو نہ روکتیں تو شاید اس روز کی مار سے جانبر نہ ہو پاتی۔[۳۹۵]

قرۃ العین حیدر سے قبل کئی ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں عورت کے کردار کو طوائف کے روپ میں پیش کیا۔ کسی ادیب نے عورت کے اسی طبقہ کی منظر کشی میں اسے جسم کی مزدوری اور کسی نے اسے لعنت قرار دیا۔ اس سلسلہ میں مرزا ہادی رسواء نے امراؤجان ادا ناول میں ''امراؤ جان ادا'' کو ایسی طوائف کے روپ میں پیش کیا جو شرم و حیا کے ہزار ہا پردوں میں مستور اپنے گرد و پیش کی معاشرت کے اچھے اور برے تمام پہلوؤں کی جزئیات کی عکاسی کرتی ہے۔ جس بنا پر اسے طوائف بننا پڑتا ہے۔ رسواء کی تمام تر ہمدردیاں ''امراؤ جان ادا'' جیسی طوائفوں کے ساتھ ہیں جو اتفاق اور مقدر کے جال میں پھنس کر اس جہنم میں داخل کی جاتی ہیں جو ''بدکاری'' کو برا تصور کرتے ہوئے اس پیشے کو ذلیل سمجھتی ہیں۔

علامہ اقبال سے قبل بدقسمتی سے کسی فنکار نے عورت کو عورت کے مقام پر رکھ کر اس کے دکھ، درد کی دوا سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ اسے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور تصور کرتے ہوئے محض رونقِ محفل ہی سمجھتے رہے۔ اقبال پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عورت کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہوئے اس کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا اور اس کے اضطراب کو ایک شاعر کی حیثیت سے محسوس کیا۔ انھوں نے انتہائی دردمندی کا ثبوت دیتے ہوئے عورت کے پیچیدہ مسائل پر غور و خوص کرتے ہوئے بحیثیت فلسفی، شاعر مسائل زن کا ہمہ پہلو تجزیہ کیا۔ اقبال کو شاعرانِ ہند و ہنر وارانِ ہند سے یہ گلہ رہا کہ انھوں نے مظلومیِ نسواں پر قلم اٹھانے کی بجائے ان کے عشوہ و ناز و ادا پر ہی مرتے رہے اور عورت کے نام کا غلط استعمال کر کے ادب کی بلندی، مقصدیت اور پاکیزگی کو نقصان، پہنچاتے رہے۔ لہٰذا علامہ اقبال اس انداز فکر کے خلاف یوں آواز اٹھاتے ہیں۔

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار [۳۹۶]

قرۃ العین حیدر نے عورت کی عظمت اور اعلیٰ کارکردگی کے متعلق علامہ اقبال کے انھی افکار سے متاثر ہو کر سوچ و بچار شروع کی اور اسے عورت کے جسمانی حسن سے زیادہ اس کے ذہنی حسن پہ ناز ہوا اور اس بات کا اظہارِ افسوس علامہ اقبال کے افکار کی رو سے کیا ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالمی سطح پر بھی عورتیں مرد مصنفین کے اعصاب پر سوار ہیں اور عورت کا قطعاً کوئی احترام نہیں کیا جاتا اور نہ ہی خواتین ادیب کی نگارشات کو اہمیت دی جاتی ہے حالانکہ عورتوں نے اپنی ذہانت

بروئے کار لاکر مرد مصنفین کے شانہ بشانہ ادبی دُنیا کی صف میں شامل ہو کر کتب تحریر کی ہیں اگرچہ مردوں کی نسبت خواتین مصنفین کی کتب کی تعداد کم ہے مگر پھر بھی خواتین کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ جس کا اظہار قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ان الفاظ کے ساتھ کرتی ہیں۔

برٹش میوزیم لائبریری میں لاکھوں کتابیں موجود ہیں اور تقریباً سب مردوں کی لکھی ہوئی۔ دنیا بھر میں عورتوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی تعداد اتنی قلیل کیوں ہے؟ سارے عالمی ادب میں شروع سے آخر تک عورتیں، مرد مصنفین کے اعصاب پر سوار ملتی ہیں لیکن شاعری اور فکشن میں عورتوں کو محض مرد شعرا اور ادبا کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔[۳۹۷]

اقبال خواتین کے اس طرز حیات کو پسند کرتے ہیں جو اسلام میں رائج ہے۔ وہ خواتین کو شرم وحیا، احساس عفت و عظمت اور شرعی پردے میں مروجہ برقعہ کے نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کی تمام تر سرگرمیوں میں شریک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت میدان کارزار کی چیز نہیں البتہ میدان وفا کو عورت کی خدمات کی ضرورت آن پڑے تو وہ اس سے روگردانی نہ کرے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے ۱۹۱۲ء میں اپنی دل ہلا دینے والی نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' عرب لڑکی جو جنگ طرابلس میں غازیوں اور مجاہدوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی اس کا کردار عورتوں کے لیے باعث درس پیش کیا ہے۔

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیان دین کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں[۳۹۸]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال سے متاثر ہو کر اسی جنگ طرابلس میں خواتین کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اور اس جنگ کے موقع پر اسلامیانِ ہند نے سوز و ساز کی بنا پر طرابلس کے زخمیوں کے لیے چندے جمع کیے تو علامہ اقبال نے اس سلسلے میں اپنی ایک نظم ''حضور رسالت مآب میں'' بادشاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کے مجمع کے روبرو پڑھی۔ اس موقع پر قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد اور دیگر جدید ذہن رکھنے والی خواتین جن میں بمبئی کے طیب جی خاندان کی بچیاں بھی

شامل تھیں انھوں نے چندہ جمع کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔قرۃ العین حیدر کے نزدیک ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کی مانندان کی والدہ محترمہ اور دیگر نوجوان بچیوں کا کردار قابل تقلید ہے۔وہ اقبال کی مانند ایسی خواتین کے کردار کو پسند کرتے ہوئے ان کی کارکردگی نمایاں کرنا چاہتی ہے جو شرم وحیا کی پتلیاں ہوں اور انھیں احساس عفت وعصمت ہو اور وہ شرعی پردے میں رہ کر باحیا طریقے سے اسلام کی خدمات سرانجام دیں۔

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا۔اسلامیان ہند جن کا سوز وساز اسلامیان مشرق اوسط وشمالی افریقہ کے سوز وساز سے از حد وابستہ تھا۔حسب معمول غم وغصہ سے بے تاب ہوئے۔طرابلس کے زخمیوں کے لیے چندے جمع کیے گئے۔اقبال نے شاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کے مجمع کے سامنے

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

والی نظم پڑھی۔تہلکہ مچ گیا۔سامعین خون کے آنسو روئے۔اس نظم کا ایک ایک شعر اسی وقت ''نیلام'' کر کے روپیہ طرابلس فنڈ میں بھیجا گیا۔سال بھر بعد جنگ بلقان چھڑ گئی۔بنت نذرالباقر اور دوسری جدید خواتین نے طرابلس اور بلقان کے لیے خوب خوب چندے جمع کیے۔مرہم پٹی کا سامان اکٹھا کر کے ترکی بھیجا۔بہت جوش وخروش اور ہنگامہ رہا۔ان جدید خواتین میں بمبئی کے طیب جی خاندان کی لڑکیاں زیادہ خوش قسمت تھیں کہ بے پردہ گھومتی تھیں اور آئے دن انگلستان جاتی رہتی تھیں۔[۳۹۹]

علامہ اقبال عورت کا بے حد مقام متعین کرتے ہوئے دنیا کی تمام تر سرگرمیوں کا اصل منبع ماں کی ذات قرار دیتے ہیں۔ان کی نظر میں عورت کی عظمت کا راز اس کے فرض امومت میں پوشیدہ ہے۔سماجی اور معاشرتی زندگی میں ماں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ماں کی گود پہلا دبستاں ہے جو انسان کو اخلاق اور شرافت کا درس دیتا ہے۔وہ جس طرح گھر سے باہر کی زندگی میں مرد کو فوقیت دیتے ہیں اسی طرح گھریلو معاملات میں عورت اور خصوصاً ماں کو اہمیت دیتے ہیں۔ماں جس قدر مہذب، شائستہ اور اعلیٰ خیالات کی مالک ہوگی۔اس کی اولاد پر اتنے ہی اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔جس سے ایک اچھی اور قابل فخر نسل تربیت پائے گی۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آداب فرزندی[۴۰۰]

اقبال نے عورت کی عظمت اور اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے حدیث شریف کا حوالہ دیا ہے

کہ جنت تو اسی وقت ماں کے قدموں تلے ہو سکتی ہے۔ جب عورت ماں بنے گی۔

گفت آں مقصود حرف کن فکاں
زیر پائے امہات آمد جناں[۴۰۱]

اقبال نے اپنی ماں کی عظمت کے اظہار کے لیے ایک نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' تحریر کی۔ وہ ماں کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ماں کے فیض نظر کے بدولت ہی اس کے ہاں صلاحیتوں اور کارناموں کا منبع ہے لہٰذا آداب و اخلاق تعلیم گاہوں سے نہیں ماؤں کی گود سے حاصل ہوتے ہیں۔

مرا داد ایں خرد پرور جنونے
نگاہِ مادرِ پاک اندرونے
ز مکتب چشم و دل نتواں گرفتن
کہ مکتب نیست جز سحر و فسونے[۴۰۲]

قرۃ العین حیدر کے ہاں بھی عورت ماں کے روپ میں بڑی شفیق اور جذبۂ امومت سے لبریز نظر آتی ہے۔ وہ بھی اقبال کی مانند ماں کی ذات کو دنیا کی تمام سرگرمیوں کا اصل منبع قرار دیتی ہے کہ ماں ہی کی بدولت نئی نسل پروان چڑھتی ہے۔ جس قدر ماں مشفق ہوگی اس قدر اولاد اعلیٰ اخلاقیات کی مرتکب ہوگی۔ وہ ماں کی گود کو پہلا دبستاں تصور کرتے ہوئے معاشرتی اور سماجی زندگی میں مرکزی اہمیت دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد ایک پڑھی لکھی خاتون، ایک اچھی ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ وہ فیشن کو بے حد پسند کرتی تھیں۔ گھر میں ایک وقت کا کھانا نہ خود پکاتی تھیں اور نہ ہی بیٹی کو پکانا سکھایا۔ لہٰذا باورچی خانہ میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تاکہ دھوئیں سے آنکھیں خراب نہ ہو جائیں۔ البتہ انھوں نے ایک سکول بھی قائم کیا ہوا تھا۔ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں آگاہ کرنا چاہتی ہیں کہ ماں کی تربیت کا اثر اولاد پر ہوتا ہے جس کی بنا پر اولاد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کامیاب زندگی بسر کرتی ہے۔ شاید قرۃ العین حیدر اپنی والدہ کی جانب سے اچھی تربیت نہ کرنے کا ارماں دل میں سجائے بیٹھی ہے جس بنا پر اس کی آج تک شادی نہ ہو سکی۔ چنانچہ وہ اپنی والدہ کے متعلق ان الفاظ کا اظہار کرتی ہیں:

ابا جان جتنے کفایت شعار تھے، اماں اتنی ہی شاہ خرچ واقع ہوئی تھیں۔ دعوتیں، پارٹیاں کرنا، پہاڑوں پر سیزن گزارنا، عزیزوں، دوستوں، اور ان کی اولادوں کی شادیوں پر بھاری جوڑے مع

ایک عدد جڑاؤ زیور تحفے میں دینا وغیرہ ان کے محبوب مشاغل تھے۔لڑکپن سے فیشن لیڈر رہیں تھیں۔وضع جدید کا غرارہ اختراع کر کے رائج کیا......ساری زندگی ایک وقت کا کھانا خود نہیں پکایا تھا۔ مجھے بھی باورچی خانے میں جانے کی ممانعت کہ دھوئیں سے آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ میری ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ بیرے کی نگرانی میں ڈنرز کے مواقع پر کلف دار نیپکنز کے مختلف نمونے بنا کر گلاسوں میں اڑسوں اور کاغذ کے بونگے سے پڈنگ پر آئینگ کروں۔ اماں البتہ بہترین ہاؤس وائف اور مکمل ہوسٹس تھیں۔گھر کا سارا سامان خود بڑے شوق سے بنوایا اور خریدا تھا۔[۴۰۳]

علامہ اقبال ملت اسلامیہ کی ماؤں کے لیے حضرت فاطمہ الزہرہؓ کو مثالی خاتون تصور کرتے ہیں اور ماں، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے آپؓ کا اسوہ کامل تمام عورتوں کے لیے بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔آپؓ کیسے مشقت کر کے چکی پیستے ہوئے قرآن مجید کی آیات پڑھتی رہتی تھیں۔ گھریلو کام صبر و رضا اور صدق و اخلاص کے ساتھ کرتی تھیں۔اقبال حضرت فاطمہؓ کی عظمت کی دلیل دیتے ہیں کہ ان کے بطن سے امام حسینؑ جیسی عظیم شخصیات نے جنم لیا۔

مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
آں ادب پروردہ صبر و رضا
آسیاں گرداں و لب قرآں را
بتولےؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرےؑ بگیری[۴۰۴]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک حضرت فاطمہؓ اہم ترین شخصیت ہیں۔وہ انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو رکھتی ہیں جس طرح انھوں نے رضائے الٰہی کی خاطر عبادت کر کے مرد مومن کی حیثیت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ سے مرادیں مانگ مانگ کر کامیابی حاصل کی۔وہ بھی دوسروں کو یہی نصیحت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ جن خواتین کو اپنی مرضی کے مطابق شادی کروانا مقصود ہو وہ حضرت فاطمہؓ کی تسبیح پڑھ کر سویا کریں۔اللہ تعالیٰ تمام مرادیں برلائیں گے۔

قرۃ العین حیدر آپا زبیدہ کے متعلق بتاتی ہیں کہ وہ ڈاکٹر محمود خان سے شادی کرنے کی خواہش رکھتی ہے مگر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اس کی بھتیجی میں دلچسپی لیتے ہیں تو وہ عبادت کا سہارا لیتی ہے اور حضرت فاطمہؓ کی تسبیح کا عمل کرتی ہیں۔

تب سے زبیدہ آپا نماز پنجگانہ کے علاوہ چاشت، اشراق اور تہجد بھی پڑھنے لگی ہیں اور یہاں وہ غفور بیگم سے پنج سورۂ شریف، دعائے گنج العرش اور درود تاج کے کتابچے مستعار لے کر پڑھا

کرتی تھیں کیونکہ یہ کتابچے سفر پر چلتے وقت وہ گھر بھول آئی تھیں غفور بیگم نے ان سے کہا تھا کہ بیٹا روز رات کو سوتے وقت تسبیح فاطمہؓ پڑھا کیجئے......اس کی کیا وجہ ہے؟ بہت ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ شیعہ اسلام میں فاطمہؓ بنت رسولؐ خاص اہمیت کی مالک ہیں۔[۴۰۵]

علامہ اقبال عورت کی عظمت کے قائل ہیں کہ اس کائنات میں جو حسن و رعنائی ہے۔ وہ عورت کے وجود ہی سے ہے اور اسی کے دم سے زندگی رواں دواں ہے۔ ان کے نزدیک عورت کی پاکیزگی ستاروں سے زیادہ ہے اور اس کی عظمت کا ہر کوئی قائل بھی ہے۔ اگرچہ عورت علم و ادب کی کوئی خاطر خواہ خدمت نہ کر سکی مگر اس کی مامتا ہی اس قدر قابل ہے جس کے طفیل مشاہیر عالم جوان ہوئے اور کوئی شخص بھی عورت کی اس عظمت کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں اقبال نے ''عورت'' کے عنوان سے ایک نظم تحریر کر کے اس کے جمالی اور حیاتی پہلو کی طرف خاص اشارہ کیا ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں[۴۰۶]

قرۃ العین حیدر نے عورت کے متعلق علامہ اقبال کے انھی نظریات کو بڑی خوبی سے وضاحت کرتے ہوئے عورت کی عظمت کا تذکرہ کیا ہے کہ عورت معاشرے کی تخلیق کار ہے جو اپنی اولاد کی احسن طریقہ سے تربیت کر کے معاشرے کا مفید شہری بناتی ہے اور زندگی و موت کی کشمکش میں اولاد کو جنم دیتے ہوئے تکالیف برداشت کرتی ہیں۔ غربت و افلاس کی زندگی بسر کرتے ہوئے شوہر کی بے وفائی کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی سوکن کا دکھ برداشت کرتی ہے مگر پھر بھی ہمت نہیں ہارتی۔ قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی مانند عورت کی عظمت کو سراہا ہے۔

جب یہ دلہن بنتی ہیں تو انھیں ہزار برس کی نیو کہا جاتا ہے۔ یہ موت کے منہ میں جا کر ایک نئی زندگی دنیا میں لاتی ہیں۔ یہ تکلیفیں اٹھاتی ہیں افلاس اور تنگدستی کا مقابلہ کرتی ہے۔ شوہر کی بے وفائی کا سامنا کرتی ہیں۔ سوت کا جلاپا سہتی ہے۔ نیک امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔[۴۰۷]

اقبال عورتوں کی صحیح تعلیم اور حقیقی آزادی اور ان کی ترقی کے خواہاں ہیں مگر آزادی نسواں کے مغربی تصور کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ وہ زندگی کو ترقی کی راہوں پہ دیکھنے کے لیے مرد و زن کے تعاون اور باہمی ربط کے قائل ہیں انھیں ایک دوسرے کے لیے معاون ثابت ہونا چاہیے نہ کہ ایک

دوسرے کا مد مقابل۔ اقبال آزادی نسواں کے فیصلے کو عورت پر چھوڑتے ہیں تا کہ وہ خود اس کا فیصلہ بہتر کر سکتی ہے کہ کس طرح اپنی فطری حدود میں رہ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی زندگی کو بہتر سنوارنے کا کام سرانجام دے سکتی ہے۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خواب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مرد خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادی نسواں کہ زمرد کا گلو بند[۴۰۸]

قرۃ العین حیدر دانشمند خواتین کا تذکرہ کرتی ہیں کہ وہ اپنی اس مختصر سی زندگی میں اپنے بہن بھائی، ماں باپ، شوہر اور اولاد کے ساتھ محبت و تعاون کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے، ان کی سلامتی کے لیے متفکر رہتی ہیں ایسی خواتین اپنے شوہر سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں اور اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے خوفزدہ رہتی ہیں۔ ایسی خواتین خداوند کریم سے ہر وقت ان کے لیے دعا گو رہتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے اس فیصلے کا حل عورت سے صحیح روپ میں کروا کر رابطہ اور ہم آہنگی کا صحیح ثبوت دیا ہے۔

عورتیں اتنی پرستار اتنی پجارنیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کمزور ہیں؟ اور سہارے کی حاجت مند ہیں؟ اس لیے کہ وہ اس مختصر سی زندگی میں بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں؟ باپ، بھائی، شوہر، اولاد، پوتے، نواسے، ان سب کے تحفظ اور ان کی سلامتی کے لیے فکر مند رہتی ہیں؟ شوہر یا محبوب کے پیار اور محبت کی ضمانت کسی ان دیکھی طاقت سے چاہتی ہیں؟ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے ہراساں رہتی ہیں؟ آخر عورتیں خدا کی اس قدر ضرورت مند کیوں ہیں؟[۴۰۹]

علامہ اقبال ''آزادی نسواں'' کی موجودہ تحریک سے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ یہ تحریک عورت کو جس شاہراہ پر لے جانا چاہتی ہے اس کی منزل تباہی ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال کی آسمانوں کی سیر فلک مریخ پر جدید ذہن کی خاتون سے ملاقات ہوتی ہے جو مغربی خیالات کی پروردہ ہے اور نبوت کی خواہاں ہے۔ اس کا نظریہ تعلیم خواتین کو مردوں کی غلامی سے نجات دلانا ہے۔ وہ جذبہ امومیت سے عاری کرنا چاہتی ہے اور سائنسی تعلیم کی طرف خواتین کو راغب کر کے مصنوعی نسل کشی

کروانا چاہتی ہے تاکہ آزادانہ زندگی بسر کر سکے۔ اقبال نے اسے دردناک عذاب میں دکھلایا ہے۔ اسی وجہ سے اقبال عورت کو شرم و حیا کی تعلیم دینے کے خواہاں ہیں۔ وہ عورت کو رونق محفل بننے سے گریز کرنے کا درس دیتے ہیں تاکہ عورت جسمانی رقص کی بجائے روحانیت سیکھنے کی طرف توجہ دے تاکہ درویشانہ صفات کی مالک بن سکے۔

چھوڑ یورپ کے لیے رقص و بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم الٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شہنشاہی [۱۴۰]

قرۃ العین حیدر مغربی تعلیم بالخصوص رقص و سرود کی تعلیم کو غیرت کا جنازہ تصور کرتی ہیں۔ اس کے نزدیک ایسی تعلیم کی ترغیب مذہب اسلام کے منافی ہے اور نہ ہی خدا اسے پسند کرتا ہے۔ ایسا فعل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کے روبرو جواب دینا ہوگا۔ لہٰذا وہ ایسی تعلیم کے سخت خلاف ہیں اور انھوں نے اس قسم کی تعلیمات کے خلاف اخبارات میں واویلا بھی مچایا تھا۔ وہ مسلمانوں کو ایسی تعلیمات دلانے پر خوفِ خدا کا احساس ان الفاظ میں دلاتی ہیں:

تم ہی فخر انبیا ہو۔ یا نبی سلام علیکا...... مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا...... بناتِ اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم...... ملت اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ...... گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا۔ اسکول کو بند کرو۔ [۱۴۱]

قرۃ العین حیدر مزید خواتین کی مغربی تعلیم کے متعلق اظہار افسوس کرتے ہوئے وضاحت کرتی ہیں کہ قیام پاکستان سے قبل ہندوستان میں جو خواتین پردہ کرتی تھیں جذبہ قومیت کے تحت مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے لیے تعلیمی اداروں میں فلمی گانے گاتی تھیں چنانچہ برا ماحول ہندوستان ہی میں رہ گیا وہاں جذبہ کی حد تک ملتِ اقبال کی خواتین میں ذوق جہاد نمایاں نظر آتا تھا مگر وہ فیشن ایبل کپڑوں کے متعلق محو گفتگو رہتی تھیں۔ قرۃ العین حیدر ایسی تعلیم کو ملت اسلامیہ کے لیے زہر قاتل تصور کرتی ہیں جس سے اسلامی تہذیب و تمدن پر برے اثرات مرتب ہوں۔ وہ اقبال کی قوم سے یہ توقعات نہیں رکھتی۔ وہ اقبال کی مانند اظہار افسوس ان الفاظ میں کرتی ہیں:

اکثریت ان لڑکیوں کی تھی جو انقلاب سے پہلے پردہ کرتی تھیں۔ لیکن اب جذبہ قومی کی شدت سے مجبور ہو کر مردوں کے ساتھ میدان عمل میں دوش بدوش کام کرنے کے سلسلے میں مخلوط کالجوں کے لیڈیز روم میں بیٹھ کر فلمی گانے گنگناتی تھیں۔ کامریڈز تقریباً ناپید تھیں۔ کیونکہ فضا اس کے

لیے ساز گار نہ تھی۔ اشتراکیت کی دھن اور اس کا ماحول افسوس کہ وطن مرحوم کی یونیورسٹیوں ہی میں رہ گیا۔ یہاں پر ملت اقبال اور ذوق جہاد زیادہ طاری تھا۔ یہ لڑکیاں اپنا زیادہ وقت غرارے سلوانے کپڑوں کے متعلق تبادلہ خیال میں گزارتی تھیں۔ چند ایک نے سوئمنگ سیکھنے کے ارادے سے ون پیس سوٹ بھی تیار کروالیے تھے۔[۴۱۲]

اقبال عورت کی بے پردگی کو ناپسند کرتے ہیں اور پردہ کی حمایت کرتے ہیں۔ شرعی پردہ عورت کی سرگرمی میں حائل نہیں بلکہ پردہ میں رہتے ہوئے عورت زندگی کی تمام تر سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں۔ پردہ بے حجابی اور نمود و نمائش سے پرہیز اور شرم و حیا کے مکمل احساسات کا نام ہے۔ اس قسم کے پردہ سے عورت کی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔ اقبال اظہار افسوس کرتے ہیں کہ آدمی کی شخصیت اور حقیقت ذات میں خودی ظاہر نہ ہوئی۔

بہت رنگ بدلے سپہر بریں نے
خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے
وہ خلوت نشین ہے، یہ جلوت نشین ہے
ابھی تک ہے پردے میں اولاد آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے[۴۱۳]

اسی موضوع پہ اقبال نے ایک نظم ''خلوت'' میں عورتوں کے پردہ کو زیر موضوع پیش کیا ہے کہ عورت جب پردے سے باہر آتی ہے تو بے حیائی، بے باکی، نمائش، زیب و زینت اور ذہنی پراگندگی کا شکار ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ عورت کو خلوت میں دیکھنے کے قائل ہیں کیونکہ عورت کے ذاتی جوہر خلوت میں نمایاں ہوتے ہیں نہ کہ جلوت میں۔

رسوا کیا اس دورہ جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگر، آئینہ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر ولیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر[۴۱۴]

قرۃ العین حیدر بھی عورتوں کے شرعی پردہ کی حامی ہیں جس میں رہ کر وہ تمام سرگرمیوں میں

حصہ لے سکتی ہیں جسے اسلام پسند کرتا ہے۔قرۃ العین حیدر اسی بنا پر شرعی پردہ کی وضاحت کرتے ہوئے حمایت کرتی ہیں جبکہ مغربی افراد اس پردہ کے زبردست خلاف ہیں اور طنزاً کہتے ہیں کہ آپ قرآن مجید کا یونہی حوالہ دیتے ہیں۔اصل میں یہ پردہ تو صرف ایران کے صدر ملا خمینی نے جاری کیا ہے۔قرۃ العین حیدر شرعی پردہ کے بارے میں ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں جس کے متعلق علامہ اقبال خواہاں تھے:

آپ کہتی ہیں کہ قرآن نے عورتوں کو یہ سب حقوق دیئے ہیں مگر ملا خمینی نے تو پردے کا حکم صادر کیا ہے۔آپ کہتی ہیں اس روایتی پردے کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ورنہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کھلے منہ حج کرنے کا حکم نہ ہوتا۔[۴۱۵]

قرۃ العین حیدر مزید شرعی پردے کی وضاحت ان الفاظ میں کرتی ہیں:

قرآن پاک میں یہی آیا ہے شرعی پردہ تو دراصل یہی ہے کہ عورت بس اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھے اور اپنی زینت مردوں سے چھپائے۔[۴۱۶]

علامہ اقبال نے خواتین کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ایک خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام''میں حق وراثت اور مرد وزن کی مساوات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔اس سلسلہ میں اقبال نے خواتین کے مسلۂ وراثت کو قرآن مجید کے احکام کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

شریعت اسلامیہ کی رو سے لڑکی اس سارے جہیز کی خود مالک ہے جو اسے والدین سے ملتا ہے۔اور مہر کی بھی، جسے اس کی مرضی کے مطابق موجل بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے اور غیر موجل بھی اور جس کی ادائیگی تک وہ خاوند کی ساری جائیداد مکفول رکھ سکتی ہے۔اس کے کفاف کی ذمہ داری بھی تاحین حیات خاوند ہی پر رہتی ہے اب اگر اس نقطہ نظر سے قانون وراثت کا جائزہ لیجئے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اسلام نے لڑکوں اور لڑکیوں کی معاشی حیثیت میں کوئی فرق نہیں رکھا۔[۴۱۷]

قرۃ العین حیدر نے جہاں دیگر میں مسلمان خواتین کے حق وارثت کو قرآن مجید کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے اپنے تبلیغی لیکچر میں مغربی خواتین کو آگاہ کیا ہے کہ مغربی خواتین کو حقوق وراثت اب میسر آئے ہیں جبکہ اسلام نے آج سے چودہ سو برس قبل ہی عورت کو یہ حقوق عطا کر دیئے تھے۔

اسلام میں حقوق نسواں اور اسلامی تاریخ میں عورتوں کے اہم رول وغیرہ کے متعلق بے حد وضاحتی اور تقریباً تبلیغی لیکچر کے بغیر آپ کہتی ہیں کہ قرآن نے عورتوں کو یہ سب حقوق دیئے ہیں......مغربی عورتوں کو شوہر سے علیحدہ اپنی جائیداد رکھنے کا حق اب جا کر ملا ہے۔قرآن نے یہ حق

چودہ سو برس قبل دیا تھا۔[۴۱۸]

نظریہ وطنیت وملت

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ آدمی جہاں پیدا ہوتا ہے، پرورش پاتا ہے، اس کے در و دیوار سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ وطن کی محبت جاذبِ نظر ہوتی ہے اور وطن کا کانٹا بھی گل وگلزار ہی محسوس ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کی ابتدائی نظموں میں وطن سے ان کی گہری محبت نمایاں ملتی ہے اور انھیں بھی دیگر شعرا کی مانند اپنے وطن سے گہری محبت تھی۔ جس کا واضح ثبوت ان کے اولین شعری مجموعہ بانگ درا کی پہلی نظم ''ہمالہ'' میں ملتا ہے جو وطن پرستی کے بلند پایہ جذبات سے بھرپور ہے۔

اے ہمالہ! اے فصیل کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تری پیشانی کو جھک کر آسماں[۴۱۹]

اقبال کے اس نظریہ وطنیت اور جغرافیائی قومیت کے جذبات کے متعلق عزیز احمد ان الفاظ میں رائے دیتے ہیں۔

جغرافیائی اور خالص ہندوستانی وطن پرستی کا تصور سب سے پہلے اردو شاعری میں پیش کیا۔ یہ خطاب جو شاعر نے ہمالہ سے کیا ہے۔ کوہ ہمالہ کی قدامت اور اس کی منظری دلکشی کو پس منظر بنا کر دراصل جغرافیائی پرستی اور وطن کی جغرافیائی محبت کے جذبہ کو نمایاں کرتا ہے۔ حب وطن ہی کے سبب سے اس کا رتبہ کوہ سینا سے بڑھ جاتا ہے۔

ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے[۴۲۰]

اقبال کے ہاں یہ تصور ''صدائے درد'' میں اور بھی تقویت اختیار کر جاتا ہے جس میں اپنے وطن کی آزادی اور اغیار کی غلامی حصولِ نجات کی خاطر اتحاد واخوت پر زور دیتے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کو وحدت میں دیکھنے کے خواہاں نظر آتے ہیں وہ باہمی تعصب اور اختلاف کو اجنبی حکمرانوں کے تسلط میں معاونت تصور کرتے ہیں جس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ و پیرائی نہیں
لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں[۴۲۱]

اقبال نے ''ترانہ ہندی'' میں وطن سے بے پناہ محبت اور خلوص کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا[۴۲۲]

علامہ اقبال نے ''تصویر درد'' میں ہندوستان کی بدقسمتی پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور مرثیہ کے انداز میں وطن کی کیفیت بیان کی ہے۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں[۴۲۳]

''ہندوستانی بچوں کا گیت'' میں بھی اقبال نے وطن پرستی کا عنصر ظاہر کیا ہے جس میں وطن کی محبت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت سنایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے[۴۲۴]

اقبال نے اپنی نظم ''نیا شوالہ'' میں وطن پرستی اور دوستی کے نقطہ کو عروج وانتہا تک پہنچا دیا ہے اور محبّ وطن شاعر ہونے کا اظہار ''خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے'' وطن دوستی کی بنا پر کیا۔ جس سے ان کی وطن کے ذرے ذرے سے محبت نمایاں نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بھی علامہ اقبال کے انھی افکار ونظریات سے متاثر ہو کر اپنا اولین ناول میرے بھی صنم خانے تحریر کیا۔ اس تصنیف کی تحریر کا مقصد ان کے ہاں فقط وطن سے گہری محبت کا اظہار ہے جسے انھوں نے ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے وقت برداشت نہ کیا اور اس کے اثرات براہ راست ان کی تحریروں میں نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کو بھی علامہ اقبال کی مانند وطن سے گہری محبت ہے اور اس کے ہاں وہی جلاوطنی کا یہ سفر ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وطن کی محبت کا اظہار انھوں نے واضح انداز میں اعتراف کرتے ہوئے کیا ہے:

ہندوستان کے بٹوارے نے ۴۷ء کے آخر میں ساڑھے انیس سال کی عمر مجھ سے میرے بھی صنم خانے لکھوایا جو میرا پہلا ناول تھا اور جسے آج بھی اردو کے چند اچھے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا،اس صدمہ کے زیر اثر لکھا۔ذہنی جلاوطنی نے مجھے بہت پریشان کیا۔[۴۲۵]

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کے بعد قرۃ العین حیدر اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ اپنے شکستہ جذبات لے کر ہندوستان سے نقل مکانی کر کے مغربی پاکستان کے دارالخلافہ کراچی میں مقیم ہوگئیں اور وطن کی یاد میں میرے بھی صنم خانے تحریر کرتی رہی اور وطن کو یاد کرتے ہوئے آنسو بہاتی رہی۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی مانند اسلامی تہذیب وتمدن کی قائل ہیں اور انگریزی تہذیب وتمدن سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے وطن ہندوستان کی روایات کو شدت سے پسند کرتی ہیں۔ وہ امریکی بننے کی بجائے ہندوستانی بننے پر فخر محسوس کرتی ہیں تاکہ اسلامی تعلیمات کے زیر اثر بہترین انسان بن سکے جس وجہ سے اس کی ہندوستان سے والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ایک ہندو لڑکی سیتا ہرن ایک مسلمان لڑکے جمیل سے شادی کر لیتی ہے مگر تہذیب و تمدن اور مذہب کی آڑ میں سیتا ہرن اپنے شوہر جمیل کے معیار پر پورا نہیں اترتی جس بنا پر وہ اسے طلاق بھجواتے ہوئے ایک خط تحریر کرتا ہے جس میں اپنے بچے کے لیے مذہبی رسومات کے لیے اپنے وطن ہندوستان کا ہی انتخاب کرتا ہے۔

راہل اچھی طرح ہے میں تم کو طلاق دے رہا ہوں تم اب آزاد ہو اور جس سے چاہو شادی کر سکتی ہو۔ راہل کو میں اگلے سال دلی جامعہ ملیہ بھیج رہا ہوں تاکہ اپنے ملک میں رہے اور ہندوستانی بنے۔ یہاں وہ ایک دم امریکن ہوگیا ہے۔ وہ دلی آجائے تو تم فرخندہ بجیا کے ہاں جا کر اس سے مل بھی سکتی ہو۔[۴۲۶]

قرۃ العین حیدر کو اپنے وطن سے اس قدر محبت اور لگاؤ ہے کہ وہ اخبارات میں بھی ہندوستان ٹائمز پسند کر کے ہندوستان سے والہانہ لگاؤ کا اظہار کرتی ہیں۔

بلقیس نے فرخندہ باجی اور دولہا بھائی کی مسہریوں کے پلنگ پوش اتارے، راکھ دانیاں صاف کیں۔ نیلے پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہندوستان ٹائمز کے انبار پر سے دھول جھاڑی۔[۴۲۷]

علامہ اقبال قیام یورپ کے دوران ہی آگاہ ہو چکے تھے کہ وطن کا مغربی سیاسی تصور، عالمِ انسانیت کی تذلیل وتباہی کا سبب ہے لہٰذا اسلام ایسے نظریہ وطنیت اور وطن پرستی کی نفی کرتا ہے۔ گو اقبال نے ابتدا میں ہندو مسلم اشتراک کی کاوششیں بھی کیں مگر یورپ سے واپسی پر انھیں یورپی

اقوام کی ریشہ دوانیوں کا علم ہو چکا تھا کہ کیسے کیسے وطن پرستی کی آڑ میں اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے افریقہ اور ایشیا کے ممالک کو غلام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ انھیں یہ بھی احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں ہندو اس لیے نظریہ وطنیت کی حمایت کر رہے ہیں کہ انھیں نام نہاد وطن پرستی کا فریب دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے شکنجے میں جکڑ لیں گے۔ اس سلسلہ میں کانگریس نے ایسے نیشنلسٹ قائدین کو استعمال کیا جو متحدہ قومیت کے نظریے کے حامی تھے۔ اقبال ایسے نظریہ وطنیت کو مسلمانوں کے مفاد میں مضر اور گمراہ کن تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے وطنیت کی ایسی شق پر تنقید کی جو امت مسلمہ کے لیے کسی بھی سطح پر خطرے کا سبب بن سکتی تھی۔ اقبال نے ملت اسلامیہ کی اسی امتیازی کیفیت سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے، ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری[۴۲۸]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کی پیش گوئیوں اور دور رس نتائج سے ملتِ اسلامیہ کو آگاہ کرتی ہیں کہ علامہ اقبال کو جس نظریہ وطنیت کے اثرات ہندوستان میں ہندوؤں کے زیر اثر پھیلتے ہوئے نظر آ رہے تھے انھوں نے واقعی ہندوستانی مسلمانوں کو نام نہاد وطن پرستی کا فریب دے کر اپنے شکنجے میں بری طرح جکڑ لیا ہے۔ حالانکہ اقبال نے مسلم نیشنلسٹ رہنماؤں کو آگاہ بھی کیا تھا مگر وہ پھر بھی متحدہ قومیت کے نظریے کے حامی رہے۔ قرۃ العین حیدر اسی نظریہ کے برے اثرات جو مسلمانوں کے لیے مضر اور گمراہ کن ثابت ہوئے جنھیں مسلمان اس وقت سمجھ نہ پائے تھے مگر آج ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں ذلت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ جس بنا پر قرۃ العین حیدر ہندوؤں کی ذہنیت اور مغربی نظریہ وطنیت سے نفرت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

چند روز بعد اس (کمال) نے کمر کس کر ملازمت کی تلاش شروع کی۔ اس کے پاس ان گنت ڈگریاں تھیں۔ ٹرینٹی کالج، کیمرج، امپریل کالج آف سائنس، لندن اور کئی سال اس نے انگلستان کی ایک مشہور لیبارٹری میں نوکری کی تھی۔ برطانیہ کی ملازمت چھوڑ کر وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے واپس آیا تھا یونیورسٹی میں جس جگہ کے لیے وہ کوشاں تھا وہ ایک معمولی ایم ایس سی کو دے دی گئی چونکہ وہ ہندو تھا۔ چھ مہینے گزر گئے، وہ دلی کے چکر لگا لگا کر دیوانہ ہو گیا۔ ''میاں کسی کی سفارش کروالو'' نواب صاحب نے کہا۔ ''سفارش تو میں قیامت تک نہیں کرواؤں گا۔ کیا مجھے

اپنی اہلیت پر بھروسہ نہیں جو سفارش کرواتا پھروں۔'' یہی تو تمہارے دماغ میں خناس ہے۔'' اب وہ سارا سارا دن گلفشاں میں چپ چاپ پڑا رہتا یا طلعت کو خط لکھتا۔ انڈیا ہرگز مت آنا جہاں تک ہوسکے وہیں رہے جاؤ۔ یہاں آؤ گی تو وہی حشر ہوگا جو میرا ہو رہا ہے۔[۴۲۹]

علامہ اقبال اسلامی تعلیمات اور عالمگیر انسانی برادری کے جذبے کی رو سے مسلمانوں کے لیے سارے جہاں کو وطن گردانتے ہیں اور مخصوص جغرافیائی حدود سے نکل کر عالمِ اخوتِ اسلامی کے تحت یہ نعرہ لگاتے ہیں:

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا[۴۳۰]

علامہ اقبال تمام دنیا کو اپنا وطن گردانتے ہوئے تاریخِ اسلام کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب قریش نے آنحضرتؐ کا مکہ میں رہنا ناممکن بنا دیا تو آپؐ نے ان سے کوئی مصالحت نہ کی بلکہ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے۔ اقبال نے اس مثال کو پیشِ نظر رکھ کر فرمایا ہے:

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے[۴۳۱]

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے افکار کی ترجمانی کرتی ہیں کہ مسلمانوں کا ہر ملک اس کا اپنا ملک ہے اور اس میں کوئی تفریق نہیں ہے مگر نہ جانے کیوں سرحد کے پار مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور نہیں کرتے اور بحیثیت مسلمان انھیں پاکستانی جو اسلام کے ماننے والے ہیں۔ اسلامی اخوت کا پرچار کیوں نہیں کرتے اور علامہ اقبال کے افکار پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ قرۃ العین حیدر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ہجرت کا کرب بیان کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ جب مسلمان کا ہر وطن اپنا وطن ہوتا ہے تو مہاجرین کو پاکستانی کیوں قبول نہیں کرتے؟

ان گنت انسان سرحد کے دونوں طرف دھکیلے جا رہے ہیں اور باہر کی دنیا میں اس قیامت خیز المیے پر دھیان دینے کی کسی کو فرصت نہیں۔ کسی کو احساس نہیں کہ ان ہزارہا بے خانماں بھوکے اسٹیٹ لیس انسانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ جن کو پاکستانی کی حیثیت سے آسام سے اس طرف روانہ کر دیا

جاتا ہے اور جب وہ یہاں آتے ہیں تو ان کو بھارتی کہہ کر پھر واپس دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس المناک صورت حال کے ذمہ دار وہ خود تو نہیں۔ ان کا کیا قصور ہے؟[۴۳۲]

علامہ اقبال قیام یورپ سے ۱۹۰۸ء میں واپس آئے تو انھیں اٹلی کے جزیرہ سسلی کے قریب سے گزرنا پڑا تو ان کے دل میں مسلمانوں کی عظمت نے جوش مارا اور مسلمانوں کی تہذیب حجازی کا عروج یاد آیا تو انھیں بے ساختہ اپنا وطن ہندوستان یاد آیا۔ یہیں سے اقبال کے افکار وطنیت کے متعلق جغرافیائی حدود عبور کرتے ہوئے عالم اسلام کی طرف مائل ہوئے اور عالم اسلام کو اپنا وطن تصور کرنے لگے۔ اقبال نے اپنے ہم وطنوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک نظم ''صقلیہ'' (جزیرہ سسلی) تحریر کی۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدہ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا[۴۳۳]

علامہ اقبال کے اسی ''تحفہ'' کو قرۃ العین حیدر نے قبول کیا اور وہ بھی علامہ اقبال کی طرح خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ جب انھیں اپنے والد محترم کی جانب سے مزید علامہ اقبال کے تہذیبِ حجازی کا مزار نظر آتا ہے۔ قرۃ العین حیدر جب تہذیب حجازی کے متعلق اپنے والد یلدرم کا تحریر کردہ خط پڑھتی ہیں تو وہ بھی علامہ اقبال کی مانند ملتِ اسلامیہ کے فکر و غم میں گھلنے لگتی ہیں۔

پورٹ سعید سے خط لکھ چکا ہوں۔ وہاں ہم لوگ دو گھنٹے کے لیے اترے تھے۔ چار دن بعد ۳۰ رمئی کو جزیرہ سسلی پہنچے اس جزیرہ کو دیکھ کر اقبال نے کہا تھا۔ ''وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار'' اقبال P&O کمپنی کے جہاز سے گئے تھے۔[۴۳۴]

اب قرۃ العین حیدر نظریہ وطنیت اور ملت کے اظہار کے لیے علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی زبان بولنے لگتی ہیں اور علامہ اقبال کی زبان ہی میں اپنے افکار و نظریات بیان کرنے شروع کر دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کارِ جہاں دراز ہے جلد اوّل میں ایک باب بعنوان ''نہ صفاہاں نہ سمرقند'' میں مسلمانوں کے کارنامے بتاتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ مسلمانوں نے اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ فنون عملی کو بھی فروغ دیا اور ایک جگہ پہ نہیں ٹھہرے بلکہ تمام دنیا کو اپنا گھر تصور کیا کبھی تاجکستان، افغانستان، ایران، عراق، مصر اور کبھی ہندوستان حتیٰ کہ انگلستان کے طلبہ و

اساتذہ بھی انھیں کے دم سے فنون عملی اور علوم سے مستفیض ہوئے۔ یہی قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے نظریہ ملت کی روشنی میں بیان کیا۔

ترکوں نے چینی تسلط سے نجات کے لیے سمرقند میں تعینات عرب افواج سے مدد کی درخواست کی۔ ۷۵۱ء میں چینیوں پر عرب فتح کے بعد عربوں نے چینی جنگی قیدیوں سے سمرقند میں فن کاغذسازی سیکھا۔ اور سنو میرے خان۔ اس معمولی غیر مصروف واقعے سے کیا نتیجہ نکلا۔ عربوں نے ساری دنیا میں کاغذ پھیلا دیئے اور سارے عالم میں بڑے بڑے دارالعلوم اور کتب خانے قائم کر ڈالے۔ سمرقند، بخارا، خیوا، خوارزم، ترمذ، نیشاپور، اصفہان، بغداد، دمشق، قاہرہ، دلی، ملتان، قرطبہ غرناطہ اور صیقلہ کی درسگاہوں میں پڑھ کر جب مغربی یورپ اور انگلستان کے طلباء اور اساتذہ واپس جاتے۔ جبھی فارغ التحصیل سمجھے جاتے۔[۴۳۵]

علامہ اقبال کے دور حیات ہی میں انگریزوں نے ترکوں کے مقابلے میں عربوں میں قومیت کی روح بیدار کی جس کے خطرناک نتائج پر علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کو اپنی طویل نظم ''خضر راہ'' میں متنبہ کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک مغربی تصور وطنیت اور قومیت، ملت اسلامیہ کے خلاف ایک سازش ہے، لہٰذا اقبال اسے ملت اسلامیہ کی تباہی و بربادی تصور کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اسی نظریہ کے حوالے سے ترکوں کے خلاف عربوں اور ایرانیوں کو اکسایا۔ جس کے نتیجہ سے ترکوں کو نہ صرف شکست کا سامنا کرنا پڑا بلکہ عربوں اور ایرانیوں کو بھی انگریزوں کی حاکمیت تسلیم کرنی پڑی۔ اسی نظریہ نے ماضی میں ملتِ اسلامیہ کا ستیاناس کیا۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبور نیاز
حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز[۴۳۶]

قرۃ العین حیدر نے بھی ملتِ اسلامیہ کی بیداری کے لیے علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے اشعار کی روشنی میں ملت کو جگانے کی کاوش کی ہے اور بتلایا ہے کہ کیسے کیسے تثلیث کے فرزندوں نے ملت اسلامیہ کی میراث پر قابض ہو کر انھیں نیست و نابود کیا ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلم ممالک پر کیسے قبضہ کیا۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر بھی علامہ

اقبال کی زبان میں اظہار کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ مجھے بھی تمام مسلم تاریخ کا علم ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند۔محمد فاتح اور سلیمانِ اعظم کی سلطنت یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے نقشوں سے معدوم ہوئی۔قاہرہ، جدہ، بغداد، دمشق، یروشلم یونین جیک اپ، ہلال احمر ڈاؤن، فلسطین پر یورپین صیہونیوں کی یلغار۔اے فلسطینی جواں، تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں، فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے۔اب جا۔کیا سناتا ہے مجھے ترک وعرب کی داستان۔[۴۳۷]

علامہ اقبال یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ آج بھی مغربی اقوام کی یہی کاوش ہے کہ اسلامی ممالک میں مغربی تصورِ قومیت و وطنیت کو عام کیا جائے اور اس سے پیدا شدہ عصبیت کے سبب ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیر دیا جائے اور ان میں نفاق پیدا کر کے انھیں کمزور کر کے اپنا دست نگر بنایا جائے۔اسی حکمت عملی کو بروئے کار لا کر اقوام مغرب نے مسلم حکمرانوں کو ہندوستان اور دیگر مسلم ممالک کے خلاف استعمال کیا ہے اور وہ نظریاتی بے راہ روی اور تصور وطنیت وقومیت کا پرچار کر کے ملت اسلامیہ کے اتحاد و یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔علامہ اقبال امتِ مسلمہ کو ان کی چالوں اور حربوں سے آگاہ کرتے ہوئے ہوشیار رہنے اور باہمی محبت واتحاد اور اعتماد کو مستحکم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر[۴۳۸]

علامہ اقبال ملت اسلامیہ کو رنگ ونسل، نام ونسب کے تفاوت کے شکنجہ سے آزاد ہو کر ملت اسلامیہ سے وابستہ ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔وہ مسلمانوں کے جاہ وجلال اور شان وشوکت کا راز اسی حقیقت پر عمل پیرا ہونے میں پنہاں تصور کرتے ہیں۔

بتان رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی، نہ تورانی، نہ افغانی[۴۳۹]

اسی طرح علامہ اقبال مزید کہتے ہیں۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل، اچھل کر بے کراں ہو جا[۴۴۰]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی مانند انگریزوں کی چالوں اور حیلوں سے آشنا ہو چکی ہیں اور وہ ملت اسلامیہ کو علامہ اقبال کی زبان میں ہی اخوت کا درس دینا چاہتی ہیں کہ ملتِ اسلامیہ میں اتحاد پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے تا کہ یورپی اقوام ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ نہ بکھیر سکیں اور اب ان کو ایک مرکز پر لانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے قائم کردہ معاشرہ میں ضم ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں وہ ملت اسلامیہ کو نظریہ وطنیت وملت سے آگاہ کرتے ہوئے اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ لیکن انھیں کوئی ایسا ہیرو نظر نہیں آتا جو اس کام کو نپٹا سکے البتہ شریف حسین جیسے غدار ضرور مل جاتے ہیں، جس بنا پر انھیں علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں۔ البتہ شریف حسین، جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی بھی مخبری کرتا ہے۔[۴۴۱]

علامہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کو گونا گوں طریقوں سے سمجھانے کی کاوش کی ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی اساس ایمان وعقیدہ اور رسالت محمدیؐ کی ابدیت اور آفاقیت پر منحصر ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی قوت کا منبع ان کا مذہب سے لگاؤ اور ملّی اتحاد پر منحصر ہے لہٰذا مذہبِ اسلام زماں ومکاں کا مقید نہیں۔ وہ ہر مقام اور ہر زمانہ کے لیے ہے۔ چنانچہ ملتِ اسلامیہ اپنے ایمان وعقیدہ اور اپنے نظام حیات کے سبب زماں ومکاں کے حدود وقیود سے آزاد ہے۔ اس کا اظہار اقبال نے اسرار خودی میں تفصیلاً کیا ہے اور دیگر تصانیف میں اپنے بلیغ اور موثر فنکارانہ اور حکیمانہ انداز میں ملت کو اس کی خودی سے روشناس کرایا ہے۔ اقبال نے اپنے پیام کو آفاقیت اور عالمگیری سطح تک پھیلایا ہے۔

خرد ہوئی ہے زماں و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں، نہ مکاں لا الہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ[۴۴۲]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کی طرح ملّت اسلامیہ کو ایمان وعقیدہ اور اسلامی نظام حیات کے سبب زماں ومکاں کی قیود سے آزاد دیکھنے کی خواہاں نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کی اساس ایمان وعقیدہ اور رسالت محمدیؐ کی ابدیت اور آفاقیت پر منحصر ہے۔ قرۃ العین

حیدر علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں ملتِ اسلامیہ کو درسِ حیات دیتی ہیں کہ مسلمان توحید اسلام کے پرچار کے لیے قید و حیات کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے دربدر گئے اور ہر ملک کو خدا کا ملک تصور کرتے ہوئے کلمہ توحید پھیلایا۔ اس سلسلہ میں انھیں جو تکالیف اٹھانا پڑیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کے خصائص و واقعات کا تفصیلاً ذکر علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں ان الفاظ کے ساتھ کرتی ہیں:

سوختہ ساماں ہندی کلمہ گو جوق در جوق دارالحرب سے ہجرت کر رہا ہے۔ غریب الوطنی مزید فاقہ کشی، بربادی، ناکامی، ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر نکلے اُدھر ڈوبے، بے شمار دیوبندی مولانا ذہن پرست انقلابی، جوشیلا قوم پرست، سر پہ کفن باندھ جیل میں گھس گیا۔ پھانسی چڑھا۔ کابل، تاشقند، ماسکو، برلن، امریکہ فرار ہوا، یہاں اور وہاں بھوکوں مرا۔ مجھے ہے حکم اذاں لَا اِلٰہ اِلا اللہ...... ہزار ہا غریب ہندی مسلمان خدا رسولؐ کا عاشق، فرنگی سے مقابلہ کرنے کوچہ و بازار کھیت کھلیان سے نکلا۔ گلے میں حمائل شریف، ہاتھ میں ستّو کی پوٹلی کہ جہاں میں نانِ جویں پر ہے مدارِ قوت حیدری مارا گیا۔ قید خانہ میں بند ہوا۔ کالے پانی بھیجا گیا۔ فراموش ہوا۔ آج گمنام ہے۔ نہ ہے زماں، نہ مکاں لا الہ الا اللہ۔[۴۴۳]

علامہ اقبال ملت اسلامیہ کو بتاتے ہیں کہ مردِ مسلماں کا کوئی وطن نہیں ہوتا، اس کا سارا جہاں وطن ہوتا ہے۔ کاہل، نکمے اور نرم و نازک لوگ مشرق و مغرب کی دنیا میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں جبکہ بہادر اور محنتی لوگ آسمان کی وسعتوں کو چھوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے شاہین کی مثال دیتے ہوئے سمجھایا ہے کہ وہ کبھی اپنا گھونسلہ نہیں بناتا جبکہ چکور مشرق و مغرب کا قیدی ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ پورب، یہ پچھّم، چکوروں کی دُنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ[۴۴۴]

قرۃ العین حیدر بعینہٖ علامہ اقبال کی مانند تصور ملت کا پرچار کرتے ہوئے آگاہ کرتی ہیں کہ مسلمانوں کا سارا جہاں وطن ہوتا ہے وہ جہاں چاہے رہ لیں اور توحید اسلام کی خاطر جگہ بہ جگہ اسلام کی اشاعت کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اکثر لوگ ہندوستان میں ہی مقیم رہے۔ حالانکہ قیام پاکستان کا اصل مقصد اسلامی ملک میں رہ کر اسلامی معاشرہ کے تحت زندگی بسر کرنا تھا مگر بعض افراد خوفزدہ تھے کہ کہیں ہندوستان والا گھر چھوڑ دیں اور پاکستان میں بھی

نہ ملے تو پھر نہ ادھر کے رہیں اور نہ ادھر کے۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے نظریہ ملتِ اسلامیہ کی رو سے وضاحت کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ مسلمان کا کوئی وطن نہیں، جیسے شاہین کا کوئی گھونسلہ نہیں ہوتا۔

مسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ سارا جہان وطن ہے...... ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ۔[۴۴۵]

علامہ اقبال اسلامی نظریہ ملت کے قائل ہیں اور وطن سے گہری محبت کا اظہار کرتے ہوئے ملت مسلمہ کی بہتری کے خواہاں ہیں۔ اسلامی نظریہ وطنیت رکھتے ہوئے غدارِ وطن کو خوفناک مجرم ثابت کرتے ہیں جسے کسی بھی حالت میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بنگال کے جعفر اور دکن کے صادق کو بدترین شخص قرار دیتے ہیں جنھوں نے اپنی ملت سے غداری کر کے دنیاوی جاہ وحشم کو وطن کے مفاد پر ترجیح دی۔ علامہ اقبال نے میر جعفر اور میر صادق جیسے غداروں کو ''ننگ آدم'' ننگ دیں، ننگ وطن قرار دے کر ان کی روحوں کو عذاب میں اس قدر مبتلا دکھایا ہے کہ انھیں دوزخ بھی قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ فلک زحل پر عالم تیرہ وتار میں فرشتے گُرز اور دُرے لے کر ان کی ارواح رذیلہ کو سزا دینے کے لیے منتظر کھڑے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جعفر وصادق کو غدار وطن کے طور پر جس سزا میں مبتلا دکھایا ہے اسے پڑھ کر انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک غدارِ وطن کو نہ دنیا میں کہیں سکھ نصیب ہوتا ہے اور نہ ہی موت کی آغوش میں راحت ملتی ہے۔

ملت را ہر کجا غارت گرے است
اصل او از صادقے یا جعفرے است
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الا از جعفران ایں زماں
جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن[۴۴۶]

قرۃ العین حیدر کو بھی علامہ اقبال کی مانند غدارِ وطن سے شدید چڑ ہے۔ علامہ اقبال نے تو غدارِ وطن کی ارواح کو دوزخ میں شدید عذاب میں مبتلا دکھایا ہے مگر قرۃ العین حیدر نے اسی بنگال کے جعفر کی آل واولاد کو دنیا ہی میں ملتِ اسلامیہ سے غداری کے جرم میں مبتلا دکھا کر ذلیل وخوار ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ جن کی حالت زار دیکھ کر الاماں الاماں پکارنا پڑتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے میر جعفر کے داماد میر قاسم کو جنھیں انگریزوں نے میر جعفر کے بعد بنگال کا نواب مقرر کیا، اسے

نہ صرف دنیاوی عذاب میں مبتلا دکھاتی ہیں بلکہ اس کی اولاد کو کرنل لارڈ کلائیو کے ایک افسر نے قتل کر کے موت کے گھاٹ اتار کر اس سے تخت چھین لیا۔ قرۃ العین حیدر میر قاسم کو دنیاوی عذاب میں مبتلا کچھ اس انداز میں دکھاتی ہیں:

اک ذرا ٹھہرنا۔ کون قاسم علی خان؟ بنگالے کا آخری خودمختار نواب، وہ سید زادہ جو اپنی شکست کے بعد دلی جا کر جلاوطنی کے اس عالم میں مرا کہ اس کی شال فروخت کر کے اس کی تجہیز و تکفین کی گئی۔...... میر قاسم علی خاں، بنگال کے ٹریجک ہیرو جن کے کم سِن لڑکے لڑکی گُل اور صنوبر قلعہ مونگھیر کے محاصرے میں جنگل میں چھپے بدقسمت باپ کے لیے شیر کی کھال اوڑھ کر کھانا لے جاتے ہوئے لارڈ کلائیو کے ایک افسر کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔ میر قاسم علی خاں کی اولاد شاید اب بھی بہار میں موجود تھی۔ میر جعفر علی خاں کی اولاد نوابین مرشد آباد......اور یہ جیلوں میں محبوس سیاسی قیدیوں کی دنیا سے ایک بالکل مختلف دنیا تھی اور اسی بنگال میں موجود تھی۔[۴۴۷]

مسئلہ تقدیر

قرۃ العین حیدر انسان کو مسئلہ تقدیر کی رو سے بعض امور میں مجبور محض اور بعض امور میں بااختیار تصور کرتی ہیں اور اقبال بھی ''حقیقت درمیان جبر و قدر راست'' کے قائل تھے۔ اس سلسلہ میں وہ اقبال کی مانند تصور جبر و قدر اسلامی تعلیمات کے عین مطابق معتقد ہیں۔ اس کے نزدیک انسان کا مقدر ہر دور میں ایک جیسا ہی رہا ہے فقط کردار بدلتے رہتے ہیں اور سٹیج وہی ہے۔

کٹھ پتلیاں ستلیوں سے آویزاں اسٹیج پر اتاری جاتی ہیں۔ تماشا گر ایک ستلی اوپر کھینچ لیتا ہے۔ دوسری کٹھ پتلی نیچے اتار دیتا ہے۔[۴۴۸]

قرۃ العین حیدر اقبال کی مانند انسان میں تقدیر کو بدلنے کی قوت کی خواہاں ہیں۔ اس کے نزدیک تقدیر پرستی کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں اور تقدیر پرستی کے مضر اثرات سے بھی خوفزدہ ہیں۔ جس کے برے اثرات عالم اسلام پر پڑے تھے۔ جس کا جائزہ وہ ان الفاظ میں لیتی ہیں:

وہ تقدیر پرستی اور روایت پسندی جو زوال بغداد کے بعد سے عالم اسلام کی خصوصیت اور مہلک ترین کمزوری بن چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترک جواب تک یورپ کے طاقتور ترین بحری بیڑے کے مالک تھے۔ بادبان پھڑپھڑایا کیے اور دخانی جہاز رانی ہرگز اختیار نہ کی اور اپنے پیش رو عربوں اور ہم عصر ہندوستانی مغلوں کی طرح فوجی اور تجارتی بحری راستوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔[۴۴۹]

اقبال انسان کی جدوجہد اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے اُکساتے ہیں۔ انھی

صلاحیتوں اور جدوجہد کی بنا پر انسان زمانے اور تقدیر کو اپنا مطیع و تابع بنا سکتا ہے۔اس سے وہ خود تقدیر الٰہی بن جاتا ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی[۴۵۰]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے اسی فلسفہ تقدیر کی روشنی میں وضاحت کی ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اسے امرا نے غربا کو چکر دینے کے لیے اختراع کیا ہے۔قرۃ العین حیدر اس سلسلہ میں جدوجہد کی قائل ہیں اگر انسان اپنی کاوشوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے تو اس کی تقدیر بدل جاتی ہے اگر وہ کاوش ہی نہ کرے تو اس کی تقدیر کیسے بدلے گی؟ لہٰذا وہ اقبال کی طرح ملتِ اسلامیہ کو تقدیر کے جنجال سے نکالنے کی کاوش کرتے ہوئے اپنا فلسفہ تقدیر یوں پیش کرتی ہیں:

لک کوئی چیز نہیں۔یہ اصطلاح بھی سرمایہ داروں کی جعل سازی ہے۔بات سنو لائف میں یا بیڈ لک ہے یا گڈ لک، تیسرا کچھ نہیں۔ہمارا ہز بنڈ عراق سے ادھر چلا آیا۔وہی دن دوسرے جہاز سے اس کا بھائی امریکہ چلا گیا۔اس کا فیملی ادھر عیش کرتا ہے۔میں نے پچاس برس اس کھولی میں نکال دیا۔ہمارا لک نہ بدلا۔ہمارا چھوکرا ٹیکسی ڈرائیور ہی رہا۔سر ڈیوڈ سیسُون کے موافق بومبے کا بڑا سیٹھ نہ بنا۔[۴۵۱]

رومانی پہلو

قرۃ العین حیدر کے فن کا آغاز رومانی فضا میں گم، جوانی کے دور میں خوابوں اور رفاقتوں کے ماحول میں ہوا۔رومانی رجحان ان کے ہاں خوابوں، یادوں، فطری حسن اور تاریخ کے حسین امتزاج میں ملتا ہے۔ان کے افسانوں میں عشقیہ فضا موجود ہے مگر یہ فضا مسلسل ہجر کے نغمے الاپتی ہے۔ان نغموں میں موت کے ساز اور چاندنی راتوں میں ہجر تمام افسانوں اور ناولوں میں پایا جاتا ہے۔

نیلے پتھروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی جنگلی نہر کے خاموش پانی پر تیرتے ہوئے، دیوداروں کے سائے بیتے دنوں کی یاد کے دھندلکے میں کھو کے مٹتے جا رہے ہیں۔بھیگی بھیگی سرد ہوائیں چیڑھ کے نوکیلے پتوں میں سرسراتی ہوئی نکل جاتی ہیں اور دیوداروں کے جھنڈ کے پرے اس اونچی سی پہاڑی پر بنی ہوئی سرخ عمارت کی کھڑکیوں کے شیشوں کے چاند کی کرنیں پڑی جھلملاتی رہتی ہیں لیکن کبھی بھول کر بھی We met in the valley of moon والا گیت گانے کو دل نہیں چاہتا۔[۴۵۲]

قرۃ العین حیدر کے فن کے آغاز کے متعلق پروفیسر فاروق عثمان ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

قرۃ العین حیدر کے فن کا آغاز تو رومانی فضا میں گم ''عنوان شباب'' کی رفاقتوں اور خوابوں کے ایک بڑے لطیف اور شاداب ماحول سے ہوا لیکن یہ بھی درست ہے کہ وہ خوابناک احساس کی اس دلکش دنیا میں ہی قید ہو کر نہیں رہ گئیں۔[۴۵۳]

شہزاد منظر نے قرۃ العین حیدر کی اوّلین تصنیف ستاروں سے آگے کو ان کے ابتدائی دور کی رومانی تصنیف قرار دیتے ہوئے ان کے ادبی کیریئر کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے اور پہلے دور کو رومانی دور قرار دیا ہے۔ جس کے متعلق وہ ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

پہلا دور ۱۹۴۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ اس دوران ان کے افسانوں کا مجموعہ ستاروں سے آگے شائع ہوا۔ اس دور کو ان کا ابتدائی دور اور بہت حد تک مبتدیانہ اور رومانی دور کہا جا سکتا ہے۔[۴۵۴]

علامہ اقبال نے بھی اپنے فن کا آغاز رومانی ماحول سے شروع کیا اور انھوں نے بھی اپنے دور میں دیگر معاصرین شعرا کی مانند رومانی شعر و ادب کی طرف توجہ دی کیونکہ وہ انگریزی شعر و ادب سے براہِ راست واقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے نیچرل شاعری کے اسلوب کو احسن طریقہ سے استعمال کیا ہے اور آیندہ شعرا کے لیے ایک نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اُسی دور میں قرۃ العین حیدر کے والد یلدرم بھی اردو میں رومانی رجحان کی نمایندگی کرنے والوں میں ایک اہم مقام رکھتے تھے جو رومانوی پہلو کی بنا پر علامہ اقبال اور انگریزی شعرا میں بھی گہری دلچسپی لیتے تھے۔ علامہ اقبال اور انگریزی شعرا کے یہی اثرات قرۃ العین حیدر کے ذہن پر نقشِ دوام کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہوئے اپنے والدِ محترم کے متعلق بیان کرتی ہیں:

چھٹیوں کی صبح کو، اپنی آرام کرسی پر نیم دراز اخبار پڑھتے ہوئے وہ اپنے پسندیدہ اشعار گنگناتے رہتے۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا، اور آج ہیں خاموش وہ دہشت جنون پر جہاں، رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے۔ اور اخبار پڑھتے پڑھتے اپنے کتب خانے کی کھڑکی میں سے وہ پکارتے: بیٹا یہاں آؤ اور مجھے یہ پڑھ کر سناؤ کہ اس مرتبہ ایلیٹ نے کیا لکھا ہے۔ ایک باپ بیٹی کی یہ کیسی دنیا تھی۔[۴۵۵]

قرۃ العین حیدر کے اسلوب نگارش پر روشنی ڈالتے ہوئے ابوالفیض سحر نے اسی بنا پر علامہ اقبال اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ کے اثرات ظاہر کر کے رومانی پہلو کی تائید کی ہے۔

بعض اہلِ نظر کی جانب سے قرۃ العین حیدر کی نگارشات میں ورجینا ولف کے فنی محاسن کا احساس اور تجربہ دونوں بجا مگر میرے خیال سے ان کے ہاں اقبال اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی فکر کی گہرائی،

بصیرت کی وسعت اور احساسات و جذبات کا عمق ملتا ہے۔[۴۵۶]

قرۃ العین حیدر نے ستاروں سے آگے میں جو افسانے تحریر کیے ہیں۔ وہ تمام اس کے ناپختہ دور میں تحریر ہوئے ہیں مگر ان کے موضوعات کا تنوع، بیان کی ندرت، اسلوب کی جدت اور مخصوص علاقے کی منظر نگاری، فضا آفرینی اور گہری رومانویت علامہ اقبال کے افکار کے تابع نظر آتی ہے۔ اس افسانوی مجموعہ کا انھوں نے نام بھی علامہ اقبال کے شعر پر تجویز کیا ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' اور علاوہ ازیں ''سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا''، ''ٹوٹتے تارے'' اور ''ستاروں سے آگے'' افسانے، جو علامہ اقبال کے افکار سے متاثر ہو کر تحریر کیے۔ ان افسانوں کے علاوہ ''مونالسا'' جو ''ایک طویل رومان'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے اقبال کی رومانیت کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اقبال کے اوّلین اور دوسرے دور کے کلام ''ہمالہ''، ''ابر کہسار''، ''آفتاب صبح''، ''پیام صبح''، ''چاند''، ''صبح کا ستارہ''، ''محبت''، ''ماہ نو''، ''حسن و عشق''، ''حقیقت حسن'' سے متاثر ہو کر حسن و عشق اور جذباتِ عشق کے تاثرات تحریر کیے۔ مندرجہ بالا نظمیں اقبال کے عہد شباب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اقبال نے بانگ درا کی پہلی نظم ''ہمالہ'' میں مناظر فطرت کی نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے اور وہ مغربی رومانیوں کی مانند کوہ وصحرا کے دامن میں حسین، فطری اور سادہ زندگی کو مثالی زندگی قرار دیتے ہوئے اس عہدِ ماضی کے حسین و جمیل تصورات میں گم ہو جاتے ہیں، جب تہذیب انسانی موجودہ تکلّفات سے مبرّا تھی۔ جس کا اظہار علامہ اقبال نے کوہ ہمالہ سے جذباتی اور روحانی وابستگی میں کیا ہے۔

اے ہمالہ داستان کوئی اس وقت کی سُنا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام
مسکن آبائے انسان جب بنا دامن ترا
داغ جس پر غازہ رنگ تکلف کا نہ تھا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام[۴۵۷]

قرۃ العین حیدر نے افسانہ نگاری اپنے عہد شباب میں شروع کی۔ وہ بھی اقبال کی مانند ہمالہ کے فطری حسن کی دلدادہ نظر آتی ہیں۔ انھوں نے ہمالہ کے فطری حسن کے اظہار کے ساتھ ساتھ سیدھی سادھی زندگی کو بنی نوع انسان کی ابتدائے مسکن قرار دیتے ہوئے اپنی رہائش ہمالہ کے

دامن میں تعمیر کروائی ہے۔ وہ فطرتی حسن سے عملی طور پر لطف اندوز ہونا چاہتی ہیں۔

وہ اپنے ہمالیہ کے پرانے گھر واپس پہنچ گئی۔ اس نے دریچے میں کھڑے ہو کر ان نیلی فضاؤں کی سمت دیکھا جدھر سے وہ جا کر لوٹ آئی تھی۔ وہ دریچے میں جھک کر باہر دیکھنے لگی۔ جہاں آلوچے کے زرد شگوفے کھل رہے تھے...... کنارے کی نمی میں براؤن پتے جم گئے ہیں۔ میں یہاں بیٹھ کر رونا چاہتی ہوں۔ میرے عزیز، میرے بھائی تم میرا مرثیہ لکھو گے۔ میرے باپ کا مرثیہ، میرے دادا کا مرثیہ، سگنل اپ اینڈ ڈاؤن ویٹس دی وے ٹو لنڈن ٹاؤن۔ آہ میرا وہ الزبتھن وضع کا کنٹری ہاؤس جو میرے باپ نے ہمالیہ کے دامن میں کس شوق سے بنوایا تھا؟[۴۵۸]

علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ہمالہ'' میں منظر کشی کا اعجاز دکھایا ہے کہ کس طرح دستِ قدرت نے عناصر کو ملا کر کھیل کود کے لیے ہمالیہ کی صورت میں ایک پہاڑ مہیا کر دیا ہے۔ جہاں عناصر زندگی ترتیب دیئے گئے ہیں۔

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے[۴۵۹]

قرۃ العین حیدر نے انھی عناصرِ زندگی کی تصویر کشی بڑے احسن طریقہ سے کی ہے جو علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ہمالہ'' میں ترتیب دی تھی۔

میں نے سوچا: یہ زندگی ہے۔ زندگی کی تصویر میں بنانا چاہتا تھا، زندگی جو مجھے کہیں نہ ملی تھی۔ وہ ہمالیہ کے درختوں تلے وقت اس کا اسکیچ بنایا اور بعد میں مدتوں اس میں رنگ بھرتا رہا۔ کیسے کیسے رنگ تھے۔ وہ سین دادا مجھ سے ہنس کر کہتے: تم تو چھوکرا ایک دم پاگل کا موافق ہے۔ ایسا ایسا بے مطلب تعبیر بناتا جس کا کوئی پچاس روپیہ بھی نائیں دے گا۔ پھر وہ موسم گل کی شہد کی مکھیوں کی طرح ہمالیہ کی کھلی فضاؤں میں ناچتے ناچتے دیوداروں کے سایوں میں غائب ہو گئی۔ وہ مجھے پھر کہیں نظر نہ آئی۔ اس تصویر پر گرد جم گئی۔ اس کے پیٹل کے سارے ذرے گر گئے۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے نقوش مدھم پڑ گئے۔[۴۶۰]

علامہ اقبال نے بانگ درا کی نظم ''صبح کا ستارہ'' میں عناصر کائنات کے مقابلہ میں انسانی عظمت کا تصور انوکھے انداز میں پیش کیا ہے جو تخیل اور اسلوب کے لحاظ سے خالص رومانی نظم ہے۔ جس میں ستارہ حیاتِ دوام کا آرزومند نظر آتا ہے۔

میری قسمت میں ہے ہر روز کا جینا مرنا
ساقیِ موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا[۴۶۱]

قرۃ العین حیدر نے بڑے احسن طریقہ سے عناصر کائنات کو انسانی عظمت کا ہم سفر قرار دیتے ہوئے رومانی تخیل پیش کر کے علامہ اقبال کے تصور کو تقویت دی ہے اور ستاروں اور سیاروں سے درسِ حیات سیکھنے کی دعوت دی ہے۔

دور ہسپانوی خانہ بدوشوں کے کاروانوں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ آؤ طوفانوں سے لڑیں، شعلوں سے آنکھ مچولی کھیلیں، جنوب کے نیلے آسمانوں اور ستاروں کے گیت گائیں اور اسی طرح شور مچاتے، چیختے اور ناچتے ہوئے طوفانی لہروں کے ریلوں کے ساتھ کہیں دور نکل جائیں۔ بہت دور جانے کتنی دور۔[۶۲]

قرۃ العین حیدر اور اشتراکیت

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر اور روس نے ۱۹۱۲ء میں مشہد پر حملہ کیا۔ اس عالم میں ملتِ اسلامیہ کو کرب ناک حالات سے دوچار ہونا پڑا تو اقبال نے ملت اسلامیہ کو اس صورتِ حال سے بیدار کرنے کے لیے تہذیبِ فرنگ کو ملیامیٹ کرنے کا درسِ انقلاب فروری ۱۹۱۲ء میں دیا۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو[۶۳]

جنگِ عظیم اوّل کے اختتام پر یورپی استبداد سے خلافت عثمانیہ پر کاری ضرب لگی جس سے عالم اسلام میں اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں زارِ روس کے تخت سے دست برداری کے بعد بالشویک حکومت قائم ہوئی جسے کسانوں اور مزدوروں کی حمایت حاصل تھی۔ اس تحریکِ انقلاب کے رہنما ٹرائسکی اور لینن تھے۔ لینن نے روس کو زاریت اور کلیسائیت کے ظلم وستم کے شکنجہ سے آزاد کروایا اور انقلابی جدوجہد کا آغاز کیا۔ زارِ روس کے متعلق لینن اور مارکس کی کاوشوں اور نظریات کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

لینن دورِ حاضر کا بہت بڑا انقلابی تھا...... اس نے بالشویک ایک جماعت بنائی۔ جس نے ۱۹۱۷ء میں زار روس کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کی...... وہ کیمونزم کا سب سے بڑا داعی مانا جاتا تھا۔ جس نے کارل مارکس کے فلسفے کو عملی جامہ پہنایا۔[۶۴]

اقبال نے دورِ حاضر کو مدنظر رکھتے ہوئے بالشویک انقلاب کا استقبال کیا اور ''خضر راہ'' اور

''طلوع اسلام'' جیسی طویل نظمیں تحریر کیں بلکہ انقلابِ روس سے متاثر ہوکر بانگ درا کے آخری حصہ میں چند اور اشعار بھی لکھے۔ ''خضرراہ'' میں اقبال نے پہلی بار مغربی سرمایہ دارانہ نظام سے پیدا شدہ طبقاتی کشمکش، نظام سلطنت، مغربی طرز جمہوریت، آمریت، شہنشاہیت اور سرمایہ و محنت اور زندگی کے متعلق اپنے نظریات سے آگاہ کیا۔

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش[۶۵]

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک عمل میں آئی اور قرۃ العین حیدر نے بھی تقریباً اسی دور میں ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ ابتدا میں اس کے افسانے حیرت اور تجسّس کے ساتھ مطالعہ کیے جاتے رہے اور ترقی پسند ادیبوں نے اس کی خوب پذیرائی کی۔ ترقی پسند ادبی تحریک میں شامل الٹرا لیفٹ، خصوصاً کیمونسٹ ادیبوں نے ترقی پسند ادب کا صرف اور صرف اشتراکیت کا پرچار قرار دیا تو انھوں نے قرۃ العین حیدر کو اس صف سے نکال دیا۔ بقول شمیم احمد:

۱۹۴۷ء سے پہلے وہ خود کو ترقی پسندوں میں شامل کرتی تھیں جبکہ ترقی پسندوں نے انھیں کبھی شامل نہیں کیا۔ جب بھی کسی کے اعتراض اور ذاتی حملوں کی پرواہ کیے بغیر لکھتی رہی وہی جو آس پاس دیکھتی تھیں۔ جس کو اُن کا قلب و ذہن دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔[۶۶]

قرۃ العین حیدر خود ترقی پسند مصنّفین کی فہرست میں شامل ہونے کا اظہار فخریہ انداز میں کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال سے متاثر ہوئیں اور ان کی نظم ''خضرراہ'' کا عمیق مطالعہ کرتے ہوئے ''زندگی'' پر روشنی ڈالتی ہے۔ جس کا اظہار فخریہ انداز میں کرتے ہوئے خود کو کیمونسٹ قرار دیتی ہیں۔

ہم ادب اور موسیقی اور چھایا چترا کے ذریعہ جنتا کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے ہمارے اوپن ایئر اور پیپلز تھیٹرز نہیں دیکھے۔ ہمارے افسانے اور نظمیں ملاحظہ نہیں فرمائیں۔ آپ کیا جانیں ہم کیمونسٹ پارٹی کے لوگ کس قدر صاحب نظر...... علامہ مرحوم کا شعر کچھ ایسا ہی ہے۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسماں مستعار
اور خاکستر سے اپنی اک جہاں پیدا کرے[۶۷]

قرۃ العین حیدر کو ترقی پسند مصنّفین ترقی پسند مصنفہ ماننے سے انکار کرتے تھے کیونکہ وہ بورژوا طبقہ کے متعلق تحریر کرتی ہیں۔ متوسط طبقہ، مزدور اور کسان کے متعلق کیوں نہیں لکھتی ہیں اور ان کے افسانے رومانوی کیوں ہوتے ہیں؟ جس سے عصری زندگی کی عکاسی نہیں ہوتی۔ اس

سلسلہ میں وہ ادب کے متعلق واضح نظریہ پیش کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ رومانیت کی مانند سوشلسٹ ہیومنزم بھی اُردو ادب میں مغرب سے وارد ہوا ہے لہٰذا وہ اپنے آپ کو ترقی پسند مصنّفین میں شامل کرتے ہوئے علامہ اقبال کے بارے میں بھی بتاتی ہیں کہ وہ انقلابِ روس سے متاثر ہوئے اور میں بھی ان کے نقش قدم پر ترقی پسند مصنّفین کی فہرست میں شامل ہوں۔

ہندوستان میں علامہ اقبالؒ، ٹیگور اور پریم چند کو انقلاب روس نے متاثر کیا تھا۔ چنانچہ کلاسیکیت اور ''نیچرل شاعری'' اور رومانیت کی طرح سوشلسٹ ہیومنزم بھی اُردو میں مغرب ہی سے امپورٹ ہوئی تھی جس طرح تیس پینتیس سال قبل نوعمر پریم چند کو ٹالسٹائی نے متاثر کیا تھا۔[۴۶۸]

علامہ اقبال انقلابِ روس کے متعلق جاوید نامہ میں تحریر کرتے ہیں کہ میں نے اس کے اثرات دیکھے ہیں اور مسلمانوں کے برے اثرات مشرق و مغرب کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے جو ایک جیسے ہی ہیں۔ لہٰذا اقبال انقلابِ روس کے متعلق ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں:

انقلابِ روس و الاماں دیدہ ام
شور در جانِ مسلماں دیدہ ام
دیدہ ام تقدیر ہائے غرب و شرق
و انما تقدیر ہائے غرب و شرق[۴۶۹]

قرۃ العین حیدر انقلابِ روس کے سلسلہ میں اقبال کے افکار و نظریات سے متاثر نظر آتی ہیں اور علامہ اقبال کے اشعار کا بھی ہو بہو استعمال کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ زارِ روس اور انقلابِ روس کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے بتاتی ہیں:

چوک میں زار روس کے سپاہی قواعد پریڈ میں مصروف تھے۔ ایک خیمے کے سامنے روسی کمسریٹ کا ایک خچر میری طرح چپ چاپ کھڑا تھا۔ گریٹ کورٹ میں ملبوس سنہری مونچھوں والا ایک روسی کپتان ایک تباہ حال ترکمان کو چابک مار رہا تھا۔ ایک غریب خواجہ یعنی سیدزادہ عمامے پر سبز رومال باندھے، سر جھکائے آہستہ آہستہ مسجد کی طرف جا رہا تھا۔[۴۷۰]

قرۃ العین حیدر انقلابِ روس کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے مسلمانوں پر ظلم و ستم کا تذکرہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات اور اشعار میں کرتی ہیں۔

ہندی مسلمان اپنے نوزائیدہ لڑکوں کے نام انور پاشا، جمال پاشا، کمال پاشا، مدحت پاشا رکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔ بغداد والے انور پاشا روس پہنچے۔ بالشویک فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

انقلابِ روس و الاماں دیدہ ام
شور در جانِ مسلماں دیدہ ام[۴۷۱]

علامہ اقبال ''خضر راہ'' میں نظام سیاست پر روشنی ڈالتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ جمہوری نظام درحقیقت ملوکیت کی تبدیل شدہ شکل ہے۔ جس میں عوام بھیڑ چال کا شکار ہو کر اسے آزادی کی نیلم پری تصور کرتے ہیں۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری[۴۷۲]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کے تصور جمہوریت اور ملوکیت سے اتفاق رائے رکھتے ہوئے ہندوؤں کے تصور شکتی کو ایک جیسا محسوس کرتی ہیں۔

شکتی کے تصور کی تجسیم مختلف ہے۔ بنیادی تصور یکساں ہے اور علامہ اقبال کو تو دیو استبداد اور جمہوریت کی نیلم پری دونوں ایک سے معلوم ہوتے ہیں۔[۴۷۳]

علامہ اقبال نے ''خضر راہ'' میں ''سرمایہ و محنت'' تحریر کر کے واضح انداز میں سرمایہ دار کی مذمت کرتے ہوئے مزدور کی حمایت کی ہے۔ جس بنا پر اقبال اشتراکیت کے قریب ترین نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ''ساقی نامہ'' میں بھی انقلابِ روس میں سرمایہ داری کے اختتام پر پُرمسرت انداز میں محنت کش طبقے کو ''سامراجیت'' اور ''سرمایہ دارانہ استبدادیت'' سے نجات کی خبر دیتے ہیں۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا[۴۷۴]

محنت کش طبقے کی حمایت میں اقبال کے ہاں نہ صرف اردو کلام میں اشعار ملتے ہیں بلکہ فارسی کلام بھی لبریز ہے۔ پیامِ مشرق میں ''قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور''، ''نوائے مزدور''، ''موسیولینن و قیصر ولیم''، ''محاورہ مابین حکیم فرانسوی آگسٹ کومٹ مرد مزدور'' ہیں۔ زبور عجم میں اقبال بیداری مزدور اور دہقان کو خواجہ کے خلاف نعرہ انقلاب لگاتے ہیں۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور ساز و لعل ناب
از جفائے دہ خدایان کشت دہقاناں خراب
انقلاب انقلاب اے انقلاب[۴۷۵]

قرۃ العین حیدر بھی بعینہٖ اقبال کے افکار کی روشنی میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے نظام اشتراکیت کے قریب ترین دکھائی دیتی ہیں۔ وہ مزدور اور سرمایہ دار کی حالت

بیان کرتے ہوئے ذکر کرتی ہیں کہ سرمایہ دار کے گلے میں جو ریشمی پوشاک ہے وہ مزدور کی بد قسمتی کے سبب اس نے پہنی ہے۔اس سلسلے میں اپنے سفر نامہ گلگشت میں مزدور اور غریب لوگوں کی حالت نا گفتہ بہ کا تذکرہ کرتی ہیں۔

گوجر مزدور سب سے زیادہ خستہ حال ہیں، چیتھڑوں میں ملبوس سانولے، سیاہ داڑھیاں، کشمیریوں سے نسلاً مختلف۔[۴۷۶]

قرۃ العین نے مزید جاگیرداروں کے ظلم وستم کا نقشہ کھینچ کر مزدور کسان کی غربت وافلاس کا تذکرہ دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

راجہ کے زمانے میں ہمارے باپ کو بیگار کرنی پڑتی تھی۔اس کے پاس جوتے نہیں تھے جناب، پاؤں پر گھاس باندھ کر سامان ڈھوتا تھا۔ پہاڑوں پر سامان لے جاتا تھا۔[۴۷۷]

قرۃ العین حیدر کشمیری مزدور کی حالت اپنے سفر نامہ گلگشت ۱۹۷۹ء میں واضح انداز میں بیان کرتی ہیں کہ کشمیری مزدور کی بہتری کا سبب یہاں کے تاجر کی محنت اور ایمانداری ہے لیکن ایک دور تھا جب علامہ اقبال کشمیر تشریف لائے تو یہاں کے مزدور کی حالت نا گفتہ بہ تھی۔اسی مزدور کی حالت دیکھ کر اقبال نے ''نشاط باغ'' کشمیر میں بیٹھ کر فارسی نظم ''ساقی نامہ'' تحریر کیا تھا۔جس کے متعلق قرۃ العین حیدر ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

نشاط باغ میں بیٹھ کر جون ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال نے ساقی نامے میں لکھا تھا:

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

آج ۱۹۷۹ء میں سرینگر کے نئے کروڑ پتی تاجروں کا مال ساری دنیا میں جاتا ہے۔ان کی وجہ سے ایک نیا دولت مند طبقہ وجود میں آچکا ہے لیکن کشمیری کاریگروں کی حالت نسبتاً پہلے سے بہتر ہے۔[۴۷۸]

علامہ اقبال سرمایہ دارانہ نظام کے سخت خلاف ہیں لہٰذا وہ کسانوں اور مزدورں کو بیداری کا پیغام دے کر مزدوروں اور سرمایہ داروں کو آپس میں دست وگریبان کر کے ''نقش کہن'' مٹانا چاہتے ہیں تا کہ مغربی تہذیب کا خاتمہ ہو۔لہٰذا وہ دہقان کو مشورہ دیتے ہیں کہ جس کھیت سے روزی میسر نہ ہو اسے جلا دینا ہی بہتر ہے۔

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو[۴۷۹]

قرۃ العین حیدر بھی بے دخل کسانوں سے ہمدردی رکھتی ہے جنھیں ان کی فصلوں والی زمین سے نکال دیا گیا ہے۔ وہ ''سلطانیِ جمہور'' کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر کے انھیں عدالت کے کٹہرے میں کھڑے کر کے ان کا حق دلانا چاہتی ہے اور ان کو مشورہ دیتی ہے کہ ''کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو۔''

جو بے دخل کسان متروکہ قرار دیے جانے والے کھیتوں کے سلسلے میں فریاد دے کر آتے۔ اظہر علی بلا معاوضہ ان کی قانونی امداد کرتے وہ بیچارے اکثر بطور نذرانہ ان کے لیے ڈلیا میں تازہ سبزی یا گڑ کی بھیلیاں لے آتے اور انتظار میں صبر سے آم کے درخت کے نیچے بیٹھے رہتے۔ نماز کا وقت آتا باغ کے گوشے میں استادہ مختصر سی نیم شکستہ مسجد میں جا کر نماز پڑھ کر آتے اور پھر انتظار میں مصروف ہو جاتے۔[۴۸۰]

قرۃ العین حیدر محنت کش، مزدور اور کسان کے متعلق اپنی گفتگو اور تحریروں میں نئی نئی اصطلاحات کا استعمال کر کے اشتراکیت سے گہرے لگاؤ کا اظہار کرتی ہیں۔

قنبر میاں اپنی گفتگو میں جو نئی اصطلاحات استعمال کرتے تھے۔ امی جان ان زوال پرستوں سے بحث فضول ہے۔ پیداواری رشتے، زوال پرستی، رجعت پسندی، محنت کش عوام کا استحصال ''اقدار کی شکست و ریخت'' ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔ ''صنعتی تمدن میں انسان کی تنہائی اور بے چہرگی۔''[۴۸۱]

اقبال دہقان اور مزدور سے ہمدردی کی بنا پر ملکیت زمین کو فرد واحد کی ملکیت تصور کرنے کی بجائے قومی ملکیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک صرف نگہبانی اور محنت کرنے والے کسان کا حق ہے اور ایسے شخص کا قطعاً کوئی حق نہیں جو بادشاہوں سے تحفتاً یا جبراً خدا کی زمین پر قابض ہو کر زمیندار یا جاگیردار کہلاتا ہے۔ زمین بھی پانی اور ہوا کی طرح سب کی ملکیت ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اسے ''الارض للہ'' قرار دیا ہے۔

اقبال نے اس سلسلہ میں بالِ جبریل کی ایک نظم ''الارض للہ'' تحریر کرتے ہوئے خدا کی ملکیت قرار دیا ہے۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نور آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دِہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں ، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں[۴۸۲]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک بھی زمین خدا کی ملکیت ہے اس سلسلہ میں انھوں نے کسانوں سے ہمدردی رکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ زمین پر صرف اس کا حق ہے جو اس پر فصل اگاتا ہے، ہل چلاتا ہے نہ کہ ایسے لوگوں کی جو غنڈہ گردی کے روپ میں اس پر اپنی ملکیت ظاہر کرتے ہیں اور دہقان سے جزیہ وصول کرتے ہیں۔

جمّا دھوبی ہل بیل لیے پہنچا۔ ان لوگوں کو ہبوڑ سے سمجھ کر توجہ نہ دی۔ گلاب کی آنکھ کھلی۔ جما پر نظر پڑی۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تہمد پر چرمی پیٹی باندھ رکھی تھی۔ اس میں رام پوری چاقو پوشیدہ تھا اینڈتے ہوئے قریب پہنچے۔ فلمی غنڈوں کے انداز میں پیچھے سے جا کر کندھا دبوچا۔ ڈپٹ کر دریافت کیا ''اے۔ یہاں کس کی اجازت سے کھیتی کرتے ہو؟ اللہ میاں کی اجازت سے۔ جما نے ہنس کر جواب دیا'' آپ کون ہیں؟'' اس زمین کے مالک۔''، ''جمین کے مالک تو اللہ میاں ہیں۔'' بیل کو چابک مار کر ہل آگے بڑھایا۔[۴۸۳]

قرۃ العین حیدر زمین کی ملکیت کے متعلق بیان کرتی ہیں کہ زمین کے مالک بدلتے رہتے ہیں آج کوئی مالک ہے کل کوئی اور یا اس کی اولاد مالک ہوگی۔ یہ نسل در نسل زمین کی ملکیت کے سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کے تصور وقت کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی ملکیت کے بارے میں تذکرہ کرتی ہیں جو کسی زمانے میں ان کی ملکیت تھی مگر آج نہیں ہے چنانچہ وہ زمین کو خدا کی ملکیت قرار دیتے ہوئے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں بیان کرتی ہیں کہ زمین فقط اللہ تعالیٰ کی ہے۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں شہر مراد آباد سے محمود پور (مقافی) تک جہاں کچی سڑک تھی۔ وہاں کول تار کی شاہراہ پر یو۔ پی ٹرانسپورٹ کی بسیں اور رواں ہیں۔ مغربی اتر پردیش کے ''سبز انقلاب'' کی بدولت ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے ہیں منی بس میں میرے برابر بیٹھے ہوئے کزن نے کہا ''باجی یہ سارا علاقہ ہمارا تھا'' معلوم ہے۔ دہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں۔[۴۸۴]

اقبال کی سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت اور مزدور طبقہ سے محبت اور ہمدردی اشتراکیت کا واضح نمونہ ہے اس سلسلہ میں ان کی نظمیں ''لینن خدا کے حضور میں'' اور ''فرمان خدا'' واضح ثبوت ہیں۔ چنانچہ وہ انقلابِ روس کے رہنما لینن کی زبانی محنت کشوں پر ظلم وستم بیان کرتے ہیں۔ جس سے ان کی لینن کے ساتھ گہری دلچسپی نظر آتی ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں بہت تلخ بندہ مزدور کے اوقات[۴۸۵]

قرۃ العین حیدر نے بھی اسی سلسلہ میں اپنے سفر نامہ گلگشت میں ''لینن'' سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں انھوں نے لینن کے گھر، مقبرہ کے متعلق تفصیلاً بیان کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے لینن کے متعلق تفصیلات تحریر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ لینن نہ صرف علامہ اقبال کی نظر میں اہمیت رکھتے تھے بلکہ اسے روس میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دو منزلہ اسکول، لینن کا ڈیسک جس پر نئے طالب علم کو پہلے روز بطور نیک شگون بٹھایا جاتا ہے۔[۴۸۶]

اقبال کو مارکسزم کی سرمایہ داری اور نظام ملوکیت سے نفرت اور مزدور طبقہ کا روشن مستقبل نظر آتا ہے مگر وہ اسے مادیت کی بجائے روحانیت میں دیکھنے کے خواہاں ہیں اس وجہ سے وہ لینن اور کارل مارکس دونوں اشترا کی رہنماؤں سے متاثر نظر آتے ہیں اور ان کے افکار سے گہری دلچسپی لی۔ کارل مارکس نے اپنی تصنیف سرمایہ اشترا کیت پر ایک مفصل مضمون نظام حیات اور فلسفۂ زندگی کے طور پر پیش کیا اقبال نے اس سلسلہ میں کارل مارکس کو ہدف تنقید بنایا اور اسے نطشے کی مانند ''قلب او مومن دماغش کافر است'' قرار دیا۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
یعنی آن پیغمبر بے جبریلؑ
ز انکہ حق و باطل او مضمر است
قلب او مومن و دماغش کافر است[۴۸۷]

قرۃ العین حیدر بھی مارکسزم کی سرمایہ داری اور نظام ملوکیت سے اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے مزدور طبقہ کی بہتری اور سردار لوگوں اور امرا سے اظہار نفرت کرتی ہیں۔ جنھوں نے مزدوروں کا خون چوس کر ان کا ستیا ناس کر دیا ہے۔ قرۃ العین حیدر مزدوروں کی کیفیت دیکھ کر افسردہ ہوتی ہیں۔ جس بنا پر وہ لینن اور کارل مارکس سے بے حد متاثر ہیں اور ان کے گن گاتی ہیں۔

الموڑہ، نینی تال، مسوری، ہائے مسوری، ہائے دہرہ دون، میرا پیارا بچپن کا رفیق دہرہ دون، گڈو، ان کے بغیر تمھارے گرم اور پھیکے ملک میں رہنا ایک مستقل مصیبت ہو جاتی ہے......اب تم مارکس اور لینن کا وظیفہ شروع کر دو۔ یہ تم ہندوستانی قنوطیت پسندی تو لے ڈوبی۔ کبھی یہ غور نہیں کرتے کہ

ہماری aristocracy کس قدر شاندار اور خوبصورت ہے۔ پرنس کرم جیت اور شہزادی نیلوفر اور مہا راجہ راج پیپلا اور بیگم گوہر تاج اور مہارانی کوچ بہار۔[۴۸۸]

قرۃ العین حیدر اشتراکیت کے زیر اثر کارل مارکس اور علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں جائزہ لیتی ہیں۔ دہرہ دون کے بال یوگیشور نامی شخص جو ہندوستان میں ایک معمولی مزدور تھا۔ ترقی کرتے کرتے امریکہ کا ارب پتی بن گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک آج کا مزدور ترقی پر ہے اور جب وہ سرمایہ دار بن جاتا ہے تو پھر عیاشی کے نئے نئے طریقے تلاش کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ امریکہ جیسے ملک میں مزدور کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے اور انھوں نے اقبال اور کارل مارکس کے افکار و نظریات سے استفادہ کیا ہے۔

اقبال، کارل مارکس، بال یوگیشور، رسپنا ندی دسمبر ۱۹۷۴ء حکومت اتر پردیش ڈپارٹمنٹ آف ٹورزم کی دعوت پر میں بذریعہ جیپ اسٹیشن ویگن کمایوں اور گڑھوال کا دورہ کرتی دہرہ دون پہنچتی ہوں۔ ویگن دہرہ دون میں داخل ہو کر بال یوگیشور کے نئے محل کے سامنے سے گزرتی ہے۔ دہرہ دون کا یہ راوت بچہ امریکہ کا ارب پتی بے بی گوڈ بن چکا ہے۔ رشی کیش، ہردوار، دہرہ دون، ہر جگہ نروان کے متلاشی مغربی لڑکیوں اور لڑکوں کے غول نظر آتے ہیں۔[۴۸۹]

علامہ اقبال کے نزدیک حیاتِ مسائل کیمونزم یا سوشلزم میں موجود نہیں بلکہ مذہب اسلام میں موجود ہیں۔ جس کی تفصیل ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں کھلم کھلا بیان کی گئی ہے جس بنا پر وہ اسلام کو اشتراکیت سے اوّل درجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اشتراکیت سے بھی ملوکیت کے خاتمہ افرنگی سرمایہ داری سے چھٹکارہ کی بنا پر متاثر ہیں مگر انھیں اس میں لادینی کی خامی سے زیادہ نظر آئی اور مثنوی پس چه باید کرد اے اقوام شرق کی ایک نظم ''لا الہ الا اللہ'' میں زندگی کے اثباتی اور منفی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے روس کے کارنامہ کو سراہا ہے اور انھیں لا سے الا کی طرف قدم بڑھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرف لا آمد بروں
لا و الا ساز برگ امتاں
نفی بے ثبات مرگ امتاں[۴۹۰]

قرۃ العین حیدر بھی علامہ اقبال کے افکار سے اتفاق رائے رکھتی ہیں کہ حیاتِ مسائل سوشلزم یا کیمونزم میں موجود نہیں بلکہ یہ خود ہی کیمونسٹوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے اور

اس کا واحد حل وہ بھی مذہب اسلام میں تلاش کرتی ہیں چنانچہ وہ بھی اقبال کی طرح اہلِ روس کو پیغام دیتی ہیں کہ وہ حقیقی سوشلزم کو مشعل راہ تصور کرتے ہوئے اسلام قبول کریں۔

کیمونسٹوں نے مارکسزم کو تباہ کر دیا۔طغیان صاحب نے جون کارٹر پر نظر ڈال کر دوسرا موضوع شروع کر دیا۔موصوف بڑے زبردست سوشلسٹ تھے۔صوفی ازم ان کی سائیڈ لائن تھی۔انھوں نے ہندی میں بہت سے ناول لکھ ڈالے تھے اب انگریزی میں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ان کا پورا نام رائے ہربنس رائے طغیان بھاگلپوری تھا۔بہار کے رہنے والے تھے۔''میرے مرشد نے مجھ سے کہا ہے۔بچہ تو روسجا......''اور ان ملعون ملحدوں کو سچی سوشلزم کی مشعل ہدایت دکھلا کر راہِ راست پر لا۔[۴۹۱]

جواہر لال نہرو نے علامہ اقبال کو اشتراکیت کے قریب قرار دیتے ہوئے آگاہ کیا ہے کہ روس کی ترقی سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنی شاعری میں اسے نیا رنگ دیا۔نہرو کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں اشتراکیت کو رائج کیا جائے اس سلسلہ میں اقبال نے ۲۸ مئی ۱۹۳۸ء کو مسئلہ اشتراکیت اور اسلام کے نفاذ کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح کو ایک خط تحریر کیا۔جس میں اشتراکیت کے نفاذ کی مذمت کی گئی اور اسلامی قانون کے نفاذ کو مسئلے کا حل قرار دیا۔

جواہر لال کی منکرِ خدا اشترکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی......جواہر لال کی اشتراکیت خود ہندوؤں میں کشت وخون کا موجب ہوگی۔معاشری جمہوریت اور برہمنیت کے درمیان وجہ نزاع برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے۔آیا اشتراکیت کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہوگا یا نہیں۔میں اس سے متعلق تو کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا ......خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے اور فقہ اسلامی کا مطالعہ مقتضیاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر دوسرے مسائل کا حل بھی موجود ہے۔[۴۹۲]

قرۃ العین حیدر نے اشتراکیت کے متعلق جواہر لال نہرو کے ان نظریات کا حوالہ دیا ہے جسے وہ مسلمانوں کے لیے خوش آیند قرار دیتے ہیں۔نہرو ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کو سوشلزم پر جلد عمل کرنے کے لیے پیش گوئی کرتے ہیں کہ وقتی طور پر مسلمان خوفزدہ ہیں۔اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کا حوالہ دیتے ہوئے سوشلزم کو رائج کرنا چاہتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے انھی افکار کی وضاحت کی ہے جو سوشلزم کے متعلق نہرو رائے رکھتا تھا اور جس کے متعلق اقبال نے جناح کو خط تحریر کیا تھا۔

۳۴ء میں پنڈت نہرو نے یہ خوش آیند ظاہر کی تھی کہ گو مسلم سیاست پر فیوڈل عنصر چھایا ہوا ہے۔

ان کا نچلا متوسط طبقہ انڈسٹریل طور پر پسماندہ ہے لیکن چونکہ ان کے یہاں سماجی رشتوں کا شعور زیادہ پختہ ہے۔ اس لیے یہ لوگ ہندو لوئر مڈل کلاس کے مقابلے میں سوشلسٹ راستے پر زیادہ تیزی سے گامزن ہوں گے۔ پنڈت نہرو یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے سرمایہ دار اور انڈسٹری کے کرتا دھرتا اور مل مالک شدت سے رجعت پسند ہیں وہ تو ابھی جدید زمانے کے سرمایہ دار بھی نہیں بنے ہیں۔ کانگریس پر ہندو اکثریت کا غلبہ ہے اور ہندو اکثریت فرقہ وارنہ ذہنیت کی حامل ہے۔ ایسے میں مسلمانوں میں خوف سائیکالوجی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اس صورت حال کو برطانوی حکومت خوب اچھی طرح اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ ملک کا فیوڈل عنصر یہ بھی نہیں چاہتا کہ عوام اقتصادی طور پر آزاد ہوں لہٰذا انھوں نے برطانوی حکومت سے سازش کر رکھی ہے۔ مڈل کلاس کی انٹل جنیا میں فاشزم کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کے خطرات کا مقابلہ کرنے میں ہمیں پوری کوشش صرف کرنا چاہیے۔ پنڈت نہرو بہت زبردست سوشلسٹ تھے ان کو گاندھی جی کی روحانیت اور بات بے بات خدا کا حوالہ دینا کھلتا تھا۔ کمال اور اس کے ساتھ کی نوجوان نسل کی پنڈت نہرو پوری پوری ترجمانی کر رہے تھے۔[۴۹۳]

اقبال کو بعض ناقدین نے ترقی پسند، اسلامی اشتراکی اور اشتراکی گردانے کی کاوش کی ہے مگر اقبال مغربی جمہوریت اور ملوکیت سے بہتر اشتراکیت تصور کرتے تھے اور اشتراکیت یا کسی اور ازم کی نسبت اسلام کے نظام کو رائج دیکھنے کے خواہاں تھے۔ جس کے متعلق اقبال نے ۱۲ / مارچ ۱۹۳۷ء کو آل احمد سرور کو ایک مراسلہ تحریر کیا۔

میرے نزدیک فاشزم، کیمونزم یا زمانہ حال اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطہ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔[۴۹۴]

قرۃ العین حیدر اشتراکیت کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کا موازنہ کرتے ہوئے تحریر کرتی ہیں کہ ہندوستان میں نہرو کی کاوشوں سے اشتراکیت پر عمل درآمد ہوا اور وہاں کے تعلیمی اداروں میں بالخصوص زیادہ اثرات پائے جاتے تھے۔ لڑکیاں فنونِ لطیفہ اور علوم موسیقی اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کے لیے حاصل کرتی تھیں لیکن قیام پاکستان پر یہاں صرف اور صرف علامہ اقبال کی تعلیمات کا پرچار تھا اور اشتراکیت سے عموماً بیزاری تھی۔

اشتراکیت کی دھن اور اس کا ماحول افسوس کہ وطن مرحوم کی یونیورسٹیوں ہی میں رہ گیا۔ یہاں ملتِ اقبال اور ذوق جہاد زیادہ طاری تھا۔[۴۹۵]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک بھی کیمونزم جو ایشیا میں تیزی سے پھیل رہا ہے مسلم مما لک کے لیے خطرناک ہے چنانچہ اس کے خاتمہ کے لیے امریکہ سے تعاون کیا جا سکتا ہے تا کہ کیمونزم ایشیا کو اپنی لپیٹ میں نہ لے سکے اور مذہب اسلام کی اشاعت کے لیے کوششیں کرنی چاہیے۔

اس نے ایشیا میں کیمونزم کے خطرے پر روشنی ڈالی اور کمال کو بتایا کہ مسلم مما لک اپنی مذہبی اور روحانی طاقت کے ذریعے کیمونزم کے خلاف جہاد میں امریکہ کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔[۴۹۶]

حواشی

۱۔ انتخابات سجاد حیدر یلدرم، ص ۹۳۔

۲۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۴۱۲۔

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً، ص ۴۶۲۔

۵۔ شیشے کے گھر، ص ۱۸۹۔۱۸۸۔

۶۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۴۶۲۔

۷۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۶۵۔

۸۔ ستاروں سے آگے، ص ۲۰۴۔

۹۔ کار جہاں دراز ہے، جلد دوم، ص ۲۱۵۔

۱۰۔ میرے بھی صنم خانے، ص ۳۱۴۔

۱۱۔ کار جہاں دراز ہے، جلد اوّل، ص ۴۶۲۔

۱۲۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۴۴۔

۱۳۔ بالِ جبریل۔ ص ۶۵۔

۱۴۔ ستاروں سے آگے، ص ۹۷۔

۱۵۔ بالِ جبریل، ص ۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۱۷۔ کوہِ دماوند، ص ۱۷۔

۱۸۔ ضربِ کلیم ،ص۲۱۔

۱۹۔ بال جبریل ،ص۸۳۔

۲۰۔ ضرب کلیم ،ص۴۱۔

۲۱۔ شعر اقبال ،ص۴۳۹۔

۲۲۔ بالِ جبریل ،ص۳۱۔

۲۳۔ **ایضاً،ص۴۸۔**

۲۴۔ پت جھڑ کی آواز ،ص۱۲۷۔

۲۵۔ **ایضاً،ص۱۴۰۔**

۲۶۔ بالِ جبریل ،ص۱۰۵۔

۲۷۔ **ایضاً،ص۱۰۵۔**

۲۸۔ قرۃالعین حیدر کے بہترین افسانے ،ص۶۳۔

۲۹۔ شیشے کے گھر ،ص۱۶۴۔۱۶۵۔

۳۰۔ شعر اقبال ،ص۴۲۸۔

۳۱۔ تشبیہات اقبال ،ص۲۱۰۔

۳۲۔ اقبال نامہ ،**جلداوّل**،ص۲۰۴۔

۳۳۔ آگ کا دریا ،ص۵۰۲۔

۳۴۔ **ایضاً،ص۵۰۲،۵۰۴،۵۵۵۔**

۳۵۔ **ایضاً،ص۵۵۴۔**

۳۶۔ بالِ جبریل ،ص۶۱۔

۳۷۔ کار جہاں دراز ھے ،**جلددوم**،ص۷۵۔

۳۸۔ بالِ جبریل ،ص۱۰۔

۳۹۔ **ایضاً،ص۵۰۔**

۴۰۔ پت جھڑ کی آواز ،ص۱۶۲۔

۴۱۔ کار جہاں دراز ھے ،**جلددوم**،ص۳۱۶۔

۴۲۔ بانگِ درا ،ص۶۸۔

۴۳۔ بالِ جبریل ،ص۱۲۲۔

۴۴۔ ایضاً،ص۳۰۔
۴۵۔ بانگ درا ،ص۱۱۲۔
۴۶۔ ضرب کلیم ،ص۶۹۔
۴۷۔ بالِ جبریل ،ص۱۰۵۔
۴۸۔ کار جہاں دراز ھے ،جلددوم،ص۶۷۔
۴۹۔ ایضاً،ص۸۳۔
۵۰۔ ایضاً،ص۶۸۔
۵۱۔ ایضاً
۵۲۔ بالِ جبریل ،ص۳۰۔
۵۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلددوم،ص۶۸۔
۵۴۔ کوہ دماوند ،ص۲۳۔
۵۵۔ بالِ جبریل ،ص۳۰۔
۵۶۔ کار جہاں دراز ھے ،جلددوم،ص۷۲۔۷۳۔
۵۷۔ تشبیہات اقبال ،ص۳۳۶۔
۵۸۔ کار جہاں دراز ھے ،جلددوم،ص۷۳۔
۵۹۔ ستاروں سے آگے ،ص۵۹۔
۶۰۔ بالِ جبریل ،ص۶۱۔
۶۱۔ ستاروں سے آگے ،ص۴۴۔
۶۲۔ ایضاً
۶۳۔ بانگِ درا ،ص۱۱۹۔
۶۴۔ ستاروں سے آگے ،ص۱۱۷۔
۶۵۔ بانگ درا ،ص۱۴۷،۱۴۸۔
۶۶۔ ستاروں سے آگے ،ص۶۴۔
۶۷۔ ایضاً،ص۶۵۔
۶۸۔ بانگِ درا ،ص۱۷۴۔
۵۹۔ ستاروں سے آگے ،ص۱۱۵۔

۷۰۔ ایضاً،ص۴۵۔
۷۱۔ بالِ جبریل ،ص۶۶۔
۷۲۔ ایضاً،ص۶۵۔
۷۳۔ ستاروں سے آگے ،ص۴۴۔
۷۴۔ بانگِ درا ،ص۱۲۸۔
۷۵۔ ستاروں سے آگے ،ص۴۵۔
۷۶۔ بانگِ درا ،ص۱۷۳۔
۷۷۔ مطالبِ بانگ درا ،ص۱۲۹۔
۷۸۔ بانگِ درا ،ص۱۱۱۔
۷۹۔ ستاروں سے آگے ،ص۳۸۔
۸۰۔ ایضاً،ص۴۲۔
۸۱۔ بانگِ درا ،ص۵۸۔
۸۲۔ بالِ جبریل ،ص۱۰۔
۸۳۔ ستاروں سے آگے ،ص۴۶۔
۸۴۔ ایضاً،ص۴۶۔
۸۵۔ بانگِ درا ،ص۱۹۰۔
۸۶۔ تلمیحات اقبال ،ص۳۲۶۔
۸۷۔ بالِ جبریل ،ص۱۱۲۔
۸۸۔ شیشے کے گھر ،ص۲۶۰،۲۶۱۔
۸۹۔ بالِ جبریل ،ص۲۸۔
۹۰۔ کار جہاں دراز ھے ،جلداوّل،ص۴۰،۴۶۔
۹۱۔ آگ کا دریا ،ص۲۹۱۔
۹۲۔ ایضاً،ص۲۹۱۔
۹۳۔ بالِ جبریل ،ص۱۴۴۔
۹۴۔ شیشے کے گھر ،ص۱۹۵۔
۹۵۔ بانگِ درا ،ص۱۵۷۔

۹۶۔ آگ کا دریا،ص۲۹۱۔

۹۷۔ بانگِ درا ،ص۲۱۔

۹۸۔ شیشے کے گھر ،ص۱۶۷۔

۹۹۔ بانگِ درا ،ص۲۳۔

۱۰۰۔ شیشے کے گھر ،ص۱۶۷۔

۱۰۱۔ بانگِ درا ،ص۲۳۔

۱۰۲۔ شیشے کے گھر ،ص۱۷۵۔

۱۰۳۔ بانگِ درا ،ص۲۱۔

۱۰۴۔ تلمیحات اقبال ،ص۳۱۲۔

۱۰۵۔ کار جہاں دراز ،جلد دوم،ص۶۸،۷۰۔

۱۰۶۔ بالِ جبریل ،ص۲۱۔

۱۰۷۔ کار جہاں دراز ھے ،ص۷۳۔

۱۰۸۔ روحِ اقبال ،ص۲۹۔

۱۰۹۔ بال جبریل ،ص۱۰،۹۵۔

۱۱۰۔ گلگشت ،ص۲۶۔

۱۱۱۔ بالِ جبریل ،ص۹۴۔

۱۱۲۔ ستمبر کا چاند ،ص۱۸۴۔۱۸۳۔

۱۱۳۔ بالِ جبریل ،ص۱۱۳۔

۱۱۴۔ ستاروں سے آگے ،ص۱۱۷۔۱۱۶۔

۱۱۵۔ فصل گل آئی یا اجل آئی،ص۸۰۔

۱۱۶۔ بانگِ درا ،ص۴۷۔

۱۱۷۔ میرے بھی صنم خانے ،ص۳۔

۱۱۸۔ کار جہاں درازھے ،جلداوّل،ص۱۵۰۔

۱۱۹۔ پکچر گیلری ،ص۱۲۷۔

۱۲۰۔ ایضاً،ص۱۳۲۔

۱۲۱۔ کار جہاں درازھے ،جلد دوم،ص۳۱۲۔

۱۲۲۔ ایضاً،ص۱۳۸۔

۱۲۳۔ ایضاً،ص۱۳۴۔

۱۲۴۔ گلگشت، ص۱۲۱۔

۱۲۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۱۶۸۔

۱۲۶۔ ایضاً،ص۲۸۰۔

۱۲۷۔ پکچر گیلری ،ص۲۸۔

۱۲۸۔ گردش رنگ چمن ،ص۲۸۰۔

۱۲۹۔ فصل گل آئی یااجل آئی ،ص۶۷،۶۴۔

۱۳۰۔ ایضاً،ص۶۸۔

۱۳۱۔ ایضاً،ص۶۷۔۶۸۔

۱۳۲۔ ایضاً،ص۶۸۔۶۹۔

۱۳۳۔ ایضاً،ص۷۱۔

۱۳۴۔ آگ کا دریا ،ص۴۱۰۔

۱۳۵۔ ایضاً،ص۴۵۵۔

۱۳۶۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص۳۲۶۔

۱۳۷۔ ایضاً،ص۲۸۱۔

۱۳۸۔ ایضاً،ص۲۱۴،۲۵۱۔

۱۳۹۔ ذکر اقبال ،ص۹۳۔

۱۴۰۔ چار ناولٹ (سیتاہرن)،ص۱۷۵،۱۷۶۔

۱۴۱۔ اقبال نامہ ،حصہ دوم،ص۲۰۶۔

۱۴۲۔ حرف اقبال ،ص۱۰۱۔۱۰۲۔

۱۴۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص۲۹۴۔

۱۴۴۔ ایضاً،ص۲۷۶۔

۱۴۵۔ اقبال نامہ ،حصہ دوم،ص۷،۸۔

۱۴۶۔ مفکر پاکستان ،ص۳۵۳۔

۱۴۷۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۴۰۸۔

۱۴۸۔ **ایضاً، ص۳۵۷۔**

۱۴۹۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ، ص۴۸۴۔

۱۵۰۔ کار جہاں دراز ہے، **جلد دوم، ص۵۱، ۲۸۱۔۲۸۲۔**

۱۵۱۔ **ایضاً، جلد اوّل، ص۲۱۹۔**

۱۵۲۔ پاکستان ناگزیر تھا ، ص۸۵۔

۱۵۳۔ کار جہاں دراز ہے ، **جلد اوّل، ص۲۱۹۔**

۱۵۴۔ جنگ آزادی کے شعرا ، ص۲۸۹۔

۱۵۵۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی ، **حصہ اوّل، ص۲۵۵۔**

۱۵۶۔ زندہ رود ، **جلد سوم، ص۲۹۷۔**

۱۵۷۔ کار جہاں دراز ہے ، **جلد اوّل، ص۲۱۹، ۲۵۴۔**

۱۵۸۔ بانگ درا ، ص۱۷۸۔

۱۵۹۔ کار جہاں دراز ہے ، **جلد اوّل، ص۳۵۵۔**

۱۶۰۔ **ایضاً، ص۳۰۰۔**

۱۶۱۔ **ایضاً، ص۲۴۹۔**

۱۶۲۔ زندہ رود ، **جلد دوم، ص۲۵۰۔**

۱۶۳۔ اقبال نامہ ، **حصہ دوم، ص۱۵۹۔**

۱۶۴۔ کار جہاں دراز ہے ، **جلد اوّل، ص۲۱۹۔**

۱۶۵۔ بانگ درا ، ص۲۷۸۔

۱۶۶۔ کار جہاں دراز ہے ، **جلد اوّل، ص۲۱۸۔۲۱۹۔**

۱۶۷۔ بانگ درا ، ص۲۶۷، ۲۶۸۔

۱۶۸۔ کار جہاں دراز ہے ، **جلد اوّل، ص۲۱۹، ۲۷۲۔**

۱۶۹۔ ضرب کلیم ، ص۱۴۲۔

۱۷۰۔ شیشے کے گھر ، ص۲۶۱۔

۱۷۱۔ گلگشت، ص۲۶۱۔

۱۷۲۔ زندہ رود ، ص۱۔

۱۷۳۔ گلگشت، ص۱۴۰۔

۱۷۴۔ ارمغان حجاز ،ص۳۶۔

۱۷۵۔ کلیات اقبال، فارسی ،ص۳۲۸۔

۱۷۶۔ گلگشت ،ص۱۸۴۔

۱۷۷۔ ایضاً،ص۱۵۱۔۱۵۲۔

۱۷۸۔ ایضاً،ص۱۵۲۔

۱۷۹۔ زندہ رود ،جلد دوم،ص۲۵۷۔

۱۸۰۔ گلگشت ،ص۱۴۸،۱۶۱۔

۱۸۱۔ ارمغان حجاز ،ص۳۶۔

۱۸۲۔ ایضاً، ص۴۱۔

۱۸۳۔ جاوید نامہ ،ص۱۶۲۔

۱۸۴۔ گلگشت ،ص۱۴۴۔

۱۸۵۔ اقبال اور کشمیر ،ص۱۳۷۔۱۳۸۔

۱۸۶۔ جاوید نامہ ،ص۲۔

۱۸۷۔ گلگشت ،ص۱۴۵۔

۱۸۸۔ پیام مشرق ،ص۱۱۵۔

۱۸۹۔ گلگشت ،ص۱۸۰۔

۱۹۰۔ ایضاً،ص۱۸۰۔۱۸۱۔

۱۹۱۔ پیام مشرق ،ص۱۱۶۔

۱۹۲۔ گلگشت، ص۱۶۱،۱۶۵۔

۱۹۳۔ ارمغانِ حجاز (اردو)،ص۳۸۔

۱۹۴۔ ایضاً،ص۴۱۔

۱۹۵۔ گلگشت ،ص۱۸۷۔

۱۹۶۔ ایضاً،ص۱۷۸،۱۸۶۔

۱۹۷۔ ارمغانِ حجاز ،ص۳۸۔

۱۹۸۔ گلگشت ،ص۱۸۲۔

۱۹۹۔ ایضاً،ص۱۵۵۔

۲۰۰۔ ایضاً،ص ۱۵۶۔

۲۰۱۔ کلیات اقبال،فارسی،ص ۶۴۷۔

۲۰۲۔ گلگشت،ص ۱۵۶۔

۲۰۳۔ پیام مشرق ،ص ۳۰۲۔

۲۰۴۔ گلگشت،ص ۱۵۸۔

۲۰۵۔ کلیات اقبال،فارسی،ص ۴۸۶۔

۲۰۶۔ آگ کا دریا ،ص ۳۸۹۔

۲۰۷۔ شیشے کے گھر ،ص ۲۶۶۔

۲۰۸۔ آگ کا دریا ،ص ۵۰۲۔

۲۰۹۔ حرف اقبال ،ص ۱۳۲۔

۲۱۰۔ ایضاً،ص ۱۵۸۔

۲۱۱۔ بانگِ درا ،ص ۱۶۴۔

۲۱۲۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص ۱۶۱۔

۲۱۳۔ زندہ رود ،جلد سوم،ص ۵۹۹۔

۲۱۴۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص ۲۷۶۔

۲۱۵۔ زندہ رود ،جلد سوم،ص ۵۷۰۔

۲۱۶۔ ایضاً،ص ۵۷۰۔

۲۱۷۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۳۵۵،۳۵۶۔

۲۱۸۔ ایضاً،ص ۵۷۔۳۵۶۔

۲۱۹۔ ایضاً،ص ۱۵۹۔

۲۲۰۔ پیام مشرق ،ص ۱۸۵۔

۲۲۱۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۴۲۹۔

۲۲۲۔ ایضاً،ص ۲۰۵،۲۶۰۔

۲۲۳۔ مقالاتِ اقبال،ص ۲۶۰،۲۶۱۔

۲۲۴۔ بانگِ درا ،ص ۲۷۰۔

۲۲۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۲۲۰۔

۲۲۶۔ ضرب کلیم ،ص۱۶۴،۱۶۸۔

۲۲۷۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۱۵۰،۲۱۹۔

۲۲۸۔ ضرب کلیم ،ص۱۶۶۔

۲۲۹۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۱۵۰۔

۲۳۰۔ حرف اقبال ،ص۲۲۹۔

۲۳۱۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص۲۱۵۔

۲۳۲۔ زندہ رود ،جلد سوم،ص۵۱۸۔

۲۳۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۲۰۵۔

۲۳۴۔ کلیات اقبال،فارسی،ص۱۸۸۔

۲۳۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۱۵۱۔۱۵۲۔

۲۳۶۔ جہاں دیگر ،ص۱۸۔

۲۳۶۔ ایضاً،ص۱۸۔

۲۳۷۔ ایضاً،ص۱۷۔

۲۳۸۔ اقبال نامہ ،حصہ دوم،ص۳۲۱۔

۲۳۹۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص۳۳۵۔

۲۴۰۔ اقبال کامل،ص۴۱،۴۳۔

۲۴۱۔ بالِ جبریل ،ص۱۰۱۔

۲۴۲۔ ادبِ لطیف ،ص۴۸۔

۲۴۳۔ بالِ جبریل ،ص۱۰۵۔

۲۴۴۔ قرۃالعین حیدر کے بہترین افسانے ،ص۴۴۔

۲۴۵۔ اقبال نامہ ،جلد دوم،ص۳۲۱۔

۲۴۶۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص۱۳۰۔۱۳۸۔

۲۴۷۔ ادبِ لطیف ،ص۴۷۔۴۶۔

۲۴۸۔ اپنی آگ کی تلاش میں،ص۲۲،۲۳۔

۲۴۹۔ جہاں دیگر ،ص۳۶۔

۲۵۰۔ گلگشت،ص۲۶۔

۲۵۱۔ آگ کا دریا ،ص۳۱۸۔

۲۵۲۔ چار ناولٹ (سیتا ہرن)،ص۱۸۶۔

۲۵۳۔ **ایضاً،ص۱۷۵۔**

۲۵۴۔ ستمبر کا چاند ،ص۱۸۳۔۱۸۴۔

۲۵۵۔ گردش رنگ چمن ،ص۵۵۴۔

۲۵۶۔ آگ کا دریا ،ص۱۰۸۔

۲۵۷۔ مفکر پاکستان ،۱۹۱۔

۲۵۸۔ کار جہاں دراز ھے ،**جلد اوّل،ص۲۴۹۔**

۲۵۹۔ **ایضاً،ص۱۸۸۔**

۲۶۰۔ ضرب کلیم ،ص۱۵۹،۱۶۰۔

۲۶۱۔ کار جہاں دراز ھے ،**جلد اوّل،ص۲۲۰۔**

۲۶۲۔ گفتار اقبال ،ص۱۴۵۔

۲۶۳۔ جہان دیگر ،ص۱۴۔

۲۶۴۔ **ایضاً،ص۱۵۔**

۲۶۵۔ بالِ جبریل ،ص۲۳۔

۲۶۶۔ کوہ دماوند ،ص۱۲۷۔

۲۶۷۔ بالِ جبریل ،ص۲۱۔

۲۶۸۔ کوہ دماوند ،ص۶۹،۷۰۔

۲۶۹۔ بانگِ درا ،ص۱۶۷۔

۲۷۰۔ گلگشت،ص۲۶۔

۲۷۱۔ کوہ دماوند ،ص۷۱۔

۲۷۲۔ ضرب کلیم ،ص۱۴۷۔

۲۷۳۔ **ایضاً،ص۱۴۲۔**

۲۷۴۔ کوہ دماوند ،ص۷۲۔۷۳۔

۲۷۵۔ جاوید نامہ ،ص۱۷۴۔

۲۷۶۔ بانگ درا ،ص۱۸۲۔

۲۷۷۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۱۳۵۔

۲۷۸۔ ضرب کلیم ،ص ۶۰۔

۲۷۹۔ کوہ دماوند ،ص ۲۳۔

۲۸۰۔ ایضاً،ص ۱۲۷۔

۲۸۱۔ فنون ،ص ۲۔

۲۸۲۔ زندہ رود ،جلد سوم،ص ۳۶۴۔

۲۸۳۔ کلیات اقبال،فارسی،ص ۳۷۷۔

۲۸۴۔ چاندنی بیگم ،ص ۳۶۷۔

۲۸۵۔ ایضاً،ص ۳۶۷،۳۶۸۔

۲۸۶۔ زندہ رود ،جلد سوم،ص ۳۶۵۔

۲۸۷۔ چاندنی بیگم ،ص ۳۶۹،۳۹۰۔

۲۸۸۔ جاوید نامہ ،ص ۶۰۷۔

۲۸۹۔ چاندنی بیگم ،ص ۳۸۶۔

۲۹۰۔ بالِ جبریل ،ص ۱۰۵۔

۲۹۱۔ چاندنی بیگم ،ص ۳۷۷۔

۲۹۲۔ حرف اقبال ،ص ۱۵۴۔

۲۹۳۔ جاوید نامہ ،ص ۱۴۲۔

۲۹۴۔ چاندنی بیگم ،ص ۳۸۵۔

۲۹۵۔ اقبال نامہ ،حصہ دوم،ص ۹۲۔

۲۹۶۔ چاندنی بیگم ،ص ۳۷۴،۳۸۱۔

۲۹۷۔ اردو میں انشائیہ نگاری ،ص ۱۱۵۔

۲۹۸۔ تنقیدی مطالعے ،ص ۱۸۴۔

۲۹۹۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۱۸۴،۳۳۸۔

۳۰۰۔ موج کوثر ،ص ۲۱۸۔

۳۰۱۔ تنقیدی مطالعے ،ص ۱۸۵۔

۳۰۲۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص ۲۵۵۔

۳۰۳۔ ایضاً،ص ۳۴۷۔
۳۰۴۔ ایضاً،جلد دوم،ص ۶۲، ۳۱۹۔
۳۰۵۔ ایضاً،جلد اوّل،ص ۳۲۵۔۳۲۶۔
۳۰۶۔ ایضاً،جلد اوّل،ص ۲۳۲۔۲۳۳۔
۳۰۷۔ بانگِ درا ،ص ۲۹۰۔
۳۰۸۔ آگ کا دریا ،ص ۲۹۲۔
۳۰۹۔ ایضاً،ص ۲۹۳۔
۳۱۰۔ ضرب کلیم ،ص ۸۶۔
۳۱۱۔ بانگِ درا ،ص ۳۸۳۔
۳۱۲۔ بال جبریل ،ص ۳۲، ۴۶۔
۳۱۳۔ بانگ درا ،ص ۲۸۳۔
۳۱۴۔ پت جھڑ کی آواز ،ص ۱۶۲۔
۳۱۵۔ ایضاً،ص ۱۶۲۔
۳۱۶۔ ایضاً،ص ۱۶۲۔
۳۱۷۔ بانگ درا ،ص ۲۶۹۔
۳۱۸۔ روشنی کی رفتار ،ص ۶۴۔
۳۱۹۔ بانگ درا ،ص ۲۷۱۔
۳۲۰۔ ادبِ لطیف ،ص ۳۶۔
۳۲۱۔ ایضاً،ص ۳۷۔
۳۲۲۔ بانگِ درا ،ص ۱۶۵۔
۳۲۳۔ ادبِ لطیف ،ص ۳۷، ۴۷۔
۳۲۴۔ بانگِ درا ،ص ۲۶۵۔
۳۲۵۔ ادبِ لطیف ،ص ۴۵۔
۳۲۶۔ بانگِ درا ،ص ۲۷۵۔
۳۲۷۔ ادبِ لطیف ،ص ۳۸۔
۳۲۸۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص ۲۵۹۔

۳۲۹۔ ستاروں سے آگے ،ص۹۷۔
۳۳۰۔ فصل گل آئی یا اجل آئی ،ص۷۶۔
۳۳۱۔ شیشے کے گھر ،ص۳۰۵۔۳۰۴۔
۳۳۲۔ کار جہاں دراز ھے ،جلداوّل،ص۱۹۶، ۱۹۷۔
۳۳۳۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ،ص۹۵۔
۳۳۴۔ ضرب کلیم ،ص۱۶۔۱۵۔
۳۳۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلداوّل،ص۴۴، ۲۱۹۔
۳۳۶۔ ضرب کلیم ،ص۲۵۔
۳۳۷۔ قرۃالعین حیدر کے بہترین افسانے ،ص۲۰۔
۳۳۸۔ کلیات اقبال، فارسی،ص۱۰۱۔
۳۳۹۔ ایضاً،ص۱۰۲۔
۳۴۰۔ بانگِ درا ،ص۲۰۸۔
۳۴۱۔ گلگشت، ص۱۸۴۔
۳۴۲۔ ایضاً،ص۱۸۶، ۱۶۶۔
۳۴۳۔ ایضاً،ص۱۷۰۔
۳۴۴۔ کار جہاں دراز ھے ،جلداوّل،ص۹۹۔
۳۴۵۔ بال جبریل ،ص۳۱۔
۳۴۶۔ کار جہاں دراز ھے ،جلددوم،ص۷۰۔
۳۴۷۔ ایضاً،ص۳۹۲۔
۳۴۸۔ میرے بھی صنم خانے ،ص۱۶۔۱۵۔
۳۴۹۔ اردو ناول میں طنز ومزاح ،ص۳۳۰۔
۳۵۰۔ فصل گل آئی،ص۴۱۔
۳۵۱۔ آگ کا دریا ،ص۱۲، ۱۳۔
۳۵۲۔ بال جبریل ،ص۹۴۔
۳۵۳۔ ستمبر کا چاند، ص۱۸۳۔۱۸۴۔
۳۵۴۔ فکرو تحقیق ،ص۸۴۔

۳۵۵۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ،ص۸۸۔

۳۵۶۔ آگ کا دریا ،ص۲۲۷۔

۳۵۷۔ بال جبریل ،ص۹۳۔

۳۵۸۔ قرۃالعین حیدر کا فن ،ص۱۳۹۔

۳۵۹۔ کلیات اقبال،فارسی،ص۱۷۔

۳۶۰۔ آگ کا دریا ،ص۵۹۔

۳۶۱۔ کلیات اقبال،فارسی،ص۱۷۔

۳۶۲۔ بال جبریل ،ص۹۳۔

۳۶۳۔ چار ناولٹ (سیتا ھرن)، ص۵۹۔

۳۶۴۔ قرۃالعین حیدر کا فن ،ص۱۷۴۔

۳۶۵۔ آخر شب کے ھمسفر ،ص۳۶۰۔

۳۶۶۔ کلیات اقبال،فارسی،ص۲۷۔

۳۶۷۔ گردش رنگ چمن ،ص۵۹۶۔

۳۶۸۔ کار جہاں دراز ھے ،ص۲۱۹۔

۳۶۹۔ ضرب کلیم ،ص۴۱۔

۳۷۰۔ قرۃالعین حیدر ایک مطالعہ ،ص۳۱۴،۳۴۲۔

۳۷۱۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل ،ص۴۴۳۔

۳۷۲۔ کلیات اقبال،فارسی،ص۱۶۷،۸۷۰۔

۳۷۳۔ چار ناولٹ ،ص۱۷۵۔

۳۷۴۔ شیشے کے گھر ،ص۲۲۲۔

۳۷۵۔ بانگِ درا ،ص۱۵۱۔

۳۷۶۔ چاندنی بیگم ،ص۲۳۵۔

۳۷۷۔ فصل گل آئی یا اجل آئی،ص۶۰۔

۳۷۸۔ گلگشت،ص۱۸۹۔

۳۷۹۔ بانگ درا ،ص۲۳۰۔

۳۸۰۔ مقالاتِ اقبال،ص۲۵۳۔

۳۸۱۔ شیشے کے گھر ،ص۱۲۰۔

۳۸۲۔ بانگِ درا ،ص۵۸۔

۳۸۳۔ فصل گل آئی یا اجل آئی ،ص۷۹۔

۳۸۴۔ قرۃالعین حیدر کے بہترین افسانے ،ص۵۸،۶۳۔

۳۸۵۔ بالِ جبریل ،ص۳۲۔

۳۸۶۔ پت جھڑ کی آواز ،ص۱۶۲۔

۳۸۷۔ کلیات اقبال،اردو،ص۲۰۹۔

۳۸۸۔ میرے بھی صنم خانے ،ص۳۸۔

۳۸۹۔ بالِ جبریل ،ص۴۶۔

۳۹۰۔ بانگِ درا ،ص۱۸۷۔

۳۹۱۔ فصل گل آئی یا اجل آئی ،ص۱۵۔

۳۹۲۔ بانگِ درا ،ص۲۸۳۔

۳۹۳۔ کار جہاں دراز ھے ،ص۲۱۷۔

۳۹۴۔ شیشے کے گھر ،ص۲۸۷۔

۳۹۵۔ گردش رنگ چمن ،۲۶۱۔۲۶۲۔

۳۹۶۔ ضرب کلیم ،ص۱۲۹۔

۳۹۷۔ کار جہاں دراز ھے ،ص،۱۶۹۔

۳۹۸۔ بانگِ درا ،ص۲۱۴۔

۳۹۹۔ کار جہاں دراز ھے ،جلداوّل،ص۱۷۴۔

۴۰۰۔ بالِ جبریل ،ص۱۴۔

۴۰۱۔ کلیات اقبال،فارسی،ص۱۵۰۔

۴۰۲۔ ایضاً،ص۹۷۵۔

۴۰۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلداوّل،ص۴۲۸۔

۴۰۴۔ کلیات اقبال،فارسی،ص۱۵۳،۹۷۶۔

۴۰۵۔ پت جھڑ کی آواز ،ص۲۷،جہاں دیگر ،ص۱۴۱۔

۴۰۶۔ ضرب کلیم ،ص۹۴۔

۴۰۷۔ پت جھڑ کی آواز ،ص ۱۱۶۔

۴۰۸۔ ضرب کلیم ،ص ۱۹۵۔

۴۰۹۔ پت جھڑ کی آواز ،ص ۱۱۶۔

۴۱۰۔ ضرب کلیم ،ص ۸۳۔

۴۱۱۔ پت جھڑ کی آواز ،ص ۲۸۷۔

۴۱۲۔ شیشے کے گھر، ص ۱۷۷۔

۴۱۳۔ ضرب کلیم ،ص ۹۳۔

۴۱۴۔ **ایضاً،ص ۹۳،۹۴۔**

۴۱۵۔ جہان دیگر ،ص ۱۴۶۔

۴۱۶۔ پت جھڑ کی آواز ،ص ۲۵۔

۴۱۷۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ،ص ۲۶۳۔

۴۱۸۔ جہان دیگر ،ص ۱۴۵،۱۴۶۔

۴۱۹۔ بانگ درا ،ص ۲۱۔

۴۲۰۔ اقبال نئی تشکیل ،ص ۱۸۔

۴۲۱۔ بانگِ درا ،ص ۴۲۔

۴۲۲۔ **ایضاً،ص ۸۳۔**

۴۲۳۔ **ایضاً،ص ۷۰۔**

۴۲۴۔ **ایضاً،ص ۸۷۔**

۴۲۵۔ **ماہنامہ** نصرت، **فروری ۱۹۶۴ء،ص ۱۴،۱۵۔**

۴۲۶۔ چارناولٹ (سیتا ہرن) ،ص ۱۸۰۔

۴۲۷۔ **ایضاً،ص ۱۸۳۔**

۴۲۸۔ بانگِ درا ،ص ۲۴۸۔

۴۲۹۔ آگ کا دریا ،ص ۴۹۸۔

۴۳۰۔ بانگِ درا ،ص ۱۵۹۔

۴۳۱۔ **ایضاً،ص ۱۶۰۔**

۴۳۲۔ چار ناولٹ (چائے کے باغ) ،ص ۲۲۶۔

۴۳۳۔ بانگ درا ،ص۱۳۳۔

۴۳۴۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۲۶۲۔

۴۳۵۔ ایضاً،ص۲۵۲،۲۵۳۔

۴۳۶۔ بانگ درا ،ص۲۶۴۔

۴۳۷۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۲۲۰۔

۴۳۸۔ بانگ درا ،ص۲۶۵۔

۴۳۹۔ ایضاً،ص۲۷۰۔

۴۴۰۔ ایضاً،ص۲۷۳۔

۴۴۱۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۲۱۸،۲۲۰۔

۴۴۲۔ بال جبریل ،ص۴۷۸۔

۴۴۳۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۲۱۹۔

۴۴۴۔ بانگ درا ،ص۴۵۷۔

۴۴۵۔ آگ کا دریا ،ص۴۵۴،۵۵۸۔

۴۴۶۔ کلیات اقبال،فارسی،ص۳۰۷،۳۳۷۔

۴۴۷۔ آگ کا دریا ،ص۱۷۵،کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص۳۱۸۔

۴۴۸۔ قرۃالعین حیدر کے بہترین افسانے ،ص۲۴۔

۴۴۹۔ انتخابات سجاد حیدر یلدرم ،ص۳۷۔

۴۵۰۔ کلیات اقبال،اردو،ص۳۲۷۔

۴۵۱۔ چاندنی بیگم ،ص۴۷۔

۴۵۲۔ ستاروں سے آگے ،ص۷۔

۴۵۳۔ اردو ناول میں مسلم ثقافت ،ص۳۲۳۔

۴۵۴۔ قرۃالعین حیدر کے بہترین افسانے (دیباچہ)،ص۱۸۔

۴۵۵۔ شیشے کے گھر ،ص۱۸۸،۱۸۹۔

۴۵۶۔ فکر و تحقیق ،ششماہی،ص۸۴۔

۴۵۷۔ بانگِ درا ،ص۲۳۔

۴۵۸۔ شیشے کے گھر ،ص۱۷۴۔۱۷۵۔

۴۵۹۔ بانگ درا ،ص۲۲۔

۴۶۰۔ میرے بھی صنم خانے ،ص۱۶۔۱۷۔

۴۶۱۔ بانگِ درا ،ص۸۵۔

۴۶۲۔ ستاروں سے آگے ،ص۱۰۰۔

۴۶۳۔ بانگ درا ،ص۱۹۲۔

۴۶۴۔ مطالب بانگ درا ،ص۲۶۰،۲۶۱۔

۴۶۵۔ بانگِ درا ،ص۲۵۶۔

۴۶۶۔ ۲+۲=۵ ص۴۵۷۔

۴۶۷۔ ستاروں سے آگے ،ص۱۰۲۔

۴۶۸۔ انتخابات سجاد حیدر یلدرم ،ص۶۵۔

۴۶۹۔ کلیات اقبال، فارسی ،۷۸۲۔

۴۷۰۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۱۰۴۔

۴۷۱۔ ایضاً، اوّل،ص۲۱۹۔

۴۷۲۔ بانگ درا ،ص۲۶۰،۲۶۱۔

۴۷۳۔ جہان دیگر ،ص۱۴۱۔

۴۷۴۔ بالِ جبریل ،ص۱۲۳۔

۴۷۵۔ زبور عجم ،ص۹۴۔

۴۷۶۔ گلگشت، ص۱۶۵۔

۴۷۷۔ ایضاً،ص۱۶۵۔

۴۷۸۔ ایضاً،ص۱۶۱۔

۴۷۹۔ بالِ جبریل ،ص۱۱۰۔

۴۸۰۔ چاندنی بیگم ،ص۱۰۔

۴۸۱۔ ایضاً،ص۱۴۔

۴۸۲۔ بالِ جبریل ،ص۱۱۹۔

۴۸۳۔ چاندنی بیگم ،ص۱۷۶۔

۴۸۴۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد دوم،ص۳۶۰۔

۴۸۵۔ بالِ جبریل ،ص ۱۰۸۔

۴۸۶۔ گلگشت ،ص ۳۹۔

۴۸۷۔ جاوید نامہ ،ص ۶۴۔

۴۸۸۔ ستاروں سے آگے ،ص ۹۴۔

۴۸۹۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل ،ص ۳۶۵۔

۴۹۰۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ،ص ۱۸، ۱۹۔

۴۹۱۔ آگ کا دریا ،ص ۴۴۴۔

۴۹۲۔ اقبال نامہ ،حصہ دوم ،ص ۱۵، ۱۷۔

۴۹۳۔ آگ کا دریا ،ص ۲۷۶، ۲۷۷۔

۴۹۴۔ اقبال نامہ ،حصہ دوم ،ص ۳۱۴۔

۴۹۵۔ شیشے کے گھر ،ص ۱۷۷۔

۴۹۶۔ آگ کا دریا ،ص ۵۲۳۔

باب سوم

ادیبہ مشرق پر شاعرِ مشرق کے اثرات

علامہ اقبال کی شخصیت ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ جن کی شخصیت، فن اور شاعری کی تفہیم کے لیے اقبالیات کی اصطلاحیں بھی وضع ہو چکیں ہیں اور بلا شبہ ان کے شخص و عکس اور فکر و فن کے تناظر میں بہت سے ادبا نے اقبال کی زندگی ہی میں تحریر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم نے علامہ اقبال پر ایک مضمون ''ایک نیا ستارہ......اقبال'' سب سے پہلے تحریر کیا اور ''سب سے پہلے سجاد حیدر کی قدر شناس نگاہوں نے اقبال کی عظمت کو بے نقاب کیا۔'' اور بعد ازاں عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی عبدالرزاق، مولانا محمد اسلم جیراج پوری کے مضامین بعد میں تحریر ہوئے۔ ہم عصر شعرا میں سرور جہاں آبادی نے ایک نظم ''پروفیسر اقبال'' تحریر کی۔ نادر کاکوروی، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، صوفی غلام مصطفٰے تبسم، حسرت موہانی، علی سردار جعفری، احسان دانش اور پنڈت آنند نرائن ملا پر اقبال کے اثرات نمایاں ملتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے ایک تصنیف اقبال میں علامہ اقبال پر دو نظمیں تحریر کیں۔ مخدوم محی الدین نے بھی ''اقبال'' کے عنوان سے نظم لکھی۔ شعرا کی مانند اردو ناول نگار اور افسانہ خواں بھی علامہ اقبال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

جن میں ایم اسلم نے مشرقی اقدار کو محفوظ کرنے کی غرض سے ناول تحریر کیے۔ زوال الحمرا اور رقصِ ابلیس واضح طور پر آپ اپنی مثال ہیں۔ نسیم حجازی، (محمد شریف ۱۹۱۴ء) نے محمدبن قاسم ،خاک و خون ،یوسف بن تاشفین ،شاہین اور داستان مجاہد شائع کر کے تاریخ اسلام کے کردار و واقعات کی روشنی میں شجاعت، جرأت، اور صداقت کی خصوصیات والے کردار پیش کیے۔ رشید اختر ندوی نے اپنے ناولوں مسلمان اندلس میں اور صلاح الدین ایوبی میں مسلمانوں کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے اسلامی تاریخ سے ہم

آہنگ کرتے ہوئے علامہ اقبال کے اثرات کو نمایاں کیا۔

علامہ اقبال سے متاثر ہونے کے سلسلہ میں جب بڑے بڑے ادبا و شعرا اس کارمیدان میں اترے تو ادبی گھرانے سے متعلقہ قرۃ العین حیدر اپنے والد محترم کے زیر اثر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور اس کارِمیدان میں اُتر آئیں۔ یہ دور نہ صرف برِصغیر بلکہ عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا اور سیاسی، معاشی ابتری کا شکار تھا۔ علامہ اقبال نے ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مسلم قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کاوش کی اور یہ سلسلہ بیسویں صدی کے تقریباً نصف قبل تک جاری رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بیسویں صدی کے نصف بعد میں مسلم قوم کو علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں خوابِ غفلت سے جگانے کی زبردست کاوش کی۔

قرۃ العین حیدر نے کم سنی ہی میں علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے آگاہی اپنے والدین کے طفیل پائی۔ یلدرم اکثر گھر میں کلام اقبال گنگناتے رہتے جس سے قرۃ العین حیدر نہ صرف علامہ اقبال کے کلام سے واقف ہوئیں بلکہ ان کے اندر اسلامی دنیا کی خصوصیات جان کر ایک جذبہ ایمانی اور جوش و خروش پیدا ہوا۔

اقبال کے بعض اشعار جو ابا جان گنگناتے انھیں سن کر پھریری سی آتی۔ ''وہ ترے شہدا پالنے والی دنیا۔ عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا''، اور ''ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا''۔[۱]

اسی طرح گھر میں ان کی والدہ نذر سجاد بھی کلام اقبال گنگناتی رہتی تھیں۔

اور امّاں کبھی کبھی گنگناتیں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں''۔[۲]

قرۃ العین حیدر نے گھریلو ماحول اور وقت کے تقاضے کے مطابق علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ستاروں سے آگے ایک افسانوی مجموعہ ۱۹۴۷ء میں شائع کیا جس کا نام اقبال کے اس شعر سے ماخذ ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں[۳]

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانوی مجموعہ رومانیت پر مبنی ہے جس میں ایک افسانہ کا عنوان ''سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا''۔ علامہ اقبال کے رومانوی دور کی ایک نظم ''محبت'' کے ایک مصرع سے ماخوذ ہے۔ جس میں حسن و عشق کا رومانی تصور علامہ اقبال کے فلسفیانہ افکار کی جھلک پیش کرتا ہے اور اقبال کی مانند انھوں نے اپنے فن کا آغاز بھی رومانی اثرات کے زیر اثر کیا ہے۔

میرے بھی صنم خانے ،کار جہاں دراز ھے یہ دونوں ناول علامہ اقبال کے اشعار سے ماخذ کردہ عنوانات کے تحت تحریر کیے گئے۔کار جہاں درازھے کے بیشتر ابواب بھی علامہ اقبال کے اشعار کے مصرعوں کی دین ہیں۔جن میں ’’نہ صفاہاں، نہ سمرقند، ’’تارحریر دورنگ‘‘ ’’سلسلہ روز وشب‘‘، ’’پھر چراغ لالہ‘‘، ’’تیرے شب وروز کی اور حقیقت ہے کیا‘‘؟ شامل ہیں۔اسی طرح ان کی تصنیف گلگشت کے حصہ دوم میں جوان کا سفرنامہ کشمیر کے متعلق ہے۔اس سفرنامہ میں انھوں نے علامہ اقبال کی زبان میں کشمیر کی صورت حال بیان کی ہے۔اس تصنیف کے ابواب بھی کار جہاں دراز ھے کی مانند علامہ اقبال کے اشعار سے اخذ کئے گئے ہیں۔جن میں ’’کوہ کے دامن میں غم خانہ دہقان پیر‘‘، ’’خانقاہِ معلیٰ کے مجاہد‘‘اور’’رخت با کا شمر کشا‘‘ ہیں۔قرۃ العین حیدر کا ایک اور سفرنامہ کوہ دماوند کا نام بھی علامہ اقبال کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔ان کا ایک افسانہ یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے کا عنوان بھی علامہ اقبال کی نظم’’طارق کی دعا‘‘ سے ماخوذ ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے افکار ونظریات کے اظہار کے لیے اپنی تصانیف میں علامہ اقبال کے افکار ونظریات، اور تلفظوں کا سہارا لیا ہے جومختلف اشعار کے مصرعوں کا حصہ ہیں۔جن میں ’’مجھے ہے حکم اذاں‘‘، ’’ناامید نہ ہو‘‘ ’’نہ تن تیرا نہ من‘‘، ’’مجھے شیخ و برہمن‘‘، ’’اے طائر لاہوتی‘‘، ’’پھر چراغ لالہ‘‘، ’’جہانِ نو‘‘اور’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ وغیرہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر بڑا ادیب بننے کی خواہش میں اقبال کے مصرعے، الفاظ، علامات و اصطلاحات بڑی خوبصورتی سے استعمال کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔جن میں ’’شاہین‘‘، ’’خون جگر‘‘، ’’قلندر‘‘، وغیرہ ہیں۔انھوں نے اپنی نثر بھی نظم کے روپ میں علامہ اقبال کے افکار کے تصور میں تحریر کی جو انھوں نے کھوئے ہوؤں کی جستجو کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے، اپنے آپ کو بہترین نثر نگار کے زمرے میں پیش کیا۔

میں ایک بڑی سحر طراز افسانہ نگار ہوں۔جی ہاں، جی ہاں۔خوب مس حیدر آپ کی تو نثر میں بھی نظم کی سی حلاوت، روانی اور لچک ہے......میرے کھوئے ہوئے۔[۴]

قرۃ العین حیدر کا طرز تحریر علامہ اقبال کے افکار کا مرہونِ منت ہے مگر لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ اس سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر پاتی ہیں۔لہٰذا وہ اقبال کے افکار کی روشنی میں جہانِ نو کی تلاش میں کوشاں نظر آتی ہیں۔

تو کہاں سے لاؤں جدت؟ جو کام یا بات بھی شروع کروں وہ مجھ سے پہلے پچپن کروڑ دفعہ ہو چکی ہوگی۔اب تمہارے لیے جہانِ نو پیدا کیا جائے۔بالکل نئے اور انوکھے کردار اس میں آئیں۔[۵]

قرۃ العین حیدر نے ''جہانِ نو پیدا'' کرنے کی غرض سے نئے اور انوکھے کردار کی صورت میں بعض اوقات علامہ اقبال کے مسلسل اشعار کے اشعار کا تذکرہ ہو بہو کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر اپنی نگارشات میں اقبال کے افکار کو اس قدر زیرِ قلم لائیں ہیں کہ اقبال کے اشعار، مصرعے اور تلفظ ان کا اپنا اسلوب نگارش معلوم ہوتا ہے بلکہ بقول پروفیسر فتح محمد ملک۔

اقبال قرۃ العین کے خون میں بولنے لگتا ہے اور عہد در عہد صدیاں پھر سے زندہ ہو کر ان کے کانوں میں ایسا طلسم پھونکتی ہیں کہ ہر واقعہ سراسر حیرت اور تنبیہ الغافلین نظر آتا ہے اور وہ اپنی تمام تر جلاوطنیوں اور ہجرتوں کے سبب اسلام پر ملوکیت کے غلبے میں دیکھتی ہیں۔[۶]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار سے متاثر ہو کر اپنی تصانیف میں تقلید یا پیروی نہیں کی بلکہ ادبی میدان میں بڑا ادیب بننے کی تمنا میں ملتِ اسلامیہ اور بالخصوص پاکستانی عوام کو اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں جدوجہد کے لیے جذباتی طور پر ابھارہ ہے اور ان کی بے حسی دیکھ کر مذمت کرتے ہوئے تمسخر بھی اڑایا ہے۔ انھیں ملت اسلامیہ کی کسمپرسی، بدحالی پر علامہ اقبال کی مانند رونا آتا ہے اور بعض اوقات وہ اس قدر مایوسیت کا شکار بھی ہو جاتی ہیں اور پھر کبھی کبھی ایک انہونی سی امید بھی ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ مسلم قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی غرض سے علامہ اقبال کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں احساس دلاتی ہیں۔ یہ احساس حوصلہ افزائی اور تمسخر کی صورت میں نمایاں نظر آتا ہے۔ جس بنا پر وہ علامہ اقبال کے افکار سے متاثر ہو کر ان کی اشاعت کرنا مقصدِ حیات تصور کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کی اقبال شناسی پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بالخصوص ایسے کام کا بھی ذکر کیا ہے جو علامہ اقبال کی وفات کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچا۔

قرۃ العین حیدر نے ملتِ اسلامیہ کے اندر احساس اُجاگر کرنے کے لیے افکارِ اقبال کے مطالعہ کو بنیادی حیثیت دی ہے تاکہ وہ زندہ قوم بن کر جی سکیں۔ یہی احساس علامہ اقبال کے ہاں شدت سے موجود ہے جو انھوں نے ملت اسلامیہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی غرض سے بیسویں صدی کے نصف اوّل میں تحریر کیا۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں یہی احساسات اقبال کے افکار کی روشنی میں بیسویں صدی کے نصف ثانی میں مسلم قوم کو جگانے کی صورت میں تحریر کیے ہیں اور علامہ اقبال کے افکار اور نظریات کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہوئے مسلم قوم کو افکار اقبال کا مطالعہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

اسرار خودی پڑھو، رموز بے خودی پڑھو، اگر قرآن پڑھنے کی توفیق نہ ہو تو اقبال کا

مطالعہ کرو۔[۷]

علامہ اقبال کے ہاں تاریخیت ایک اہم مقام رکھتی ہے جس بنا پر ان کے نزدیک تاریخ بحیثیت ماضی کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ درسِ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد اسلم انصاری:

اقبال ایک عظیم شاعر ہے جس نے تخلیقی عمل تاریخ کے ساتھ وابستہ کیا۔ ان کی شاعری میں تاریخ براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اقبال مسجد قرطبہ میں تاریخیت سے کہیں زیادہ تخلیقیت کا سفر کرتے ہیں۔ وہ انسان کو تاریخ کے فریم ورک میں رکھ کر کائنات سے ماورا لے جانا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تخلیقی عمل اتنا حقیقی ہو کہ وہ مستقبل کو بدل ڈالے۔[۸]

مندرجہ بالا حقیقت کو قرۃ العین حیدر نے قبول کیا اور انھوں نے اپنی تصانیف میں تاریخ کا بیان ماضی اور مستقبل کے باہم تعلق اور ملاپ کے ساتھ بیان کیا ہے چنانچہ وہ حوالہ تو تاریخ سے لیتی ہیں مگر جزئیات علامہ اقبال کے افکار ونظریات اور اشعار سے ظاہر کرتی ہیں۔ جس کے لیے انھوں نے تاریخ کے کئی ادوار، تاریخ سے وابستہ کرتے ہوئے کئی واقعات، اشخاص اور تاریخی ارتقا کے کئی مدارج سے بندھی ہوئی وارداتوں اور تہذیبوں کو ایک نئی تخلیقی شکل دینے کی ایک کامیاب کاوش کی ہے۔ اس سلسلہ میں وسط ایشیا کی اسلامی تاریخ، ہندوستانی تہذیب کے سلاطین اور مغلوں کے زمانے کے ہنداسلامی تہذیب، برطانوی انڈیا کے دور سے وابستہ ہندیورپی تہذیب، بالخصوص اسلامی ممالک عرب، ترکی، ایران، ہسپانیہ، مصر، فلسطین کی بھی اپنی اپنی انفرادیت قائم کرنے کا احاطہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے افکارِ اقبال کی روشنی میں احساس دلایا ہے کہ مسلمانوں کو زوال کی پستی میں ڈوب کر بھی یہ فکر لاحق نہیں ہوئی کہ انھیں کس بنا پر ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرنی پڑ رہی ہے۔

صد حیف کہ جب جہان نو پیدا ہونے کی گھڑی آئی تو شیوخ حرم اپنے کنبے لے کر فرنگی مقامروں کی سمت پرواز کر گئے۔[۹]

قرۃ العین حیدر نے ملت اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے افکارِ اقبال کے فروغ پر اہمیت دیتے ہوئے ایک کامیاب سعی کی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی تصانیف آگ کا دریا اور فصل گل آئی یا اجل آئی میں برطانیہ میں اقبال ایوننگ اکادمی کا تذکرہ کرتی ہیں اور افکارِ اقبال کی اشاعت کے سلسلہ میں اسے مغرب میں روشناس کرواتی ہیں کہ وہ اقبال کے فلسفہ ہی کو اہل مشرق و مغرب کے لیے مشعل راہ گردانتی ہے اور وہ اہل مغرب کو اقبال کے پیام مشرق کی روشنی میں مشرق سے اُنس کرنے کا درس دیتی ہیں۔

مشرق کا سارا ذہن وفلسفہ محض ٹیگور ہی نہیں ہے حضرت علیؓ اور امام غزالی اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی تو مطالعہ کیجیے لیکن بھلا اب عیسائیوں کا تعصب کب مٹے گا۔[۱۰]

قرۃ العین حیدر نے اقبال اکیڈیمیوں کا تذکرہ کر کے اقبالیات کے فروغ کے سلسلہ میں ایک اہم کڑی بیان کی ہے کہ علامہ اقبال کی پذیرائی صرف برصغیر ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں بھی انھیں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اقبالیات کی اشاعت میں ان کی ذاتی کاوش ان کی اقبال شناسی کا ایک اہم ثبوت ہے۔ جس سے وہ نظریاتی طور پر علامہ اقبال کی معتقد نظر آتی ہیں اور انھوں نے ملتِ اسلامیہ کو اقبال کے افکار ونظریات کی روشنی میں خوابیدہ عالم سے بیدار کیا جس پر ملت اسلامیہ عمل پیرا ہونا بھول گئے تھے۔ قرۃ العین حیدر نے اسے دوبارہ اجاگر کیا جس کا اعتراف پروفیسر فتح محمد ملک بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

بے شک ہمارا حافظہ کمزور ہو چلا ہے۔ اقبال کے بعد تو ہمارا حافظہ کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہو چلا تھا کہ بعد ایک مدت کے قرۃ العین حیدر ہمارا اجتماعی حافظہ بن کر نمودار ہوئیں۔[۱۱]

قرۃ العین حیدر نے تاریخ اسلام پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں عالم اسلام کی کسمپرسی کا نقشہ اقبال کے اندازِ فکر میں کھینچا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے عرب، ایران، ترکی، ہسپانیہ، مصر، فلسطین کی حالت زار بیان کی ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے کلام میں جابجا بیان کیا ہے۔ جس کی واضح مثال ''تحریک خلافت''، ''ہسپانیہ''، ''فلسطین''، ''ایران'' کے عنوانات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی کسمپرسی کا نقشہ یوں کھینچتی ہیں جو دنیائے اسلام میں تباہی وبربادی اور جمود وزوال کا مرتکب ہو کر رہ گئے ہیں۔

مسلمان محض دعاؤں اور عظمت رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے۔ نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی کربلائے معلیٰ، نجف اشرف اور مشہد ہر جگہ سے حسب معمول گریہ زاری کا شور بلند ہو رہا ہے۔[۱۲]

قرۃ العین حیدر مزید ایک اور جگہ مسلمانوں کی تباہی وبربادی پر خون کے آنسو بہاتی ہیں۔

صاحب لوگ، مشنری لوگ، فوجی، سویلین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سوئیز سے گزرتے مراکش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیمے لوٹنے میں مصروف ہیں۔ مشرق میں ہر سمت سوا جہالت، سوا پسماندگی، غلامی، ناداری، تباہی اور کیا نظر آتا ہے۔[۱۳]

اقبال ملت اسلامیہ کی تباہی وبربادی کے پیچھے یورپ کے پنجۂ استبداد کو بھانپ گئے تھے اور ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مگر قرۃ العین حیدر اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ

ملت اسلامیہ خود اپنے ہاتھوں تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی تحریروں میں اقبال کے مصرعوں کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کو خوفناک اور بھیانک حقیقت سے آشکارہ کیا ہے۔ جس کے متعلق پروفیسر فتح محمد ملک نے واضح الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

مجھے اقبال کے عہد پہ بہت رشک آیا۔ ہر چند دنیائے اسلام یورپ کی استعماری طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں تڑپ رہی تھی مگر اقبال اپنے گرد و پیش کی دنیا میں وہ ٹھوس بنیادیں دیکھ سکتے تھے۔ جن پر طلوع اسلام کے خواب بنے جاسکتے تھے اور ملی زوال کے مرثیہ کو حریت کا رجز بنایا جاسکتا تھا۔ اقبال اپنے سائنسی وژن کے ساتھ تہذیب مغرب کو خود اپنے خنجر کے ساتھ خودکشی میں مصروف اور نتیجتاً اسلامی دنیا کو آزاد ہوتا دیکھ رہے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ بڑی دل سوزی کے ساتھ ملوکیت اور ملائیت کے پرانے فتنوں سے باخبر کرتے جا رہے تھے۔ اقبال کی انارجائیت بلا جواز نہ تھی مگر ان کے اندیشے بھی برحق تھے ہمارے عہد کا فنکار کتنا بدنصیب ہے کہ اس کی آزاد دنیا میں اقبال کے اندیشے تو زندگی کی ہولناک حقیقتیں بن چکی ہیں مگر تجدید و انقلاب کے خواب ریزہ ریزہ ہیں آج دنیائے اسلام خود اپنے خنجر سے خودکشی کے عمل پیہم میں یقین محکم کے ساتھ مبتلا ہے۔ اپنے مٹی میں ملے ہوئے خواب کی کرچیاں چننا آج کے دل فگار فنکار کا مقدر ہے۔ چنانچہ وہ طلوع اسلام نہیں لکھ سکتا تو امت مرحوم کا مرثیہ ہی کہہ سکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا جگر دیکھیے کہ انھوں نے رجزیہ اور مرثیہ کو شیر وشکر کر دیا ہے۔ اقبال کی شاعری کے ٹکڑے ان کے ہاں محض صناعی کا عمل ہرگز نہیں۔ اقبال کے مصرعے ہمارے سنہرے خواب ہیں اور ان پر قرۃ العین حیدر کی گرہیں ہماری زندگی کی بھیانک حقیقتیں ہیں۔ اپنی تباہی کے ملبے پر بیٹھی ہوئی یتیم و یسیر دنیائے اسلام کو قرۃ العین اپنے اجتماعی خواب یوں یاد دلاتی ہیں۔[۱۴]

ملت اسلامیہ کی صدیوں پر پھیلی ہوئی داستان جو علامہ اقبال نے تحریر کی تھی وہ ان کے بعد فقط قرۃ العین حیدر کے حصہ میں آئی جو انھوں نے اپنے تحریروں میں جابجا پھیلائی ہے۔ جن کے متعلق پروفیسر فتح محمد ملک ان الفاظ کے ساتھ رقم طراز ہیں:

آٹھ صدیوں پر پھیلی ہوئی یہ رزمیہ قرۃ العین حیدر نے جس آفاقی تناظر اور جس باشعور جنون کے ساتھ بیان کی ہے وہ اقبال کے بعد آج تک کسی دوسرے فنکار کو نصیب نہ ہوسکا ہے۔[۱۵]

قرۃ العین حیدر کا تاریخی شعور علامہ اقبال کے تاریخی شعور سے مطابقت تو نہیں رکھتا مگر ماضی کے ساتھ ایک لگاؤ رکھتے ہوئے ''کھوئے ہوؤں کی جستجو میں'' وہ آتشِ رفتہ کے سراغ اور مسلمانوں کی عظمت کو نشاۃِ ثانیہ کے روپ میں تاریخ کا مرکب عمل سمجھتے ہوئے اسلام کے اوائل دور مختلف

خطوں، اور ہندوستان کے مسلمانانِ فاتحین اور عالم اسلام کے رہنماؤں اور برطانوی سنگینوں کے ظلم وستم کا جائزہ لینا چاہتی ہیں۔ یہی احساسات وہ اپنے اندر تاریخ کے آئینے میں علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں دیکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں پروفیسر فتح محمد ملک علامہ اقبال اور قرۃ العین حیدر کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

قرۃ العین حیدر کے ہاں تلاشِ ذات کے سفر کے موجودہ مرحلے کا خیال کرتا ہوں تو اقبال یاد آتے ہیں۔ اس تلازم خیال پر غور کرتا ہوں تو اقبال اور قرۃ العین کے کارنامہ فن میں چند در چند مماثلتیں نظر آئی ہیں۔ اقبال ہی کی مانند قرۃ العین بھی آتش رفتہ کے سراغ میں ہیں۔ اور ان کی تمام سرگزشت بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے۔ اقبال نے ہماری شاعری کو فلسفیانہ رنگ و آہنگ بخشا تو قرۃ العین نے ہماری فکشن کو گہرے فلسفیانہ انداز میں سوچنا سکھایا۔ دونوں کی تخلیقی بے چینی کا سرچشمہ ہے۔ دونوں کا سوز وساز، آرزومندی مسلمانوں کے اجتماعی مقدر غور وفکر سے پھوٹا ہے اور دونوں کے ہاں پر موضوع بالآخر وقت اور تاریخ کی ماہیت ومعنویت پر فکری وتہذیبی مراقبہ بن گیا ہے۔ پھر ہر دو مفکر فنکار ہم نصیب بھی ہیں۔ اقبال عمر بھر جس فکری تنہائی اور روحانی اضطراب سے دوچار رہے فکری اجنبیت اور روحانی جلاوطنی کا وہی احساس قرۃ العین کا مقدر ہے۔[16]

ہندوستانی نقاد شمیم حنفی نے پروفیسر فتح محمد ملک پر بے جا تنقید کرتے ہوئے نہ صرف پروفیسر موصوف کے ساتھ زیادتی کی ہے بلکہ قرۃ العین حیدر کے ساتھ بھی سراسر ناانصافی کی ہے۔ فتح محمد ملک نے مندرجہ بالا بیان درست فرمایا ہے کہ اقبال جس نے ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور اس کے بعد قرۃ العین حیدر اپنی تحریروں میں افکارِ اقبال کا تذکرہ کر کے ہمارے ذہنوں میں اقبال کا ساز وسامان لے کر نمودار ہوئیں ہیں مگر شمیم حنفی نے قرۃ العین حیدر کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کو بھی پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ درحقیقت فتح محمد ملک کا مقصد فقط یہی تھا کہ قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار ونظریات کو دوبارہ ہمارے دل و دماغ میں بعد مدت روشن کیا ہے۔ شمیم حنفی کی یہ رائے صرف درحقیقت تعصب اور ناسمجھی کی بھینٹ چڑھی ہے جس میں انھوں نے فتح محمد ملک کی تنقیدی رائے کو مضحک قرار دیا ہے۔ شمیم حنفی نے پروفیسر فتح محمد ملک پر تنقید کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر اور علامہ اقبال کی فکری ہم آہنگی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

فتح محمد ملک کا تنقیدی رویہ مضحک اس نقطے پر بنتا ہے جہاں وہ قرۃ العین حیدر کا موازنہ اقبال سے

کرتے ہیں اور اس حقیقت کو تمام و کمال بھلا بیٹھتے ہیں کہ اپنی تخلیقیت کے فکری آہنگ کے باوجود قرۃ العین حیدر کی بصیرت اور حسیت اقبال کی فکری وابستگی اور ان کی فکر سے مربوط مقاصد کا عکس محض نہیں ہے کہ دونوں کی تخلیقیت کا سفر ہی احساس اور وجدان کے مختلف علاقوں سے شروع ہوا۔ دونوں کی تخلیقیت کے ارتقائی مدارج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو اقبال اپنی عظمت کے باوجود اپنے بعد کے ادوار کی معنویت کے پس منظر میں اتنی جلدی متروک نہ سمجھ لیے جاتے اور جیلانی کامران کو نئے لکھنے والوں سے یہ شکایت نہ ہوتی کہ ان کے منظر نامے تو اقبال یکسر غائب ہیں۔[۱۷]

قرۃ العین حیدر کا تاریخی دور معاشی بدنظمی اور سیاسی انتشار کا دور ہے وہ ایک حساس طبیعت کی مالک اور مخصوص سوچ کی حامل ہیں وہ مشرق میں ہر طرف بے انتہا بدحالی دیکھتی ہیں، مشرق خواہ مسلمانوں یا ہندوؤں کی بدحالی کا ہو، مشرق سے انسیت رکھنے کی بنا پر اس کے لیے گہری تشویش اور دکھ کی بات ظاہر ہوتی ہے۔ اس بحران کے سبب ان کے دل میں ایک خلش پیدا ہوئی ہے جس کے ازالہ کے لیے انھوں نے عالم اسلام اور بالخصوص بیسویں صدی کے نصف اوّل کے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، عروج و زوال، مشرق کی تحریکات آزادی اور بیسویں صدی کے نصب ثانی میں دوسری جنگ عظیم اور تقسیم ہند کے سلسلہ میں انتشارِ انسانیت کا جو دور شروع ہوا اس کی بہترین عکاسی علامہ اقبال کے افکار کے ساتھ مشرقی ادبیات میں اپنی نثر کے روپ میں پیش کیا۔ بقول ڈاکٹر عبدالمغنی:

> اس لحاظ سے انھیں بجا طور پر افسانہ خوانِ مشرق بھی کہا جا سکتا ہے۔[۱۸]

لیکن میرے نزدیک وہ افسانہ خوان مشرق کی بجائے ادیبہ مشرق کے خطاب کی زیادہ مستحق ہیں کیونکہ انھوں نے مشرق کی کسمپرسی، قنوطیت، شکست آرزو کے بعد ایک آرزو و جو تمنا کی شکل میں اپنے ساتھ وابستہ رکھی ہوئی ہے وہ آرزو انھیں جینے کا حوصلہ اور سلیقہ عطا کرتی ہے جو انھوں نے علامہ اقبال سے سیکھی۔ ''نہ ہو نومید۔'' اقبال کا یہ مصرع ان کی تصانیف میں واضح طور پر جا بجا ملتا ہے۔ مغرب کی نسبت مشرق میں ابھی تک یہی ایک شعاع امید قائم ہے جو اقبال نے شاعری کے ذریعے اہل مشرق کو پیام مشرق کی صورت میں عطا کی۔ اسی پیام کی بجھتی ہوئی چنگاری کو سلگاتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے اپنی تحریروں کے وسیلہ سے مشرق کی جانب سے مغرب کو دیا ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی تجزیہ کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر پر علامہ اقبال کے اثرات کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

قرۃ العین کا مقابلہ مغربی ادیبوں کے ساتھ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کے برخلاف مشرق میں ابھی تک ''شعاع امید'' باقی ہے یہ آج کی دنیا کے لیے فکشن کے دائرے میں ایک پیام مشرق ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں دیئے گئے اس پیام کے بعد جو اقبال نے شاعری کے ذریعے نئی دنیا کو دیا تھا۔ یہ دوسرا پیام ہے جو بیسویں صدی کے نصف ثانی میں قرۃ العین نے افسانہ و ناولوں کے ذریعے مشرق کی طرف سے مغرب کو دیا ہے۔ اقبال بھی مغرب کے ادا شناس تھے اور قرۃ العین حیدر بھی ہیں۔ لہٰذا دونوں پیام مشرق میں بڑی حقیقت پسندی ہے۔ اگر چہ یہ فرق اپنی جگہ پر مشرق کے ساتھ قرۃ العین کی وابستگی جذباتی ہے۔ جب کہ اقبال کا عرفان مشرق ایک فکری بنیاد پر تھا۔[۱۹]

قرۃ العین حیدر وقت کو بطور ہیرو پیش کرتی ہے جو ماضی کے تاریکی سے نکلتا ہوا مستقبل کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔ وقت کی گردش جو جبریت کی علامت ہے یہ تصور انھوں نے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو فنا اور زوال کے تمام تر مظاہر پر محیط وقت کے لامتناہی سلسلہ جاری و ساری ہے۔

> سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات، دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی نہیں لگا سکا ہے۔ تجھ کو پرکھتا ہے یہ...... سلسلہ روز و شب، صیرفی کائنات، دن اور رات کا حساب...... سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ۔[۲۰]

شمیم حنفی نے قرۃ العین حیدر کے ادبی و فکری سفر کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کے ساتھ موازنہ کیا ہے:

> اقبال کے شعور کا مرکزی نقطہ اور ان کا Controlling Vision ان کا عقیدہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کا Vision ایسے کسی دائرے کا پابند نہیں...... قرۃ العین حیدر کو ایک فکشن نگار کی حیثیت سے بہر حال وقت اور مکاں کے ایک معین حوالے سے کام لینا ہے۔[۲۱]

شمیم حنفی مزید قرۃ العین حیدر اور علامہ اقبال کے تصور زمان کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں۔

> یہ پیر جہاں دیدہ'' قرۃ العین حیدر کے یہاں ایک نا قابل تسخیر مظہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی پائیداری اور طاقت میں یہ یقین قرۃ العین حیدر کے تصور کو اقبال کے تصورِ زماں سے الگ ادراک کے ایک انفرادی منطقے کے طور پر سامنے لاتا ہے۔[۲۲]

اگر چہ قرۃ العین حیدر کا تصور زماں اقبال کے تصور زماں کے مرہونِ منت نظر آتا ہے۔ جس کا کاملاً مطالعہ شمیم حنفی نہیں کر سکے اور انھوں نے سیتاہرن میں قرۃ العین حیدر کے تصور زماں کو سمجھنے کی کاوش نہیں کی جو انھوں نے علامہ اقبال سے مستعار لیا ہے۔ قرۃ العین حیدر اور علامہ اقبال

کے تصورِ زماں کا موازنہ کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر پر علامہ اقبال کے اثرات کو فتح محمد ملک کی مانند نامی انصاری بھی تسلیم کرتے ہیں۔

مصنفہ کے ذہن میں وقت کا تصور بہت واضح اور روشن ہے۔انھوں نے زندگی کے بہاؤ کو وقت کے لامتناہی سلسلے کے پس منظر میں دیکھنے اور دوسروں کو دکھانے کی جو کوشش کی ہے۔اس کا سراغ سب سے پہلے یا شاعرانہ سطح پر اقبال کے یہاں ملتا ہے یا پھر خود مصنفہ کے ایک دوسرے ناول آگ کا دریا میں ملتا ہے۔[۲۳]

اسی طرح قرۃ العین حیدر وقت کی جبریت کو فنا کی علامت تصور کرتے ہوئے اقبال کے افکار میں تباہی سمجھتی ہیں۔

انگ کور کا مندر......قرطبہ کی مسجد......اوّل و آخر فنا۔اوّل و آخر فنا......ظاہر و باطن فنا۔[۲۴]

قرۃ العین حیدر کے نزدیک وقت جو ہر شے کو مٹا دیتا ہے، منہدم کر دیتا ہے مگر تخلیقی فن کو کبھی ختم نہیں کر سکتا۔جس کے اظہار کے لیے انھوں نے اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' پر روشنی ڈالی ہے اور ''مسجد قرطبہ'' کی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہوئے فنون لطیفہ پر روشنی ڈالی ہے جسے ہو بہو علامہ اقبال کے افکار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔وہ اقبال کی مانند فن کی تخلیق کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں کہ وقت فن کی اہمیت کو ختم نہیں کر سکتا بشرطیکہ اس میں ''خونِ جگر'' شامل ہو۔

قرۃ العین حیدر موت (فنا) کے تصور سے اقبال کی مانند خوفزدہ نہیں اور نہ ہی موت کو فنا یا تباہی کی علامت تصور کرتی ہیں بلکہ موت کو زندگی کا ایک حصہ قرار دیتی ہیں۔

میں دشتِ لوط کے کنارے کھڑا ہوں، کس طرف جاؤں موت کہیں بھی کسی راستے سے آسکتی ہے۔[۲۵]

وہ اقبال کی مانند ٹیپو سلطان کی بہادری کی موت کو پسند کرتی ہیں کہ موت کی تباہی اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی۔لہٰذا ٹیپو سلطان آج بھی زندہ و پایندہ ہے۔اس بنا پر اقبال نے بھی ٹیپو سلطان کا کردار پسند کیا اور قرۃ العین حیدر نے اسے شہادت کے بعد بھی انگریزوں کے خوف کا سبب قرار دیا۔

ٹیپو سلطان رات کو سوتے میں بھی ہم سے لڑتا تھا۔[۲۶]

قرۃ العین حیدر کا نظریہ تقدیر بھی علامہ اقبال کے فلسفہ اسلامی کے تابع ہے اور وہ جدوجہد کی قائل ہے۔جس بنا پر انسان اپنی کاوشوں کو بروئے کار لا کر تقدیر بدلتا ہے۔وہ اچھی یا بری قسمت پر یقین نہیں رکھتی۔

لک کوئی چیز نہیں، یہ اصطلاح بھی سرمایہ داروں کی جعل سازی ہے لائف میں بیڈ لک ہے یا گڈ لک تیسرا کچھ نہیں ہے۔[۲۷]

نظریہ وطنیت بھی قرۃ العین حیدر کے نزدیک علامہ اقبال کے ملت اسلامیہ کے نظریہ کے مطابق ہے۔ وہ اقبال کے شاہین کی مثال دیتے ہوئے ملت اسلامیہ کو مغربی نظریہ وطنیت سے برتر قرار دیتی ہے۔

مسلمان کا کوئی وطن نہیں......ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہین بنا تا نہیں آشیانہ۔[۲۸]

لیکن وہ اقبال کی مانند مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کی ضرور قائل نظر آتی ہیں۔ جس کا اظہار وہ علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد کے نظریات کی روشنی میں کرتی ہیں۔ جس میں اقبال نے وضاحت کی تھی کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ یہ ریاست آزاد ہو یا حکومت برطانیہ کے تابع ہو، مگر اس میں مہاجرین کے ردو بدل کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ قرۃ العین حیدر بھی تقسیم کے عمل کو مہاجرین کے ردو بدل کے سبب ناپسند کرتی ہیں۔ لیکن انھوں نے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے یہ تقسیم ناگزیر قرار دی ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف آگ کا دریا میں علامہ اقبال کے ''نظریہ قومیت و وطنیت'' کی رو سے کمال نامی کردار کی زبانی قیامِ پاکستان کے بعد ہندوؤں کے نازیبا رویہ کا اظہار واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ کمال قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان میں ٹھہر جاتا ہے مگر اُسے وہاں مسلمان ہونے کی بنا پر ملازمت نہیں دی جاتی۔ جس کا اظہار وہ اپنی ایک دوست سے کرتا ہے کہ ہندوستان مت آنا۔ آپ کا بھی وہی حشر ہوگا جو میرا یہاں ہو رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے نزدیک علامہ اقبال انقلابِ روس سے اس قدر متاثر نہیں تھے اور نہ ہی اسلام کی نسبت اسے پسند کرتے تھے جتنا ترقی پسند مصنفین یا اشتراکی لوگوں نے ظاہر کیا۔ اسی وجہ سے وہ علامہ اقبال کے ان نظریات کو اپنی تحریروں میں جا بجا پیش کرتی ہیں اور اقبال کے نظریات کی روشنی میں اشتراکی لوگوں کا تمسخر اڑا کر شرمندہ کرتی ہیں۔ جس انقلاب کو اشتراکی پسند کرتے ہیں۔ وہ اشتراکیت کی ملامت اقبال کے افکار کی روشنی میں بیان کرتی ہیں۔ جس نے مسلمانوں کے لیے عذاب برپا کیا تھا۔

بغداد والے انور پاشا روس پہنچے۔ بالشویک فوج سے لڑے شہید ہوئے انقلاب روس والا ماں دیدہ ام......شور در جاں مسلماں۔[۲۹]

قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال کے افکار و نظریات میں نظریہ تعلیم، مرد مومن، غازی، اشتراکیت وغیرہ میں براہِ راست اثرات قبول نہیں کیے بلکہ ان کے افکار و نظریات کی روشنی میں حکومت پاکستان کے اعلیٰ افسران کا بھی تمسخر اڑاتی ہیں جو ملت اسلامیہ کی باگ ڈور سنبھالے

ہوئے ان کے مستقبل سے وابستہ ہیں اور اسی طرح قرۃ العین حیدر کا طنز و مزاح کا عنصر اور بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ''طنز و مزاح'' کے موضوع میں بھی قرۃ العین حیدر نئی نسل کا مذاق اڑاتی ہیں جو اقبال کی طرح ''شاہین'' کی خصوصیات جانچنے کی بجائے ''چوہے'' پر ریسرچ کر کے قیمتی سرمایہ اور وقت ضائع کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو حکومت پاکستان سے شکوہ و شکایت بھی ہے کہ اقبال جس نے ملتِ اسلامیہ بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس کے مقبرے کے لیے عوام نے چندے کی اپیل کی تو حکومت افغانستان نے اعانت کا اعلان کیا جس پر انھیں گہرا صدمہ ہوا اور وہ مایوسی کے عالم میں ان کا تمسخر یوں اڑاتی ہیں:

> اقبال...... ہائے اقبال۔ یہ ایک بہت بڑا شاعر تھا جس نے قوم کی بدنصیبی کی وجہ سے اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی اور بدنصیب قوم نے اخباروں کے ذریعے اعلان کیا کہ وہ اس کا مزار بے حد گرینڈ بنوائے گی لہٰذا چندہ جمع ہونا شروع ہوا اور فرزند کوہستان، شاہ افغانستان کی طرف سے بھی شاہی عطیے کا فرمان جاری ہوا۔[۳۰]

قرۃ العین حیدر احساس تفاخر میں بھی مبتلا نظر آتی ہیں دراصل احساس تفاخر ہی احساس کمتری کی سب سے بڑی علامت ہوتی ہے۔ کار جہاں دراز ہے (جلد اوّل) میں انھوں نے اپنے خاندان کو اقبال کے خاندان سے اعلیٰ قرار دینے کی کاوش کی ہے اور ظریفانہ انداز میں علامہ اقبال کا ''حکیم الامت اور جھوائی ٹولے کا نسخہ'' کے باب میں واضح انداز میں تمسخر اڑایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کے اندر سے احساس کمتری کا عنصر زائل نہیں ہوا۔ انھوں نے اقبال کے مقابلے میں اپنے والد سجاد حیدر یلدرم کو پروفیسر تھامس آرنلڈ کا بہترین شاگرد اور تھامس آرنلڈ کو یلدرم کا بہترین استاد کے روپ میں پیش کر کے احساس کمتری کو چھپانے کی زبردست کاوش کی ہے۔

> بقول پروفیسر آرنلڈ سجاد حیدر کا شمار کالج کے بہترین طلبا میں تھا اور اپنی قابلیت کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز تھے...... پروفیسر صاحب موصوف عربی عبا پہن کر کالج کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں سر طامس آرنلڈ لاہور چلے گئے جہاں وہ اقبال کے استاد بنے۔[۳۱]

اسی طرح انھوں نے اپنی مذکورہ تصنیف میں علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کو درزی ثابت کر کے اپنی والدہ نذر الزہرہ کو ان کے سیے ہوئے کپڑے پہنا کر اپنے اعلیٰ خاندان کا ثبوت پیش کیا ہے۔ جس سے ان کے ہاں احساس تفاخر جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

> میر مظہر علی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی لاڈلی تین سالہ پوتی نذر الزہرا کو شیخ نور محمد کا سیا ہوا سرخ ریشمی

برقعہ اڑھا کر گھوڑے پر اپنے سامنے بٹھلاتے اور صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہوا ہو جاتے۔[۳۲]

قرۃ العین حیدر نے اقبالیات کے سلسلہ میں ایک اہم کام سرانجام دیتے ہوئے اقبال شناسی کی معلومات میں اضافہ کیا ہے اور اقبال کے ساتھ اپنے خاندانی مراسم کو ظاہر کرتے ہوئے اپنے تعلقات کی روشنی میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ قادیانیت کے حوالے سے بھی انھوں نے علامہ اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد اور اپنے خالو میر افضل کے تعلقات کو ظاہر کر کے اقبال کے ساتھ اپنے خاندانی تعلقات ظاہر کیے ہیں اور خواجہ کمال کے بیٹے کا احوال قادیانیت کی رو سے بیان کیا ہے۔

علامہ اقبال کے دورِ حیات میں جو کام مکمل نہ ہو سکا، اسے قرۃ العین حیدر نے سجاد حیدر یلدرم کے ذریعے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے یا اسے آگے بڑھایا ہے۔ اس سلسلہ میں سجاد حیدر یلدرم کا خط جس میں سر سکندر حیات کا مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد واضح ثبوت ہے۔ اسی طرح ایران کے متعلق بھی انھوں نے ''کوہِ دماوند'' میں رضا شاہ پہلوی کے زوال کی داستان کو قلمبند کر کے علامہ اقبال کی پیش گوئی ''نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی'' کو سچ ثابت کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں افسانوں اور ناولوں کے موضوعات میں جا بجا علامہ اقبال کے تخیلات، افکار و نظریات، الفاظ، مخصوص علامات و اصطلاحات، تشبیہات و استعارات اور اشعار کے حوالے سے خوبصورتی پیدا کی ہے اور اپنے قارئین کو علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے آگاہ کرتے ہوئے مزید ان کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ اقبال کے اسلوب نگارش کے سحر میں اس قدر ملوث ہیں کہ وہ خود کو اس سے باہر نہیں نکال سکتی اور اپنی تصانیف میں وہ اقبال کی امیجری پیدا کرنے کی زبردست خواہاں ہیں اور متحیر بھی رہیں کہ اسے کس طرح اپنی تحریروں میں پیدا کروں، چنانچہ وہ اس معاملہ میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئیں ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی تحریریں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ان پر علامہ اقبال کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں اور اسی وجہ سے حکومت ہند نے انھیں ''اقبال سمان'' کا ایوارڈ بھی ۱۹۸۷ء میں عطا کیا۔[۳۳]

حواشی

۱۔ کار جہاں دراز ھے، جلد دوم، ص ۳۴۵۔
۲۔ ایضاً، ص ۳۴۵۔
۳۔ بال جبریل، ص ۶۱۔
۴۔ ستاروں سے آگے، ص ۱۱۷۔
۵۔ ایضاً، ص ۶۷۔
۶۔ تحسین و تردید، ص ۵۴۔۵۳۔
۷۔ ستاروں سے آگے، ص ۹۷۔
۸۔ روزنامہ نوائے وقت، ص ۲۔
۹۔ جہاں دیگر، ص ۱۵۔
۱۰۔ شیشے کے گھر، ص ۲۷۲۔
۱۱۔ تحسین وتردید، ص ۵۸۔
۱۲۔ کار جہاں دراز ھے، جلد اوّل، ص ۱۳۵۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳۶۔
۱۴۔ اپنی آگ کی تلاش میں، ص ۱۹۔
۱۵۔ تحسین و تردید، ص ۵۶۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۵۰۔
۱۷۔ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، ص ۳۷۴۔
۱۸۔ قرۃ العین حیدر کا فن، ص ۱۶۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۷۔
۲۰۔ چار ناولٹ (سیتا هرن)، ص ۱۸۶۔
۲۱۔ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، ص ۳۷۵۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۳۶۳۔
۲۴۔ ستمبر کا چاند، ص ۱۸۴۔

۲۵۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۳۳۔

۲۶۔ چاندنی بیگم ،ص۳۸۷۔

۲۷۔ ایضاً،ص۴۷۔

۲۸۔ آگ کا دریا ،ص۴۹۸۔۵۰۴۔

۲۹۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۲۱۹۔

۳۰۔ شیشے کے گھر ،ص۹۷۔

۳۱۔ کار جہاں دراز ھے ،جلد اوّل،ص۱۲۷۔

۳۲۔ ایضاً،ص۱۵۸۔

۳۳۔ ھندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ ،ص۱۶۵۔

قرۃ العین حیدر سے ملاقات

قرۃ العین حیدر سے میری ملاقات (ہمراہ پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد، پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال، انتظار حسین اور کشور ناہید، شمیم حنفی اور ان کی اہلیہ، ڈاکٹر عقیلہ جاوید، ڈاکٹر حمیرہ دستی، سعد مسعود الغنی) ۱۲/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ان کی رہائش گاہ کوٹھی نمبر ۵۵ لین E نوڈا کالونی، نئی دہلی پر ہوئی۔ قرۃ العین حیدر نے علامہ اقبال سے اپنی دلچسپی کا اظہار خیال کرتے ہوئے دریافت کیا کہ میں نے سُنا ہے کہ پاکستان میں بانگ درا سے ''ترانہ ہندی'' اور ''آفتاب (ترجمہ گایتری)'' والی نظمیں حذف کردی گئی ہیں؟

جس کا ہم نے جواب دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب کچھ بانگ درا میں ویسے ہی موجود ہے اور بانگِ درا اپنی اصلی حالت میں ہے اور اصلی حالت میں شائع ہو رہی ہے۔

(قرۃ العین سے میری ملاقات کا اصل مقصد بھی یہی تھا اور میں یہ جانچنا چاہتا تھا کہ ان پر علامہ اقبال کے اثرات ہیں یا اُن کی دلچسپی......؟)

نسیم عباس چوہدری

کتابیات

ارتضی کریم، ڈاکٹر (مرتبہ) قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء
افتخار احمد صدیقی، پروفیسر، عروج اقبال ، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، جون ۱۹۸۷ء
بشیر احمد ڈار (مرتبہ) انوار اقبال ، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۶۷ء
بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری ، نذیر سنز پبلیشرز، ۴۰، اے، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۹ء
جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، جلد اوّل، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۸۴ء
جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، جلد دوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، اشاعت دوم ۱۹۸۳ء
جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، جلد سوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۸۴ء
حسن اختر، ملک، تاریخ ادب اردو، ابلاغ میاں مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۶ء
حسن ریاض، سید، پاکستان ناگزیر تھا، کراچی یونی ورسٹی کراچی، طبع سوم ۱۹۸۲ء
رفیع الدین ہاشمی، خطوط اقبال، مکتبہ خیابان ادب لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۷۶ء
سلیم خان گمی، اقبال اور کشمیر، یونیورسل بکس ۴۰، اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۷ء
شارب رودولوی، ڈاکٹر، تنقیدی مطالعے، نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۹۴ء
شمع افروز زیدی، ڈاکٹر، اردو ناول میں طنز و مزاح، مطبع ضیاء آفسٹ پریس بارہ دری دہلی، ۱۹۸۷ء
شمیم احمد، ۲+۲=۵، مقالات پبلشرز، مستونگ، جناح روڈ کوئٹہ، ۱۹۷۷ء
عابد علی عابد، شعر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۹ء

عابد علی عابد، شعر اقبال، **بزم اقبال، لاہور، ستمبر ۱۹۹۳ء**
عابد علی عابد، تلمیحات اقبال، **بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، طبع دوم دسمبر ۱۹۸۵ء**
عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، **کامران پبلی کیشنز صدر روڈ، راولپنڈی، ۱۹۸۸ء**
عبداللہ، سید، ڈاکٹر، مرتبہ، متعلقات خطبات اقبال، **اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء**
عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، **بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور، طبع دوم، مئی ۱۹۸۳ء**
عبدالمغنی، ڈاکٹر، قرۃالعین حیدر کا فن، **موڈرن پبلشنگ ہاؤس نمبر ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی**
عبدالواحد معینی، سید (مرتبہ) مقالاتِ اقبال، **آئینہ ادب، چوک مینار انارکلی، لاہور، ۱۹۸۲ء**
عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل، **گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۸ء**
عطاء اللہ شیخ (مرتبہ) اقبال نامہ حصہ اوّل، **ایم اے، ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور (س ن)**
عطاء اللہ شیخ (مرتبہ) اقبال نامہ حصہ دوم، **ایم اے، ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور ۱۹۵۱ء**
غلام رسول مہر، مطالب بانگ درا، **شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی بازار، لاہور ۱۹۸۷ء**
فتح محمد ملک، اپنی آگ کی تلاش میں، **سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء**
فتح محمد ملک، تحسین و تردید، **اثبات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۴۶، راولپنڈی، اشاعت اوّل، فروری ۱۹۸۴ء**
فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر **(جلد اوّل، دوم) لائن رٹ پریس، کراچی، ۱۹۸۶ء**
قرۃالعین حیدر، آخر شب کے ہمسفر، **سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء**
قرۃالعین حیدر، آگ کا دریا، **سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء**
قرۃالعین حیدر (مرتبہ) انتخابات سجاد حیدر یلدرم، **سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء**
قرۃالعین حیدر، پت جھڑ کی آواز، **سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء**
قرۃالعین حیدر، پکچر گیلری، **قوسین، لاہور، باراوّل ۱۹۸۳ء**
قرۃالعین حیدر، جہاں دیگر، **مکتبہ اردو ادب بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ، لاہور، (س ن)**
قرۃالعین حیدر، چارناولٹ (اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو، چائے کے باغ، دلربا،

سیتا ھرن)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء
قرۃ العین حیدر، چاندنی بیگم ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء
قرۃ العین حیدر، روشنی کی رفتار، مکتبہ اردو ادب بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ، لاہور، (س ن)
قرۃ العین حیدر، ستاروں سے آگے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
قرۃ العین حیدر، ستمبر کا چاند، مکتبہ اردو ادب بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ، لاہور، (س ن)
قرۃ العین حیدر، سفینہ غم دل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء
قرۃ العین حیدر، شیشے کے گھر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء
قرۃ العین حیدر، فصل گل آئی یا اجل آئی (افسانوی مجموعہ) مکتبہ اردو ادب بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ، لاہور (س ن)
قرۃ العین حیدر، قرۃ العین حیدر کے بہترین افسانے، چوہدری اکیڈمی، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، فروری ۲۰۰۰ء
قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ھے ، جلد اوّل، مکتبہ اردو ادب، بازار ستھاں، اندرون لوہاری گیٹ، لاہور، (س ن)
قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ھے ، جلد دوم، مکتبہ اردو ادب، بازار ستھاں، اندرون لوہاری گیٹ، لاہور، (س ن)
قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ھے ، جلد سوم، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء
قرۃ العین حیدر، کوہ دماوند، مکتبہ اردو ادب، بازار ستھاں، اندرون لوہاری گیٹ، لاہور، (س ن)
قرۃ العین حیدر، گردشِ رنگ چمن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۱ء
قرۃ العین حیدر، گلگشت، مکتبہ اردو ادب، بازار ستھاں، اندرون لوہاری گیٹ، لاہور، (س ن)
قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء
گوپی چند نارنگ، پروفیسر (مرتبہ) اردو افسانہ روایت اور مسائل ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۸۶ء
لطیف احمد شیروانی، حرف اقبال، المنار اکادمی، لاہور، جولائی ۱۹۴۷ء
محمد احمد خان، اقبال کا سیاسی کارنامہ، اقبال اکادمی پاکستان، ۹۰ بی، گلبرگ ۳، لاہور، طبع اوّل ۱۹۷۷ء
محمد اکرام شیخ، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور، طبع چہاردہم، ۱۹۸۷ء

محمد اقبال، ارمغانِ حجاز (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی بازار، لاہور، فروری ۱۹۷۳ء
محمد اقبال، بالِ جبریل، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی بازار، لاہور، اگست ۱۹۹۹ء
محمد اقبال، بانگِ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی بازار، لاہور، اگست ۱۹۹۹ء
محمد اقبال، پس چہ باید کرد، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی بازار، لاہور، فروری ۱۹۷۳ء
محمد اقبال، پیامِ مشرق، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی بازار، لاہور، فروری ۱۹۷۳ء
محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزمِ اقبال، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور، طبع سوم مئی ۱۹۸۶ء
محمد اقبال، جاوید نامہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور مئی ۱۹۸۵ء
محمد اقبال، زبورِ عجم، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی بازار، لاہور، فروری ۱۹۷۳ء
محمد اقبال، ضربِ کلیم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۹ء
محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی بازار، لاہور، گست ۱۹۸۹ء
محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، مئی ۱۹۸۵ء
محمد حنیف شاہد، مفکرِ اقبال، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
محمد رفیق افضل (مرتبہ) گفتارِ اقبال، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء
محمد عبداللہ قریشی (مرتبہ) مکاتیب اقبال بنام گرامی، حصہ اوّل، اقبال اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۷ء
محمد غیاث الدین، شیخ، ہندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور، ۱۹۹۹ء
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، جنگ آزادی کے شعرأ، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، پوسٹ بکس ۲۳۰، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
نذیر احمد، پروفیسر، تشبیہات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۹۰ گلبرگ، لاہور، طبع اوّل ۱۹۷۷ء
نذیر احمد، سید، اقبال کے حضور (جلد اوّل) اقبال اکادمی، کراچی، پاکستان، اشاعت اوّل ۱۹۷۱ء

یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روحِ اقبال، آئینہ ادب، چوک مینار انارکلی، لاہور، ۱۹۶۳ء

رسائل

ادب لطیف، (روزنامہ) ۳۳سی، ۳۔گلبرگ، اکتوبر ۱۹۸۳ء
پگڈنڈی یلدرم نمبر (ماہنامہ)، جلد نمبر ۹، شمارہ نمبر ۵، ادارہ ادبستان اردو، ہال بازار، امرتسر
پنجاب گزٹ، ۵/نومبر ۱۹۰۹ء، حصہ اوّل، صفحہ نمبر ۸۰۹، سروسز کی تاریخ (انگریزی)، یکم جولائی ۱۹۰۹ء،
فکر و تحقیق، ششماہی (تحقیقی و علمی جریدہ) جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۳ جنوری تا جون ۱۹۹۰ء، ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۱/- آئی آر کے یورم، نئی دہلی
فنون (ماہنامہ) لاہور، مدیر، احمد ندیم قاسمی، ۴۷ انارکلی، لاہور، مارچ ۱۹۷۵ء
نصرت (ماہنامہ)، فروری ۱۹۶۴ء

اخبارات

روزنامہ نوائے وقت، ملتان، ۱۳/مئی ۲۰۰۲ء، صفحہ نمبر ۲

غیر مطبوعہ مقالات

فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان